Lalu

26. 10. 77

12 - XI - 97

11 — 1½ in SPS lib (RR)

2nd day of 3 days E.L.

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

زمانہ

مرتبہ:- دیانرائن نگم بی۔ اے

نمبر ۳	ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء	جلد ۶۷

فہرست مضامین

چندہ سالانہ ۵؎ — قیمت فی پرچہ ۸

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت سالانہ ۶؎ ممالک غیر سے۔ ششماہی ۳؎ ہندوستان کے لئے ششماہی ۳؎



اس کھانسی کو بند کیجیے

بار بار اٹھنے والی کھانسی، نیز ان کھانسیوں کا جو حلق کی کمزوری اور آواز کی خستگی سے پیدا ہوتی ہیں، خوشگوار اور موثر علاج یہ ہے کہ پیپس کی سانس کے ذریعہ آرام پہنچانیوالی جراثیم کش ٹکیاں چوسیے۔ پیپس میں سے کثیر مقدار میں شفا بخش ابخرے خارج ہوتے ہیں جو بیمار مقامات پر براہ راست اثر انداز ہو کر حلق کو تسکین دیکر آرام پہونچاتے ہیں اور سانس کی نالیوں میں جمی ہوئی رطوبت اور بلغم اکھاڑ کر صاف کر دیتے ہیں۔



پیپس کھانسی کو بند کر دیتی ہے اور سینہ اور پھیپھڑوں کو طاقت اور تقویت دیتی ہیں تمام دوا فروش پیپس کی ٹکیاں ایک روپیہ فی شیشی فروخت کرتے ہیں۔ پیپس کی کھانسی کے ذریعہ سے آرام پہنچانیوالی ٹکیاں استعمال کیجیے

پیپس
PEPS

زمانہ کے پرانے فائل

دفتر ہذا میں ۱۹۲۶ء سے پرانے فائل موجود ہیں۔ زمانہ کے تشنگان ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور رسالہ تینتیس سال سے، اردو زبان و ادب کی کسقدر مسلسل خدمت کر رہا ہے۔ اسکے نقادانہ مضامین اور گرانبہا نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں زمانہ کے پرانے فائل کبھی بیکار نہیں ہوتے وہ لائبریریوں میں رکھنے کے قابل ہیں۔ پرانے فائلوں کے خریداروں سے حسب ذیل رعایت کیجائیگی

(۱) ۱۰ سال کے مکمل سیٹ کے خریدار سے پچیس ۲۵ روپیہ معہ محصول
(۲) چار سال کے یکجائی خریدار سے علاوہ محصول ستے فی سال
(۳) ایک سال کے فائل خریدنے والوں سے صرف چار روپیہ للعہ لیے جائینگے۔ چند فائل باقی ہیں۔ شایقین جلد طلب فرمائیں

کمال داغ

حضرت داغ دہلوی کے تمام دیوانوں کا انتخاب

مع مقدمہ تنقیدی مرتبہ مولانا حامد حسن قادری

مقدمہ میں (۱) اردو غزل گوئی پر جدید زاویہ نگاہ سے تنقید کر کے تغزل کے قدیم و جدید رنگ کے محاسن و معائب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسکے بعد

(۲) حضرت داغ کی غزل گوئی پر ہر پہلو سے ریویو کر کے انکو دور متاخرین کا بہترین غزل گو ثابت کیا گیا ہے۔ مقدمہ کے بعد دواوین داغ (گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ، یادگار داغ) کا بہترین انتخاب ہے۔ قیمت مجلد دو روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ:
زمانہ بک ایجنسی کانپور

دار المصنفین کی نئی کتابیں

مختصر تاریخ ہند

دار المصنفین نے سیرۃ النبی اور سیر الصحابہ کے مقدس سلسلہ کے علاوہ اب تاریخ ہند کا اہم سلسلہ شروع کیا ہے، مختصر تاریخ ہند ہیں، ہندو عہد کی مجمل تاریخ کے بعد ان تمام اسلامی حکومتوں کا ذکر ہے، جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف اوقات میں قایم ہوئیں (یہ درحقیقت چھوٹے چھوٹے بچوں اسلامی مدرسوں اور اسکولوں کے ابتدائی درجوں کے لیے مرتب کی گئی ہے) ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت عہ

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

مولوی ابو الحسنات ندوی مرحوم نے ۱۹۱۹ء میں نہایت تلاش و تحقیق کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ مرتب کیا تھا۔ جو معارف کے کئی نمبروں میں مسلسل چھپا تھا۔ یہ اوسی سلسلہ مضمون کا مجموعہ ہے۔ ۱۲۴ صفحات قیمت ۱۲ر

ہماری بادشاہی

یہ کتاب آغاز اسلام سے لیکر عرب، مصر، شام و عراق، ایران و ترکستان۔ روم و اندلس، افغانستان و ہندوستان کی تمام اسلامی حکومتوں کی مختصر تاریخ ہے جو چھوٹے بچوں کے لیے نہایت سادہ اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔

۱۶۳ صفحے۔ قیمت عہ

منیجر دار المصنفین اعظمگڈھ

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہ کا تازہ مجموعہ کلام اردو

ضربِ کلیم

یعنی

اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف اور مسلمانوں کے لیے ایک نئی دعوتِ فکر

ضربِ کلیم مختلف ابواب میں منقسم ہے۔ مثلاً اسلام اور مسلمان، تعلیم و تربیت، سیاسیات مشرق و مغرب، فنونِ لطیفہ اور محراب گل افغان کے افکار،

جو فرزندانِ کوہستان کے لئے حیاتِ تازہ کا پیغام لائے ہیں

قیمت مجلد دو روپے۔ علاوہ محصولڈاک۔ جلد خاص حسبِ فرمائش تین روپے اور پانچ روپے

علامہ موصوف کی جدید فارسی مثنوی

"پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق"

اور

مسافر (زیرِ طبع)

ترجمان القرآن

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ و تفسیر قرآن مجید

قیمت مجلد اول چھ روپے آٹھ آنے اور مجلد دوم سات روپے آٹھ آنے

جاوید نامہ تین روپے **بانگ درا** تین روپے **بال جبریل** تین روپے

قادیانی مذہب۔ از پروفیسر الیاس برنی قیمت تین روپے

اور ہر قسم کی کتابیں ملنے کا پتہ:-

کتاب خانہ طلوع اسلام ۲۵ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

سول ایجنٹس ضربِ کلیم

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید کتابیں

حضرت نظرت واسطی

حدیث حسن کی پچاس ولولہ انگیز اور سحر اثر نظموں کا مجموعہ۔ اکثر نظمیں ملک کے مشہور رسالوں میں شایع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ کاغذ نہایت عمدہ، لکھائی چھپائی بہترین اور خوبصورت جلد کے ساتھ شایع ہوئی ہے۔ قیمت فی جلد صرف عہ

سالومی مشہور انگریز مصنف آسکر وائلڈ کے ایک مختصر ڈرامہ کا ترجمہ مترجمہ حضرت مجنوں گورکھپوری۔ فی جلد ۸ر

کمال داغ مرتبہ مولانا حامد حسن قادری اردو غزل گوئی پر مختصر ریویو اور حضرت داغ دہلوی کی غزل گوئی پر مفصل تبصرہ مع مقدمہ تنقیدی و انتخاب دواوین داغ دہلوی حجم ۲۵۲ صفحہ قیمت فی جلد ۱۲ر

مجبورۂ وفا نان کوآپریشن کے زمانہ کا ایک دلچسپ فسانہ مصنفہ پنڈت کشن پرشاد کول۔ قیمت عہ

قربانی ایک سوشل ڈراما مصنفہ پنڈت کشن پرشاد کول قیمت ۳ر

جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں کی مفصل سوانحعمری مصنفہ ضیاء الدین احمد برنی بی۔ اے ۸ر

ہندو تیوہاروں کی اصلیت اس کتاب میں مصنف نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور ان کی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح و آسان زبان میں لکھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور تمدنی انتظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے۔ اردو ایڈیشن کی قیمت ۹ر ہندی ایڈیشن کی قیمت جس میں اردو ایڈیشن کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل دی گئی ہے۔ عہ

مرقع ادب حصہ اول و دوم مرتبہ جناب صفدر مرزا پوری۔ ہندوستان کے مشہور انشا پردازوں اور شاعروں کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے اعزا وغیرہ کو لکھے ہیں۔ حصہ اول عہ حصہ دوم ۱۲ر

از منشی پریم چند صاحب بی۔ اے

بیوہ اس کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات اور ان ترغیبات کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ بیواؤں کے لیے کس قسم کی زندگی بہترین ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحے قیمت صرف عہ

جدید اردو شاعری مصنفہ جناب پروفیسر عبد القادر سروری

جس میں غدر کے بعد سے موجودہ زمانہ تک اُردو شاعری کے تغیرات - رجحانات - خصوصیات اور ارتقائی تاریخ پر تفصیلی بحث پیش کی گئی ہے - اس موضوع پر اُردو میں پہلی کتاب ہے جو چار سو صفحوں پر ضمیموں، تصویروں - انڈکس اور نفیس جلد کے ساتھ شایع ہوتی ہے - قیمت عہ

مثنوی سحر یعنی دشینت دشکنتلا منظوم - حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز - قیمت ۸ر

خیالات عزیز یعنی مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب حجم ۲۰۰ صفحات - سرورق پر مصنف کی عکسی تصویر ہے ٹائٹل خوشنما - رنگین - لکھائی چھپائی اعلیٰ ہے قیمت صرف ۱۲ر

طریق دولتمندی دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں - اس کتاب میں دولت کے حاصل کرنے کے آسان طریقے بتائے گئے ہیں - قیمت صرف ۸ر

اثرستان ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ تیر و نشتر ہے - قیمت عہ

روٹھی رانی جس میں حسن و عشق کی جیتی جاگتی تصویر - ناز و نیاز کا دلچسپ معرکہ اور ترپاہٹ کی دلکش مثال موجود ہے - قیمت ۶ر

پریم بتیسی ملک کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کے بہترین قصوں کا مجموعہ - زبان نہایت سادہ اور طرز بیان بیحد دلچسپ ہے - حصہ دوم عہ ۱۲آر

اُردو مضمون نویسی مضمون نویسی پر منشی ناتک پرشاد صاحب مرحوم بی - اے - کی نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے - اس کے مطالعہ سے بہت جلد اُردو مضمون نویسی کی مہارت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر موضوع پر آسانی کے ساتھ مضمون لکھنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے - قیمت صرف ۸ر

شریمد بھگوت گیتا یعنی کرم یوگ شاستر المعروف بہ غذائے روح با تصویر مترجمہ پنڈت پربھو دیال مصر عاشق - قیمت ۶ر

ہندوستان میں ذات پات کی تفریق قیمت ۲ر

فلسفہ جنگ جنگ کے فلسفہ پر ایک دلچسپ اور واضح بحث - قیمت ۵ر

گلزار داغ فصیح الملک جناب داغ دہلوی مرحوم کا مشہور و مقبول دیوان جو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ شایع ہوا ہے - داغ کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں - قیمت صرف عہر

انسانی قربانیاں چند اصلاحی و معاشرتی مضامین کا دلگداز مجموعہ -

قیمت آٹھ آنہ - منیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمایئے

زمانہ

جلد ۶۷ ستمبر ۱۹۳۶ء نمبر ۳

انیس پر ایک سرسری نظر

(از سید وصی رضا۔ ایم۔ اے۔ ریسرچ سکالر لکھنؤ یونیورسٹی)

کسی قوم کے فنون لطیفہ کی عظمت کے لئے قوت تنقید کی ترقی ضروری ہے۔ ایشیائی اقوام میں بھی فطرت انسانی کے مطابق حُسن و قبح کا حکم تو لگایا جاتا تھا لیکن تصویر کے تمام خد و خال کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہ تھی۔ مجموعی طور سے کسی ادیب یا ادبی شاہکار کی نسبت بلندی یا پستی کا اطلاق کر دیا جاتا تھا لیکن اسکی صناعی کی دقّت و موشگافیاں نظر انداز ہو جاتی تھیں۔ یورپ میں تنقید کو ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل ہے اور ہر سال اس پر متعدد کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مغربی اَدب کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا ہے لیکن ارباب ادب اُردو بد قسمتی سے قوتِ تنقید کو عموماً اپنے باکمالوں کی تنقیص پر صرف کرتے ہیں۔ حالانکہ کسی صنعت کی تعریف کا صحیح سلیقہ اس کی مذمت یا نکتہ چینی سے کہیں بہتر ہے۔ کسی چیز کی اصلی خوبی کو سمجھ لینا اتنا آسان نہیں ہے جتنا اسکی بُرائی کو محسوس کر لینا۔ اسی خود بیزاری کے سبب سے ہمکو اپنے باکمالوں کے کلام میں اغلاط اور غیر فطری واقعات کے سوائے کچھ نظر ہی نہیں آتا ہے۔ جب کوئی شخص محض اعتراض کی نگاہ سے کسی چیز کو دیکھے گا تو ظاہر ہے کہ اسکی خوبیوں پر نظر ہی نہ پڑے گی اور اگر محاسن کا احساس بھی ہوا تو انکی پوری قدر دانی ممکن نہیں ہے۔

فرانسیسی نقاد سین بو کا قول ہے کہ "پڑھنا۔ سمجھنا۔ محبت کرنا اور دوسروں کو محبت پر آمادہ کرنا حُسن مذاق پر دلالت کرتا ہے"۔ یعنی پھلے پھولے باغ سے عمدہ عمدہ پھول چن کر انکا گلدستہ بنا کر پیش کرنا

گلچیں کا فرض ہے نہ کہ تیز اور چبھتے ہوئے کانٹوں کو سمیٹ کر یہ ثابت کرنا کہ جو گلستاں اتنا پربہار نظر آتا ہے وہ درحقیقت خارزار ہے۔

انیس بھی انھیں مظلوموں میں ہیں جن کا جگر بے اعتنائی کے کانٹوں سے مجروح اور جن کا دل اعتراضوں کے تیروں سے چھلنی ہوا ہے۔ اگر خوش قسمتی سے یورپ کے کسی خطہ کو انکا وطن ہونیکا شرف حاصل ہوتا تو آج لوگ ان کے ایک ایک بند پر بڑی بڑی سلطنتیں قربان کرنے پر تیار ہوتے۔ ان کے کلام پر سر دھنتے اور دوسروں سے ان کے ادبی معجزات کا اعتراف سنکر جامہ میں پھولے نہ سماتے۔ مگر بدقسمتی سے وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اُردو ادب میں دادِ سخن دی جس کے حامی محسن کشی میں ضرب المثل ہیں۔ اسلئے ان کو نہ وہ بین الاقوامی شہرت حاصل ہے جسکا فخر ہومر اور شکسپیر کو نصیب ہوا اور نہ ان کے مراثی کی وہ عالمگیر قدر و منزلت ہے جو گیٹے کی فاوسٹ یا ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ کے حصہ میں آئی۔ یہی نہیں بلکہ ان کے لگائے ہوئے باغ پر اعتراضات کی اوس انکی ریاضت کو خاک میں ملا رہی ہے۔

سب سے پہلے نساخ نے ایک رسالہ اغلاط انیس و دبیر پر لکھا تطہیر الاوساخ۔ موازنۂ انیس و دبیر۔ اور المیزان وغیرہ میں اسکی تفصیل موجود ہے جسمیں بہ حیثیت مجموعی کاتبوں کی بے پرائی سے فائدہ اٹھایا گیا۔ اور دو باکمال اور جلیل القدر ہستیوں کو ہدف اعتراض بنا کر اپنی علمی قدر اندازی کا سکہ دلوں پر جمانے کی کوشش کی گئی۔ آجکل بھی چند شہرت پسند نقادوں نے یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ البتہ علامۂ شبلی مرحوم نے موازنہ انیس و دبیر لکھ کر ادب اُردو پر احسان عظیم کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس باکمال نے خوب خوب دادِ تنقید دی لیکن جن اعتراضات کا اعتراف علامۂ موصوف نے ازراہ منصف مزاجی۔ تصویر کے دونوں رُخ دکھانے کے لئے کیا ہے ان کے متعلق ہم کو انکی رائے سے اتفاق نہیں۔ اس سے میری یہ مُراد نہیں ہے کہ انیس کا کلام غلطیوں سے پاک ہے۔ اسمیں بمقتضائے بشریت لغزشیں بھی ہیں اور غلطیاں بھی۔ لیکن میر انیس نے لاکھوں شعر کہے ہیں اور اگر ان میں سے بعض میں کچھ خامیاں رہ گئیں تو اس سے ان کے کمال پر حرف نہیں آسکتا۔" (نقد الادب صفحہ ۱۹)

اسٹینلے وڈ نے شکسپیر کے صرف ایک ڈرامہ (Twelfth Night) میں پانچ خامیاں دکھائی ہیں لیکن اس سے شکسپیر کے دامن کمال پر داغ نہیں آسکتا۔ ایک عام اعتراض مرثیوں پر بالعموم اور مراثی انیس پر بالخصوص یہ کیا جاتا ہے کہ اسمیں مقامی رنگ نہیں ہے۔ یعنی انیس عرب کے ریگستان پر ایران کے ہرے بھرے باغ لگاتے اور نینوا کے چٹیل میدان پر سبزہ کا فرش بچھاتے ہیں۔ وہ عرب کے بے تکلف کرداروں میں اودھ کی شرم و حیا کے انداز دکھاتے اور تمدن عرب کی تصویریں

تہذیب ہند کا رنگ بھرتے ہیں۔

مگر معترض کو پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ شاعر کا مقصد کیا ہی؟ اسکو در اصل دو باتوں کا لحاظ کرنا ناگزیر ہے

مرثیت اور شعریت

بمقتضائے مرثیہ نگاری انکا فرض تھا۔ کہ وہ ہر طبقہ کے آدمیوں کو متاثر کرنیکی کوشش کرتے۔"اگر میرانیس صداقت کیساتھ عربی طرز معاشرت اور عربی رسم ورواج کی ترجمانی کرتے تو ان کو ہرگز اسقدر کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ ان کے کلام سے مستفید و مستفیض ہونے والے ہندوستان کے رہنے والے تھے۔ ان کے قلوب کو متاثر کرنے کے لئے ضروری تھا کہ انیس اپنے رجال داستان کو خود سننے والوں کے ماحول۔ انکی معاشرت۔ اور انکی ذہنی فضا کی جیتی جاگتی تصویریں بنا کر پیش کرتے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو جو سربلندی اور عظمت انھیں آج بہ حیثیت صنّاع اور شاعر کے حاصل ہی وہ نصیب نہ ہو سکتی"۔ (نقد الادب صفحہ ۱۹۸)

ملٹن نے اپنی مشہور آفاق تصنیف پیراڈائز لاسٹ (Paradise Lost) میں شیطان کی مقلّد ارواح (Spirits) کی جو کیفیات ادا کی ہیں وہ تمام تر فطرت انسانی سے مطابق ہیں۔ پروفیسر بروک (Stopford Brooke نے تو یہاں تک کہدیا کہ بعل زبوب (Beelzebub) کے کردار میں چارلس کے مشیر سٹریفورڈ (Strafford) کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ پیراڈائز لاسٹ (حصہ دوم) کی شیطانی مجلس کا مباحثہ پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہی گویا مجلس آئین ساز میں بیٹھا ہوا مقرّرین کی دھواں دھار تقریریں سُن رہا ہی۔ اگر مولک بیلیل میمن اور بعل زبوب کے منھ میں انسانی زبانیں نہ رکھدی جاتیں تو مورخین اَدب کے سوائے آجکل کون اس کتاب کو اسقدر ذوق وشوق سے پڑھتا؟۔ اگر انیس بھی عربوں کے طرز کلام میں تمام کیفیات کو ادا کرتے تو ظاہر ہے کہ عوام الناس کے لئے ان کے مرثیے ایک عجوبہ چیز ہو جاتے۔ نہ دلوں پر چوٹ لگتی نہ شدید جذبہ طاری ہوتا اور نہ ان کے قلوب اتنے متاثر ہوتے کہ درد لہو بنکر آنکھوں سے ٹپکتا جو مرثیہ کا حاصل ہی۔ مثال کے ذریعہ سے یہ امر زیادہ واضح ہو جائیگا۔

جب اہل بیت اطہار مدینہ سے رخصت ہونے لگے تو حضرت صغریٰ کا حال غیر ہو گیا۔ ماں سے التجا کی کہ چلتے چلتے ننھے بھائی علی اصغر کی شکل اکبار پھر دکھا دو۔

مضطر ہوئی سنکر یہ سخن بانوئے بے پر پردہ سے جگر بند کا منھ کر دیا باہر

بیٹی سے کہا دست پسر ماتھے پہ رکھکر
لو آخری تسلیم بجا لاتے ہیں اصغر

منہ زرد ہے رخساروں پہ آنسو بھی بہے ہیں
یہ نرگسی آنکھوں سے تمہیں دیکھ رہے ہیں

عرب میں یہ رسم رائج نہیں ہی بلکہ اودھ کا مخصوص طریقہ ہی۔ لیکن اس طرز بیان سے اس حسرتناک رخصت کا کیا صحیح نقشہ حاضرین مجلس کے پیش نظر ہو جاتا ہی۔

اگر انیس عرب کے ریگستانوں کی خاک اُڑاتے اور بے گیاہی پر اشک حسرت ٹپکاتے تو باغ وراغ کے دلکش مرقعوں اور صبح وشام کے رنگین مناظر کی اعلیٰ تصویروں سے ہمارا نگارخانۂ ادب خالی رہتا۔ اگر انیس نے صرف بیابانوں کی خاک بیزی کی ہوتی تو ادب اُردو کا دامن ایسے ایسے آبدار موتیوں سے محروم رہتا۔

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

کھا کھا کے اُوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

بہت سے مقامات پر مقامی رنگ سے گریز ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً :-

دشت میں چلتی ہی لو۔ دھوپ کی شدت ہی کمال
جیٹھ بیساکھ کے ایّام ہیں اور وقت زوال

سُرخ ہی خوں سے قبا دھوپ سے رخسار ہیں لال
نکلی آتی ہے زباں منہ سے یہ ہی پیاس سے حال

تن جلا جاتا ہے جب گرم ہوا آتی ہے
ریت اُڑ اُڑ کے ہر اک زخم میں بھر جاتی ہے

یہاں کسی عربی مہینے کے نام سے سامعین پر جنکی زیادہ تعداد عوام پر مشتمل ہی خاک اثر نہ پڑ سکتا۔ کیونکہ انکا دماغ کسی نادیدہ ملک میں ناشنیدہ موسم کے تخیّل سے خالی ہی۔

معترضین کو انیس سے بڑی شکایت یہ ہی کہ وہ ضعیف روایتوں کو نہ صرف بے تکلف نظم کردیتے ہیں۔ بلکہ انہیں خاص طور سے رنگ آمیزی کرکے صفحۂ سادہ کو رنگین و پُرکار بنا دیتے ہیں۔ لیکن نقادانِ اُدب کو مورّخ اور شاعر کا فرق پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ انیس کے مرثیے مذہبی یا تاریخی تصانیف کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ فن شعر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ فنّی اعتبار سے اگر اسمیں خامیاں پائی جائیں تو ان کے اظہار میں مضائقہ نہیں۔ تاریخی نقطہ ونظر سے اُن کے مرثیوں کو جانچنا اصولی غلطی ہی جس طرح ڈاروِن کی (Origin of Species) کو ادبی معیار سے پرکھنا صحیح نہ ہوگا بقول کولیرج "کسی تماشے سے صحیح لطف ہم کو اسیوقت حاصل ہوتا ہی جب وہ فرضی ہو"۔ ڈرامہ نگار کا فرض محاکات

ہے ہو بہو نقشہ کھینچنا نہیں ہے وہ اہلِ فن ہے نہ کہ فوٹو گرافر. یہ سب جانتے ہیں کہ سکندر نامۂ نظامی کی تاریخی اہمیت کیا ہے اور یوسف زلیخائے جامی کہاں تک واقعہ کے مطابق ہے۔ پھر بھی فارسی ادب میں انکا پایہ کسقدر بلند ہے. شاعر کا فرض واقعہ نگاری نہیں بلکہ اثر انگیزی ہے۔ وہ ایک ایسا مصوّر ہے جو صرف ان اجزاء کو لیتا ہے جو کسی جذبہ کے محرک ہوں. ان میں اضافہ یا تخفیف کر کے اپنے بیان کو اصل چیز سے زیادہ موثر بنا دینا اس کا کام ہے۔ اگر ترتیب واقعات میں کوئی کمی رہ جائے یا جذبات غیر فطری طور پر نظم کر دئے جائیں تو البتہ وہ قابلِ اعتراض ہے۔ لیکن یہی خصوصیت انیسؔ میں ممتاز و نمایاں ہیں. وہ واقعات کی ترتیب بلکہ جزویات کا بیحد خیال رکھتے ہیں. اور جذبات انسانی کا اس طرح اظہار کرتے ہیں جیسے ہم خود محسوس کر رہے ہوں. صاحب "یادگار انیسؔ" نے درست لکھا ہے کہ یہ غلط سہی کہ حضرت صغریٰ وطن میں رہ گئیں پھر بھی اگر یہ واقعہ جزو مرثیہ نہ ہوتا تو اُردو زبان کو یہ لاثانی بیت میسر نہ ہوتی۔

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا　　وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

سارا کنبہ عازمِ سفر ہے. مگر ایک بیمار بچّی کو وطن میں چھوڑ جانے کا ارادہ ہے۔ وہ چلنے پر بضد ہے۔ ہر ایک کی طرف بہ نگاہ حسرت دیکھتی ہے. مگر سب کا رُخ پھرا ہوا پاتی ہے۔ امام عالی مقام کا حکم ہے. کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں. کس ساحرانہ انداز میں اس نفسی کیفیت کی تصویر کھینچی ہے۔

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا　　وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

حضرت قاسم کی شادی ملا حسین واعظ کاشفی صاحب روضۃ الشہدا کا من گھڑت افسانہ سہی لیکن انیسؔ نے اپنے قلم سے دولہا کی رخصت کے وقت جذبات فطرت کے کیسے پُر اثر اور صحیح نقشے کھینچے ہیں۔

گھونگھٹ ہٹا کے ہم کو دکھاؤ تو رُخ کا نور　　پاس اب نہ آسکیں گے کہ ہوتے ہیں تم سے دور
آنکھوں پہ ہیں ہتھیلیاں رقّت کا ہے وفور　　نرگس کے پھول ہاتھ سے ملنا یہ کیا ضرور

جینے کی اس چمن میں خوشی دل سے فوت ہے
بلبل جو گل کی شکل نہ دیکھے تو موت ہے

صاحب! بھلا عدم کے مسافر سے کیا حجاب　　ہم یوں ہیں جس طرح کہ سرِ آب ہو حباب
ایسی روا روی میں ٹھہرنے کی کب ہے تاب　　کہتی ہے موت گور کی جانب چلو شتاب

رستہ ہے پُر خطر کہیں وقفہ ذرا نہ ہو
منزل بہت کڑی ہے یہ جلدی روانہ ہو

مصیبت کی ماری۔ نئی نویلی دلہن پر اس کا کیا اثر ہوا؟ اس نے صرف ایک جملہ کہا لیکن اس اجمال پر ہزار تفصیلیں نثار۔ ایک تو وفورِ گریہ۔ دوسرے فرطِ حیا۔ اس پر کوتاہی وقت۔ لیکن اس نباضِ فطرت نے "اک آہ کی" کا اضافہ کر دیا جس میں ہزاروں ناگفتہ حسرتوں اور سیکڑوں بیتاب آرزوؤں کے خون کی بو شامل ہے۔

جب یہ سُنے کلام تو جی سنسنا گیا ‎—‎ دل پر چھری چلی کہ جگر تھرتھرا گیا
منہ پر دلہن کے صاف رنڈاپا سا چھا گیا ‎—‎ جوشِ بکا میں کچھ نہ زباں سے کہا گیا
دولہا کو اتنی بات سنا کر اک آہ کی
صورت بتاتے جاؤ ہمارے نباہ کی

اس موقع پر کوئی دوسرا شاعر ہوتا تو شکوہ و شکایت کا دفتر کھول دیتا لیکن انیس اس رمز کو خوب سمجھتے تھے کہ "جب دل بھرا ہوتا ہے تو الفاظ کم نکلتے ہیں"۔

بعض ستم ظریفوں نے انیس کے کلام پر ناہمواری کا الزام دھرا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ناہمواری سے کسی شاعر کی قدر و منزلت کم نہیں ہوتی۔ میر کی استادی باوجود اس نمایاں خصوصیت کے غزل گوئی میں مسلّم ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر انیس کا کلام ناہموار ہے تو اُردو کے کس شاعر کا کلام ہموار کہا جا سکتا ہے۔ انیس کے کلام کا خاص جوہر ہمواری ہے۔ غالباً تدریجی مراحل کے اُتار یا چڑھاؤ کو ناہمواری پر محمول کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک اعلیٰ خصوصیت ہے جسکو Climax کہتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ انیس کے کلام میں کہیں جزالت و ضخامت۔ کہیں سلاست و روانی دیکھکر یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ اس کے کلام میں یکسانیت نہیں ہے۔ تنوع کی بنا پر مرثیہ میں زبان کا اختلاف ضروری ہے۔ میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچنا ہے تو دلاوروں کی رجز خوانی۔ گھوڑوں کی جست و خیز تلواروں کی مار کاٹ اور زخمیوں کی چیخ پکار کے لئے پُر زور الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً:۔

گھوڑوں کی وہ تڑپ وہ چمک تیغِ تیز کی ‎—‎ سو سو صفیں کچل گئیں جب جست و خیز کی
لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی ‎—‎ تھی چار سمت دھوم گریزا گریز کی
آدھی جو ہو گئی تھیں وہ سب ذوالفقار سے
تیغوں نے منہ بھرا لئے تھے کارزار سے

جب ضرب کی زمیں کے طبق ہل کے رہ گئے ‎—‎ سر اُڑ گئے تنوں سے گلے مل کے رہ گئے
زخموں کے پھول چار طرف کھل کے رہ گئے ‎—‎ بسمل تڑپ کے سامنے بسمل کے رہ گئے

برہم مزاج لختِ دلِ بوتراب تھا
لاشے الٹ گئے یہ نیا انقلاب تھا

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے دشت و در
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنّات کانپ کے کہتے تھے الحذر
دنیا میں خاک اڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے اُٹھی برکت اب جہان سے
لو ہل گیا زمیں کا طبق آسمان سے

قیدخانہ میں ماں یتیم بچی کو بہلا پھسلا کر سُلانا چاہتی ہو تو اس کے لئے نہایت سہل و سادہ الفاظ اور آسان طرزِ بیان کی ضرورت ہے۔ مثلاً

بانوئے حزیں کہتی تھی باگریۂ و زاری
گھر ایسا ہی ملتا ہے گنہ گاروں کو واری
لو سو رہو آنسو نہ کرو آنکھوں سے جاری
سُن لیوے کہیں شمر نہ آواز تمہاری
ماں صدقہ گئی۔ سہو لو جو کچھ رنج و تعب ہے
پھر باندھ دے رسّی سے جو گردن تو غضب ہے

سانسیں نہ بھرو ہچکیاں لے لے کے نہ روؤ
کڑھ کڑھ کے میں صدقہ گئی جاں اپنی نہ کھوؤ
ہل جائیں گے بابا بھی منہ اشکوں سے نہ دھوؤ
قربان گئی آؤ مری گود میں سوؤ
اب سبط پیمبر سے ملا دیویں گے تم کو
آویں گے جو بابا تو جگا دیویں گے تم کو

شب کو تو ذرا لیٹ رہو سوئی ہو دم بھر
میں پاس تمہارے ہوں جو بابا نہیں سر پر
دیکھو تو کہ جنگل میں پڑے ہیں علی اصغر
نے لاش پہ سایہ ہے نہ مرقد ہے میسر
پالا چھ مہینے جسے چھاتی پہ سُلا کر
وہ ہم سے جدا ہو گئے پردیس میں آ کر

یہ ضرور ہے کہ انیس کے ابتدائی دور کے کلام میں وہ پختگی نہیں جو مشقِ سخن بڑھنے کے بعد پیدا ہوئی لیکن یہ فرق اتنا نازک اور غیر محسوس ہے کہ ہم مرثیوں میں ترتیب زمانی قایم نہیں کر سکتے۔

نئی روشنی کا تعلیمیافتہ طبقہ انیس کے کلام پر یہ اعتراض وارد کرتا ہے کہ انیس کا کمال شاعری مسلّم لیکن صنائع لفظی و بدائع معنوی سے (جو اُردو شعرا کے کلام کا نمایاں عیب ہے) انیس کا کلام بھی خالی نہیں ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ صنعتوں کا استعمال درحقیقت عیب نہیں بلکہ ہنر ہے کیونکہ

یہی عروسِ سخن کے زیورات ہیں۔ بشرطیکہ سلیقہ کے ساتھ کم کم اور اعتدال کیساتھ کبھی کبھی استعمال کئے جائیں اور معنی کو الفاظ کی صنعت گری پر قربان نہ کیا جائے۔ اگر لطافت معانی و بیان کیساتھ نفاست بدیع اس طرح شامل ہو جیسے مرصّع زیورات پر نگینے تو کلام کی خوبی دوبالا ہو جاتی ہو۔ صنائع و بدائع کی افراط سے البتہ کلام سُست و بے مزہ ہو جاتا ہو۔ چنانچہ امانت کی شاعری بھانڈ کی نقل ہو کر رہ گئی۔ "اگرچہ موسائٹی کے دباؤ اور کم عیار حریفوں کے مقابلہ نے انیس کو ہر جگہ جادۂ استقامت پر قائم رہنے نہیں دیا بلکہ اس دھرپتیے کی طرح جسے مجلس کے بے مغزوں کو رجھانے کے لئے کبھی کبھی بارہ ماسا یا جوبولے بھی الاپنے پڑتے ہیں اکثر مبالغہ و اغراق کی آندھیوں کے طوفان اُٹھانے پڑے " (مقدمۂ شعر و شاعری)۔ لیکن اس میں بھی جہانتک ہوسکا انہوں نے بے اعتدالی اور بے راہ روی سے گریز کیا ہے۔ اور اپنے خداداد حُسنِ مذاق سے صنعت نگاری کے نہایت اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں مثال کے طور پر میں صرف تشبیہ کی چند مثالیں انیس کے کلام سے پیش کرونگا۔

انیس کی اکثر تشبیہات نہایت لطیف اور معنی خیز ہوتی ہیں۔ وہ اس ذریعہ سے نہ صرف کلام کی رونق دوبالا کر دیتے ہیں بلکہ مضمون میں بھی ترقی پیدا کر دیتے ہیں۔ بعض موقعوں پر تشبیہ کا استعمال ضروری ہوتا ہے اگر شاعر ایسے مواقع پر سیدھے سادے انداز سے کام لے تو سامع کو کوئی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ احساس غیر محسوس چیزوں کے بیان میں بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً گھوڑے کے آہستہ آہستہ چلنے کا صحیح نقشہ کھینچنے کے لئے محض تصریح اتنی مفید نہیں ہوسکتی جتنی تشبیہ۔

آمد فرس کی تھی دلہن آتی ہے جس طرح
تھم تھم کے نکہتِ چمن آتی ہے جس طرح
تصویر آہوئے ختن آتی ہے جس طرح
یا شمع سوئے انجمن آتی ہے جس طرح
باہم طیور کہتے تھے کبک دری ہے یہ
گھوڑے چراغ پا تھے کہ بیشک پری ہے یہ

گلعذاران محمدؐ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

راہیں تمام جسم کی خوشبو سے بس گئیں
جب مسکرائے پھولوں کی کلیاں بکس گئیں

مؤذنِ یوسف جمال کی حُسنِ صوت کا انداز دکھاتے ہیں:۔

شبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

تلوار کی تیزی کی مثال دیتے ہیں:۔

یوں دوڑتی تھی تن میں لہو جیسے رگوں میں

قیدخانہ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:۔

کیجے شکستگیٔ خرابے کا کیا بیاں ثابت نہ جس میں سقف نہ در اور نہ سائباں
وحشت کا گھر ہراس کی جا خوف کا مکاں وہ شب کہ الحذر وہ اندھیرا کہ الاماں
ظلمت سرائے گور تھی زنداں کا گھر نہ تھا
حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گزر نہ تھا

مثل دل یزید تھا وہ سب مکاں سیاہ تاروں کی روشنی کو بھی ملتی تھی واں نہ راہ
چھایا تھا دل جلی ہوئی رانڈوں کا دودِ آہ حجرے سے چشم تر کے نکلتی نہ تھی نگاہ
دیکھے کسی کی شکل کوئی یہ محال تھا
روزن بھی تھا کوئی تو وہ چشم غزال تھا

شب کا تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر ظاہر تھے جا بجا حشرات زمیں کے گھر
تھے وقف آشیان ابابیل سقف و در نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر
گھر تھا اجل کا خانۂ رنج و بلا نہ تھا
برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

وہ تیرگی کہ ہو شب ظلمات اس سے دنگ ہر در لبانِ حجرۂ چشم بخیل تنگ
تھی واں کی صبح و شام سوادِ دیار زنگ دیوار و سقف و بام و زمیں سب سیاہ رنگ
قید اس میں تھے حرم شہ گردوں مقام کے
کیا صبح مل گئی تھی خرابے کو شام کے

قیدیوں کی تصویر ملاحظہ ہو:۔

پہلے پہل کی قید وہ اور وارثوں کے داغ یہ رنگ تھا کہ ہوئے خزاں دیدہ جیسے باغ
رونے سے اہل بیت کو اک دم نہ تھا فراغ نے چاندنی نہ شمع نہ مشعل نہ واں چراغ
غل تھا کہ ایسے گھر بھی الٰہی جہاں میں ہیں
ثابت نہیں کہ قبر میں ہیں یا مکاں میں ہیں

یوں وہ شکستہ حال تڑپتے تھے ہر نفس دشوار جیسے صید پہ ہو تنگیٔ قفس
جانوں کو تھی بدن سے نکل جانے کی ہوس بازو بندھے ہوئے تھے نہ تھا کچھ کسی کا بس
دل چھاتیوں میں صورت بسمل تڑپتے تھے

زنداں کے در سے جا کے سروں کو پٹکتے تھے

بستی وہ فاطمہؓ کی کہاں اور وہ گھر اُجاڑ
جانوں پہ تھی بنی ہوئی قسمت کا تھا بگاڑ
کیا دل کھلیں کہ شام سے جب بند ہوں کواڑ
دیواریں تھیں بلند کہ چھاتی پہ تھے پہاڑ
گھبرا کے چھت کو بیبیاں ہر بار تکتی تھیں
ٹوٹے مکاں کی رات کو کڑیاں کڑکتی تھیں

ہر دم زمیں سے واں کی نکلتا تھا یوں بخار
جیسے دھواں تنور سے اٹھتا ہے بار بار
گرمی سے یوں زمیں پہ تڑپتے تھے سوگوار
جس طرح سے سپند ہو آتش پہ بیقرار
جھک جھک کے آسمان کو حسرت سے تکتے تھے
کیسے ہوائے سرد کو بچے ترستے تھے

اسیران ستم کے سر بازار تشہیر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ تشبیہوں کی مناسبت اور لطافت پر غور کیجئے:۔

آگے آگے تو ہیں سجادؓ جھکائے گردن
پاؤں بیڑی میں گلا طوق میں گردن میں رسن
مثل خورشید فلک شرم سے لرزاں ہو بدن
چاک ہے غم میں گریباں قبا تا دامن
بیٹھ جاتے ہیں تو جھنجلا کے اُٹھاتے ہیں لعیں
بوڑیاں نیزوں کی شانوں میں چبھاتے ہیں لعیں

پیچھے بیمار کے ہے قافلۂ اہلِ حرم
چپ ہیں تصویر سے گویا کہ کسی میں نہیں دم
دختر فاطمہ زہراؓ کا عجب ہے عالم
تھرتھری جسم میں ہے اُٹھ نہیں سکتے ہیں قدم
رو کے فرماتی ہیں کس گوشہ میں جائے زینب
ہاتھ کھل جائیں تو منہ اپنا چھپائے زینب

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن
جس طرح ہوتے ہیں گلدستہ میں گلہائے چمن
رشتہ دارانِ علیؓ سب ہیں گرفتار محن
شرم کے مارے ہوئی جاتی ہے اک شب کی دلہن
دمبدم ساس بھی سر پیٹتی ہے ساتھ اس کے
ابھی کنگنا نہ کھلا تھا کہ بندھے ہاتھ اس کے

آخر میں برادرانِ وطن سے التجا ہے کہ وہ اپنے باکمالوں کے کلام کو بغور پڑھیں۔ سمجھنے کی کوشش کریں پھر ٹھنڈے دل سے فیصلہ کریں کہ یہ ہستیاں واقعی اعتنا کی مستحق ہیں یا

نہیں۔ یہ سچ ہے کہ شکسپیر کے ڈراموں کے اتنے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اتنی شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ انکو خریدنے کے لئے قارون کا خزانہ درکار ہے اور گیٹے کی تصانیف کے ایک ایک پہلو پر ہر سال اتنی کتابیں لکھی جاتی ہیں کہ سب کو پڑھنے کے لئے عمر نوح کی ضرورت ہے چنانچہ Seigfried Kosteriel اپنے مختصر مضمون "گیٹے اور موجودالمانیہ" میں لکھتا ہے "صرف اس سال تقریباً پانسو کتابیں گیٹے پر شائع ہوئیں" (Bookman, London April 1932) اس کے برعکس ہمارے باکمالوں کے مجموعہ کلام کا ایک ایڈیشن بھی صحیح نہیں نکلتا۔ مگر بجائے اس کی تصحیح کرنے کے انہیں غلطیوں پر اعتراضات کا طومار باندھنا کتنی بڑی غلطی ہے۔ بہر حال ارباب ادب اُردو ہی کا فرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں۔ جب تک ان کے ترجمے اور شرحیں نہ لکھی جائیں گی بیچارے مستشرقین کو کیا معلوم ہوگا کہ کیسے کیسے باکمال اس سرزمین سے اُٹھے اور پیوند خاک ہو گئے۔

چپہ چپہ ہے یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

غزل

(از جگدیش سہائے صاحب سکسینہ بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

اور بھی وحشت ہوئی گلہائے خنداں دیکھکر
بڑھ گیا جوش جنوں چاکِ گریباں دیکھکر

اللہ اللہ۔ یہ ترے درسِ محبت کا اثر
چشم تر روتی ہے دشمن کو بھی گریاں دیکھکر

باعثِ تکمیل الفت ہے وفورِ رنج و غم
شاد ہوتا ہوں بلائے شامِ ہجراں دیکھکر

اُف ری شبنم کی مآل اندیشیاں گلزار میں
صبح تک روتی رہی پھولوں کو خنداں دیکھکر

شوقِ وصلت ہے اگر۔ ترک تمنا کیجئے
دل میں وہ آتے ہیں لیکن دلکو ویراں دیکھکر

اک بہارِ بیخزاں ہے میرے پہلو میں نہاں
بھول جاتا ہوں چمن کو داغِ سوزاں دیکھکر

محبس دنیا میں ہم زحمت کش بند حیات
جی کو بہلاتے رہے گورِ غریباں دیکھکر

تہذیب

(پنڈت اندرجیت شرما)

حُسن کی دیوی ہے یا برقِ حیا پرور ہے تو
کھینچ لے جو دل حسینوں کے بھی وہ منظر ہے تو

تیرے پرتو سے ہے قائم آب و تابِ زندگی
روشنی پاتا ہے تجھ سے آفتابِ زندگی

بادۂ گلگوں چمکتا ہے گلاسوں میں ترے
کیسے دلکش تار ہیں رنگیں لباسوں میں ترے

عالمِ ایجاد میں بجتا ہے جب تیرا رباب
جوش پر آتا ہے انساں کے تخیّل کا شباب

ہو کے رہ جاتا ہے دل قرباں ترے انداز پر
لوٹ ہوتی ہیں نگاہیں خلق کی ہر ناز پر

پھونک دیتی ہے فضائے دہر پر تو کیا سکوں
دل میں موجیں مارنے لگتا ہے سیلابِ جنوں

جذب ہونے لگتے ہیں پُرنور منظر آنکھ میں
سینکڑوں رنگینیاں کر لیتی ہیں گھر آنکھ میں

آنچلوں کی سرسراہٹ ڈھانے لگتی ہے غضب
شادمانی بخشتے ہیں روح کو عیش و طرب

قمقموں کی جلوہ ریزی تیرے کاشانوں میں ہے
زندگی خُلدِ بریں کی تیرے ایوانوں میں ہے

تیرے گہواروں میں پلتا ہے نزاکت کا شباب
تجھ پہ پڑتی ہے زمانے کی نگاہِ انتخاب

مال سے اُلفت ہے تجھکو زر سے تجھکو پیار ہے
جو ترا شیدا ہے دُنیا میں وہی زردار ہے

تیری خوش پوشی نرالی ہے، تعجب خیز ہے
ہر نمایش کیف آور ہے سرور انگیز ہے

اہلِ عالم پڑھ رہے ہیں خطبے تیرے نام کے
جھومتے ہیں بے پیئے متوالے تیرے جام کے

موجزن بحرِ لطافت ہے ترے جذبات میں
دن کا نظّارہ ہے عریاں ہر اندھیری رات میں

مایۂ عیش و طرب ہے، مرکزِ اُمید ہے
تو نویدِ کامرانی ہے پیامِ عید ہے

ہو گئیں گلزار پرتو سے ترے آبادیاں
تیرے دم سے رچ گئیں ماتم کدوں میں شادیاں

زندگی مستور ہے رنگیں اداؤں میں تری
صبحِ ارماں منہ دکھاتی ہے فضاؤں میں تری

کس ادا سے کھیلتی ہے تو زمیں کے فرش پر
لیکے انساں کو پہنچ جاتی ہے لیکن عرش پر

تیری زرّیں پتیوں پر دیکھ کر نقش و نگار
منہ کو آنچل میں حیا سے ڈھانپ لیتی ہے بہار

دخل دل پر کیسی آسانی سے پالیتی ہے تو
نقش آب و گل پہ فوراً ہی جما لیتی ہے تو

نور ہے تیرا ہی جو دنیا کی ہر محفل میں ہے
تیری ہی رونق ہے جو ہر گھر میں ہر منزل میں ہے

راگ اُٹھتے ہیں ترے سازوں سے لہراتے ہوئے
اور دلوں پر چھا کے رہ جاتے ہیں ٹکراتے ہوئے

دوسرا پہلو مگر اک پردۂ تاریک ہے
لائقِ نفرت ہے وہ اور قابلِ تضحیک ہے

تجھ سے ہی ہو جاتے ہیں اعضا بدن کے مضمحل
تجھ سے ہی بے آب ہو جاتا ہے رنگِ آب و گل

لوٹ لیتی ہے جوانوں کی جوانی کی بہار
قعرِ ذلت میں پھنسا کر تجھکو آتا ہے قرار

ہوش کی ڈاکو ہے تو اوسان کی رہزن ہے تو
قتل کر دے ہاتھ سے شوہر کو بھی وہ زن ہے تو

آگہی کی دھجیاں تیرا اڑاتا ہے جنوں
کور کر دیتا ہے دنیا کو ضیاؤں کا فسوں

زندگانی کا اُلٹ دیتی ہے پل بھر میں نظام
باتوں ہی باتوں میں کر دیتی ہے تو قصّہ تمام

پستیوں پر دھر کی رکھتی ہے تو اپنی نظر
توڑ کر رکھ دیتی ہے عالم کی ہمّت کی کمر

داستاں ہے غم کی پوشیدہ نویدِ عیش میں
یاس و حسرت کا تماشا ہے امیدِ عیش میں

بن کے آتی ہے زمیں پر تو وہ سیلابِ فنا
کانپ اُٹھّے دیکھ کر جس کو فرشتہ موت کا

تیرے سازِ زندگی سے جو نکل جاتے ہیں راگ
خوف کی دُنیا میں لہراتے ہیں وہ بن بن کے ناگ

کیسا ہیبتناک نقشہ تیرے ہیجانوں کا ہے
یعنی خونریزی نتیجہ تیرے طوفانوں کا ہے

کسقدر سفّاک ہے تو کس قدر خونخوار ہے
دم نہ لے جو کاٹ کر سر بھی تو وہ تلوار ہے

صبر کی مضبوط بنیادیں ہلا دیتی ہے تو
خاک میں سب حسرتیں دل کی ملا دیتی ہے تو

اہلِ ظاہر جانتے ہیں تجھ کو الفت کی حدیث
اہلِ باطن کی نظر میں ہے تو نفرت کی حدیث

غم بڑھا دیتی ہے تو راحت گھٹا دیتی ہے تو
بھائی کی گردن کو بھائی سے کٹا دیتی ہے تو

تھپکیاں دیکر سُلا دیتی ہے جب انسان کو
چھوڑتی ہے اس کا پیچھا بھی تو لے کر جان کو

جان دیتے ہیں جو پہلے نغمہ خوانی پر تری
پھر وہی پِٹتے ہیں لعنت خوں فشانی پر تری

زحمتِ بیچارگی سے دل ہر اک غمناک ہے
بے کسی بے مائگی سے سب کا سینہ چاک ہے

ابنِ آدم کو مٹانے کے لئے تیّار ہے
سادگی کی روح سے تو برسرِ پیکار ہے

رہتے ہیں تیری جبینوں پر تکلّف کے نشاں
اصلیت کو بھی چھپا لیتی ہیں رنگ آمیزیاں

جذبۂ احرار کو خاموش کر دیتی ہے تو
فطرتی انوار کو روپوش کر دیتی ہے تو

سینوں پہ رکھ دیتی ہے قانون کا سنگِ گراں
سانس تک لینے نہیں دیتیں تری پابندیاں

تیرے دلدادوں کو ہوتا ہی نہیں حاصل سکوں
بیٹھنے دیتا نہیں اک حال پر تیرا جنوں

شانِ عالی ہی نرالی ہے ترے دربار کی ‌ ‌ ‌ روح تک جس میں نہیں اخلاص کی ایثار کی
ہو کے رہ جاتی ہے گل شرم وحیا کی روشنی ‌ ‌ ‌ کھیل دکھلاتی ہے کیا انسانیت کی زندگی
جور سے ہی واسطہ تجکو جفا سے کام ہے ‌ ‌ ‌ کیا تماشا ہے کہ پھر تہذیب تیرا نام ہے
وہ تری تعلیم ہے جس میں دلیری ہی نہیں ‌ ‌ ‌ غیرت واحساس ڈھونڈے سے نہیں ملتے کہیں
تقویت پا جاتے ہیں دم سے ترے بغض وریا ‌ ‌ ‌ نام تک باقی نہیں رہتا وفا و حلم کا

داستاں ہے تیرے کرتوتوں کی محشر آفریں
اے سکوں دشمن! جہالت تجھ سے بہتر ہی کہیں

انکشافِ حقیقت

(از حضرت بیتاب بریلوی۔ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

رہینِ غمِ عشق ہر مرد و زن ہے ‌ ‌ ‌ ہوس پیشہ دنیا ترا حسنِ ظن ہے
فرشتوں نے جس جا بکھیرے ہیں سجدے ‌ ‌ ‌ وہ میرا وطن ہے وہ میرا وطن ہے
حقیقت میں دنیا اک عشرتکدہ ہے ‌ ‌ ‌ مگر اپنی قسمت سے دار المحن ہے
شباب شبِ تار ڈھلنے لگا ہے ‌ ‌ ‌ ستاروں کی سمٹی ہوئی انجمن ہے
مہ نو نے کھینچی ہے رنگین جدول ‌ ‌ ‌ کنارِ افق چاندنی ہالہ زن ہے
چمکتا ہے زرتار آنچل کسی کا ‌ ‌ ‌ کہ اُڑتی ہوئی سی سنہری کرن ہے
اک عالم میں کل جسکے سکے رواں تھے ‌ ‌ ‌ وہی آج محتاجِ گور و کفن ہے
ہجوم تمنا کی بیچارگی پر ‌ ‌ ‌ جوانی کی بے بس حیا خندہ زن ہے
اشاروں اشاروں میں ہنستی ہیں کلیاں ‌ ‌ ‌ قبائے گل تر شکن در شکن ہے
خزاں کی ستم رانیاں سن چکا ہوں ‌ ‌ ‌ میری آستیں آج رشکِ چمن ہے

نرالا ہے انداز شیون ہمارا
نئے ساغروں میں شراب کہن ہے

اولمپک کھیل

یونان کے جنوب میں موریا[1] نامی ایک چھوٹا سا جزیرہ نما واقع ہے جس کے مغربی ساحل پر ملک ایلیس[2] نامی ایک علاقہ ہے۔ جس میں ایک چھوٹا سا شہر اولمپیا[3] نامی ہے۔ قدیم زمانہ میں یعنی حضرت عیسےٰ سے ہزار ہا سال پہلے اس شہر کے متصل ایک وسیع میدان میں آلٹس[4] دیوی کے نام پر ایک بہت بڑا باغ تھا۔ جس کے اندر یونانیوں کے مہا دیو "ذیوشس[5]" کا ایک عالیشان مندر تھا جس میں مشہور ومعروف یونانی بت تراش فیدیاس[6] کا بنایا ہوا ہاتھی دانت کا ایک بہت بڑا بت رکھا تھا یونانی دیو مالا کی قدیم روایت ہے کہ جب یونانیوں کی اہل ایلیس سے جنگ ہوئی تو مشہور و معروف یونانی ہیرو ہرقلیش[7] نے ایلیس کے بادشاہ آجیاس کو قتل کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نمایاں فتح کا جشن اولمپیا کے میدان میں منایا۔ جس میں اس نے گرد و نواح کے پہلوانوں اور ورزشی نوجوانوں کو مدعو کیا جنھوں نے مختلف کھیلوں میں اپنے اپنے کمالات دکھائے۔ یہی اولمپک کھیلوں کی ابتداء ہے۔ رفتہ رفتہ یہ یونانیوں کا ایک قومی جشن ہو گیا اور ہر چوتھے سال منایا جانے لگا اور یہ بھی قاعدہ جاری ہو گیا کہ ان کھیلوں میں جو لوگ کامیاب ہوتے تھے اُن کے نام کندہ کر کے ہیرا[8] دیبی کے مندر میں لٹکائے جاتے تھے۔ اور ملک بھر میں ان کی بہت عزّت ہوتی تھی۔ جب اولمپیا کے دنگل کا زمانہ قریب ہوتا تو نقیب لوگ تمام ملک میں گشت لگا کر گاؤں گاؤں اور شہر شہر اس کی مقررہ تاریخوں کی اطلاع دیتے تھے۔ جس مہینہ میں یہ کھیل ہوتے اسمیں ہر قسم کی جنگ و جدل بند کر دی جاتی تھی اور اس رسم کی مذہبی قاعدہ کی طرح پابندی کی جاتی تھی۔ میلہ کے ایّام میں لاکھوں آدمی مندر کے میدان میں جمع ہوتے تھے اور چند روز کے لئے خیموں کا ایک عظیم الشان شہر آباد ہو جاتا تھا۔ اور اس چہار سالہ میلہ کا نام اولمپیاڈ[9] ہے۔

۷۷۶ء قبل مسیح کے اولمپیاڈ میں ملک ایلیس کا ایک جوان مسمی قاریبوس[10] پیادہ دوڑ میں اوّل آیا۔ چنانچہ اس کے ہموطنوں کو اس کامیابی سے اتنی خوشی ہوئی کہ اُنھوں نے اس کا نام

[1] Morea [2] Elis [3] Olympia [4] Altis [5] Zeus [6] Pheidias
[7] Harcules [8] Hera [9] Olympiad [10] Coroebus

کندہ کرا کے مندر میں لٹکا دیا۔ اسی دن سے یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۲۰ ۷ قبل مسیح تک صرف اہل ایلیس یا ان کے ہمسایوں کے نام کندہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد اہل کارنتھ، اہل میگاریہ اور ان کے بعد ایتھنز اور شمالی کوہستانیوں کے لوگوں کے نام بھی نظر آنے لگے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولمپیا ڈ نے ایک دیہاتی میلہ سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے قومی حیثیت و شہرت حاصل کر لی تھی جس میں خاص یونان کے علاوہ نو آبادیوں کے شہزور بھی آ کر اپنے اپنے کمالات دکھاتے تھے۔ یہ سلسلہ بارہ سو برس تک جاری رہا۔

کھیلوں میں ہار جیت کا فیصلہ کرنے والے دس آدمی ہوتے تھے۔ ملک ایلیس میں دس قبائل آباد تھے۔ اور ہر قبیلہ میں سے ایک ایک جج منتخب کیا جاتا تھا۔ ان ججوں کو جنھیں یونانی زبان میں ہیلانو ڈیسائی[1] کہتے تھے۔ دس مہینہ تک مختلف کھیلوں کے قواعد و ضوابط کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مختلف ممالک کے اُمیدوار بہت دنوں پیشتر سے موقعہ پا کر الطس دیبی کے اکھاڑے یا "جمنازیم[2]" میں محنت کرنے آجاتے تھے۔ جن لوگوں کے سپرد اس میلہ کا اہتمام کیا جاتا تھا وہ ایک خاص پوشاک پہنکر آراستہ و پیراستہ رتھوں میں سوار ہو کر قطار در قطار دیوتا کا "پرشاد" لئے ہوئے آگے آگے چلتے تھے۔ میلہ میں مقابلہ صرف شہزوری یا کھیلوں تک محدود نہ رہتا تھا بلکہ فنون میں بھی کمالات دکھائے جاتے تھے۔ دیمتری[3] دیبی کی پوجارنیوں کے سوائے دوسری تمام عورتوں کو بھی میلہ دیکھنے اور مقابلہ میں شریک ہونیکی اجازت تھی۔

جس روز کھیل شروع ہوتے تھے اس کی صبح کو طلوع آفتاب کے وقت تمام اُمیدواروں کو صدر صاحبان کے سامنے پیش ہو کر نسل کے لحاظ سے خالص یونانی ہونے اور اپنے نیک چلن ہونے کا حلف اُٹھانا پڑتا تھا۔ اور یہ بھی اطمینان دلانا پڑتا تھا کہ وہ دیبی کے اکھاڑے میں مسلسل دس ماہ تک مشق کرتے رہے ہیں، اور اب مقابلے میں کسی قسم کے مکر و فریب سے کام نہ لیں گے۔

تمام رسمیات کے بعد تمام اُمیدوار کھیل کے میدان میں پہونچکر دنگل میں داخل ہوتے تھے۔ اور اپنے جسم پر تیل کی مالش کر کے چار چار آدمیوں کی ٹولیوں میں تقسیم کر دئے جاتے تھے۔ دوڑ کے ابتدائی خط پر قرعہ اندازی سے کھڑے ہونے کی جگہ ملتی تھی۔ کھیل شروع ہونے پر چار آدمی خطِ روانگی پر جا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور ایک نقیب بہ آواز بلند اعلان کرتا تھا۔ کہ جس شخص کو کسی امیدوار کی نسل یا چال چلن پر اعتراض ہو تو وہ سامنے آ کر بیان کرے اور جب کوئی اعتراض

[1] Hellanodicae [2] Gymnasium [3] Demetre

نہ ہوتا تو نرسنگھا پھونکا جاتا تھا جس کی آواز سنتے ہی مقابلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ستترہویں اولمپیاڈ تک یہ میلہ ایک ہی دن میں ختم ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن امیدواروں کی تعداد میں اضافہ کی وجہ سے بعد میں یہ کھیل پانچ دن تک جاری رہنے لگے۔

شروع شروع میں کامیاب امیدواروں کو معقول انعامات دئے جاتے تھے، لیکن چوتھے اولمپیاڈ سے یہ قاعدہ بدل دیا گیا۔ اور جو شخص کھیل میں نمبر اوّل آتا تھا اس کے سر پر جنگلی زیتون کی شاخوں کا بنا ہوا تاج رکھ دیا جاتا تھا۔ یہ شاخیں زیتون کے اُس مقدس درخت سے جو ہرقلیس نے طبقۂ ظلمات میں دریائے الیسٹر کے کنارہ سے لاکر الطس وہیں کے باغ میں نصب کیا تھا طلائی ہنسیہ سے کاٹکر لائی جاتی تھیں۔ اس طرح اس مقابلہ میں قومی اعزاز و احترام کے سوائے کوئی مادی فائدہ نہ ہوتا تھا۔

انعامات دینے کا طریقہ یہ تھا کہ نقیب کامیاب امیدوار کا نام مع ولدیت اور سکونت بلند آواز سے پکارتا تھا۔ اور جج صاحبان ہاتھی دانت کی ایک مطلّا چوکی سے زیتونی تاج اٹھا کر امیدوار کے سر پر رکھ دیتے تھے اور ہاتھ میں کھجور کی ایک شاخ دیدیتے تھے۔ جس کے بعد کامیاب اُمیدوار اپنے احباب کے حلقہ میں باجے گاجے کیساتھ نکلتا تھا۔ اور راستے بھر اس پر پھول برسائے جاتے تھے۔ اور اس شخص کے نام پر یونانی سال کا ایک دن مقرر ہو جاتا تھا۔ اور جب وہ اپنے وطن میں واپس آتا تھا تو اسے بہت کچھ ملتا تھا، یعنی اگر وہ ایتھنز[۱] کا رہنے والا ہوتا تھا تو اس کو حکیم سولن کے قانون کے بموجب پانچ سو درم اور تمام عمر مفت کھانا ملتا تھا۔ اگر وہ اسپارٹا[۲] کا باشندہ ہوتا تھا تو میدان جنگ میں اسے عزت کی جگہ دی جاتی تھی۔ اور یونان کے بڑے بڑے مشہور شاعر اس کی شان میں قصیدے کہتے تھے۔ اور حکومت نامور سنگ تراشوں سے ان کے بت بنانے کی فرمائش کرتی تھی۔

اولمپک کھیلوں کی طرح یونان کے تین قومی میلے اور بھی ہوتے تھے:۔

(۱) پائتھیاڈ[۳]۔ یہ کھیل اور میلہ ہر چوتھے سال اپالو[۴] دیوتا کے اعزاز میں ڈلفائی[۵] کے مندر میں ہوا کرتا اور کامیاب امیدوار کو انعام میں پھولوں کا تاج دیا جایا کرتا تھا۔ یہ میلہ اور اس کا دنگل ۵۲۷ قبل مسیح سے زیادہ مشہور ہو گیا تھا۔

(۲) نیمیان[۶] کھیل ہر دوسرے سال ذیوس دیوتا کے اعزاز میں ۵۱۶ قبل مسیح سے شروع کئے گئے تھے۔

---

[۱] Athens [۲] Sparta [۳] Pythiad [۴] APPollo [۵] Delphi [۶] Nemean

اس میں جیتنے والے امیدوار کو جنگلی تلسی کا تاج پہنایا جاتا تھا۔

(۳) کارنتھین[۱] کھیل۔ یہ دنگل ۵۲۳ قبل مسیح سے خاکنائے کارنتھ میں ہونا شروع ہوا اور اولمپیاڈ دنگل سے ایک سال قبل اور ایک سال مابعد ہوا کرتا تھا۔ ان کھیلوں میں شہر ایتھنز کا جو باشندہ اوّل آتا تھا اسے قانون سولن کے بموجب پچاس درم نقد سرکاری خزانہ سے ملتے تھے۔

یونان میں اولمپک کھیل بارہ سو برس تک جاری رہے۔ اور ۲۷۶ مرتبہ ہوئے۔ بالآخر ۳۸۹ء میں عیسائی بادشاہ تھیوڈوسیس[۲] نے انھیں بند کرا دیا لیکن اس کی ممانعت کے باوجود اسکی شہرت اور نام ہمیشہ کے لئے باقی رہ گیا۔ چنانچہ اس کے پورے ڈیڑھ ہزار سال بعد فرانس کے بیرن پیری ڈی کوبرٹین[۳] کے دل میں اُمنگ اُٹھی اور اس نے اولمپک کھیلوں کو از سر نو زندہ کرنیکا تہیہ کر لیا۔ لیکن اہل فرانس نے اس معاملہ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ تاہم اس تحریک کو اسقدر کامیابی ہوئی کہ ۱۸۹۶ء میں یونان کے پایہ تخت ایتھنز کے قریب ایک پرانے میدان[۴] میں جہاں تیسری صدی عیسوی میں گھوڑ دوڑ ہوا کرتی تھی اولمپک کھیل منعقد کئے گئے۔ یہ میدان نہایت وسیع اور اس کا کوہستانی منظر نہایت دلفریب ہے۔ اسی جگہ یونان کی مشہور پچیس میل لمبی "میر یتھان[۵]" دوڑ ہوئی تھی۔ جس کے تذکرے یونان کے قومی لٹریچر میں ابتک فخر اور شوق کیساتھ بڑھے جاتے ہیں۔ اس مرتبہ دوڑ میں ایک یونانی۔ ہتوڑا پھینکنے میں ایک انگریز اور دوسرے مختلف کاموں میں امریکن لوگ اوّل رہے۔ اور اس کے بعد اولمپیاڈ کھیلوں کا سلسلہ ہر چوتھے سال مختلف ممالک میں جاری ہو گیا۔ مثلاً سنہ ۱۹۰۰ء میں پیرس، سنہ ۱۹۰۴ء میں بلجیم اور سنہ ۱۹۰۸ء میں لنڈن میں اولمپک کھیل منعقد کئے گئے۔

لنڈن کے اولمپک کھیل میں دنیا کی بیس مختلف قوموں کے کھلاڑی شریک ہوئے تھے۔ اور بیس ہی مختلف کھیلوں میں مقابلہ ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں یہ کھیل اسٹاکھام میں ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں برلن کا انتخاب ہوا۔ لیکن جنگ عظیم کی وجہ سے وہاں کھیل نہ ہو سکے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں اینٹورپ کو یہ سعادت حاصل ہوئی سنہ ۱۹۲۴ء میں یہ کھیل پیرس میں غیر معمولی دھوم دھام کیساتھ منعقد ہوئے اسوقت دنیا کی پینتالیس قوموں کے نمایندے شامل تھے۔ اور مقابلہ کرنیوالے کھلاڑیوں کی تعداد لندن سے چند تھی۔ غرض اب ہر چوتھے سال کہیں نہ کہیں اولمپک کھیل منعقد ہوتے ہیں۔ امسال یعنی ۱۹۳۶ء

---

[۱] Corinthian [۲] Theodosius [۳] Pierre de Coubertine [۴] Stadium [۵] Marathon

میں یہ کھیل برلن پایۂ تخت جرمنی میں ہوئے۔ جہاں ہر ہٹلر کے زیر ہدایت نہایت دھوم دھام سے تیاریاں کی گئیں۔ برلن کی کوئی دکان یا مکان ایسا نہ تھا جو خوشرنگ جھنڈیوں سے آراستہ نہ کیا گیا ہو۔ تمام سڑکیں دنیا کی مختلف قوموں کے جھنڈوں سے سجائی گئیں۔ برلن کے قریب ہی ایک گاؤں اولمپک کے نام سے آباد کیا گیا ہے۔ جرمن زبان میں اسے "دار الامان" کہتے ہیں اور یہاں ہر قوم کے نمایندوں کے لئے الگ الگ عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں جن پر اسی قوم کا جھنڈا لہراتا ہے۔ ہر ہٹلر نے مہمانوں کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اس کھیل کا آغاز یکم اگست ۱۹۳۶ء کو برلن اسٹیڈیم میں لاکھوں آدمی کے موجودگی میں ہوا۔ اس بین الاقوامی تقریب کی افتتاحی رسم خود ہر ہٹلر نے ادا کی۔ ہر ہٹلر ایک بلند مرکزی مقام پر کھڑے ہو گئے اور انکے سامنے سے ٹیمیں گذرنے لگیں۔ ہر ٹیم کیساتھ اس کا قومی جھنڈا ہوتا تھا۔ سب سے پہلے یونانی ٹیم اپنا قومی جھنڈا لہراتی ہوئی آئی اور ہٹلر کو سلام کرتی ہوئی گذر گئی۔ اس کے بعد مصری آئے جن کے سروں پر ہلال و کوکب کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہ لوگ ترکی ٹوپیاں پہنے تھے۔ مصریوں کے بعد افغانی ٹیم اپنے قومی لباس اور جھنڈے کیساتھ گذری، اسیطرح نمبروار چین، جاپان اور دنیا کی ترپن ۵۳ قوموں کی ٹیمیں نکلیں۔ ہندوستانی ٹیم بھی صافے باندھے ہوئے گذری، غرض دنیا کے پانچ ہزار کھلاڑی اس میدان میں موجود تھے۔

جب تمام ٹیمیں گذر چکیں تو اولمپک کھیلوں کے پریسیڈنٹ نے ایک حوصلہ افزا تقریر کی اور آٹھ دس ہزار جرمن بچوں نے کھیل کود کے مختلف کام دکھا کر رقص سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

دوسرے دن سے اولمپک کھیل شروع ہو گئے اور سولہ اگست تک جاری رہے۔ کوئی ہارا کوئی جیتا۔ ہندوستانی کھلاڑی ہاکی میں اوّل نمبر پر رہے۔ اس طرح ہندوستان کی بھی عزت رہ گئی۔

ہندوستانی ہاکی ٹیم کا پہلا میچ ہنگری سے ہوا۔ اس روز بارش ہو رہی تھی مگر ہندوستانی ٹیم نے ہنگری کو چار گول سے ہرا دیا۔ گو فریق مخالف نے بھی دانت کھٹے کر دئے تھے۔ دوسرا میچ امریکہ سے ہوا۔ امریکن ٹیم ہنگری والوں سے زبردست تھی لیکن ہندوستانی ٹیم نے ان کو بھی آٹھ گول سے ہرا دیا۔ ۱۰ اگست کو جاپان سے مقابلہ ہوا وہ بھی نو گول سے ہار گئے اور فرانس کو دس گول سے ہرایا۔ آخری ٹکر جرمنی سے ہوئی جو ہندوستانی ٹیم کو شکست دینے کے لئے چار سال سے مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ اسوقت جرمن ٹیم دنیا میں سب سے طاقتور خیال کی جاتی تھی۔ چنانچہ اولمپک کھیل شروع ہونے سے پہلے ایک ٹوسٹانہ میچ میں جرمن ٹیم نے ہندوستانیوں کو چار گول سے ہرا بھی دیا تھا۔ فائنل ۱۵ اگست کو جرمنی اور ہندوستان کے درمیان تھا۔ پچیس ۲۵ ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے ہندوستانی اور جرمنی ٹیم میدان میں اتریں

حاضرین نے ان کا جوش و خروش سے خیر مقدم کیا۔ ہندوستانی ٹیم میں ایلن، ٹیپسل، حسین، کلن گیلی بارڈی، شہاب الدین، دارا، دھیان چند، روپ سنگھ، جعفر۔ شریک تھے۔

پہلے نصف وقت میں جرمن ٹیم بڑی تندہی اور جانفشانی کیساتھ کھیلی۔ اور ہندوستانیوں کے متواتر نرغہ کے باوجود انھوں نے کوئی گول نہ ہونے دیا جس سے لوگوں کو خیال پیدا ہونے لگا کہ شاید یہ میچ برابر رہے گا۔ لیکن روپ سنگھ نے یکایک وہ کمال دکھایا کہ بجلی کی سی تڑپ کیساتھ گیند لیجا کر ایک گول کرہی دیا۔ اور لوگوں نے "شاباش! شاباش!! ہندوستان زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگائے۔

دوسرے نصف وقت میں جرمنوں پر ہندوستانیوں کا سکّہ بیٹھ گیا۔ اور اُنھوں نے گول پر گول کرنا شروع کر دیا۔ ساتویں منٹ میں ٹیپسل نے دوسرا گول کیا۔ اس کے بعد دسویں منٹ میں تیسرا اور گیارہویں منٹ میں چوتھا گول دھیان چند نے کیا۔ اس پر بھی جرمنوں نے کوئی پروا نہ کی۔ بلکہ جس طرح زخمی شیر بپھر کر حملہ کرتا ہے اسی طرح اُنھوں نے بھی کیا۔ ہمت کیساتھ قسمت نے بھی یاوری کی اور سترھویں منٹ میں والٹس نامی جرمن کھلاڑی نے ایک گول ہندوستانی ٹیم کو کرہی دیا۔ اس وقت جرمن قوم کے جوش و خروش کا حال قابل دید تھا۔ وہ خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو گئے۔ عورت، مرد، بچے سب فرط مسرت سے چلا رہے تھے۔ لیکن یہ خوشی مختصر ثابت ہوئی، کیونکہ فوراً ہی جعفر نے پانچواں گول اور دارا نے چھٹا اور ساتواں گول کر دیا۔ آٹھواں گول پھر دھیان چند نے کیا۔ اس طرح جرمن ٹیم کو جو دنیا میں بہترین سمجھی جاتی ہے۔ فرزندان ہند نے سات گول سے شکست دی۔ اس طرح خدا نے غریب ہندوستان کی عزت رکھ لی

۱۶ اگست کو اولمپک کھیلوں کا خاتمہ ہوا۔ اس روز بھی زیادہ عظیم الشان تیاریاں تھیں۔ کیونکہ اب سالہا سال تک برلن کو پھر ایسا موقعہ نہیں ملیگا۔ لاکھوں آدمی پیشتر ہی سے آکر اسٹیڈیم میں جمع ہو گئے تھے۔ ہر ہٹلر، ڈاکٹر گوبیل، جنرل گورنگ وغیرہ تمام وزرا، سلطنت اور اعلیٰ حکام اور غیر ممالک کے سفیر صاحبان موجود تھے۔ اس روز شہسواری کے کرتب دکھائے گئے۔ ایک ترک شہسوار نے بھی اپنا کمال فن دکھایا۔ آخر میں کامیاب کھلاڑیوں کو تمغے تقسیم کئے گئے۔ مختلف ممالک کے حصہ میں جو تمغے آئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

---

۱ Allen ۲ Tapsell ۳ Galibardy ۴ Dr. Goebels ۵

General Goering ۶

شمار	نام ملک	طلائی تمغوں کی تعداد	نقرئی تمغوں کی تعداد	مسی تمغوں کی تعداد	نمبر[۱]
۱	جرمنی	۳۳	۲۶	۳۰	۱۸۰
۲	امریکہ	۲۴	۲۰	۱۲	۱۲۲
۳	ہنگری	۱۰	۱	۵	۳۷
۴	اٹلی	۸	۹	۵	۴۷
۵	فنلینڈ	۷	۶	۶	۳۹
۶	فرانس	۷	۶	۶	۳۹
۷	سویڈن	۶	۵	۹	۳۷
۸	جاپان	۶	۴	۸	۳۴
۹	ہالینڈ	۶	۴	۷	۳۳
۱۰	انگلینڈ	۴	۷	۳	۲۹
۱۱	آسٹریا	۴	۶	۳	۲۷
۱۲	زیچو سلافیکیہ	۳	۵	×	۱۹
۱۳	ایستھونیہ	۲	۲	۳	۱۳
۱۴	ارجنٹائن	۲	۲	۳	۱۲
۱۵	مصر	۲	۲	۲	۱۰
۱۶	سوئٹزرلینڈ	۱	۹	۵	۲۶
۱۷	کناڈا	۱	۳	۵	۱۴
۱۸	ناروے	۱	۳	۲	۱۳
۱۹	ٹرکی	۱	×	۱	۴
۲۰	ہندوستان	۱	×	×	۳

اس فہرست کے مطابق سب سے زیادہ کامیابی جرمنی اور امریکہ کو نصیب ہوئی۔ مصر بھی جو پہلی مرتبہ ان کھیلوں میں شریک ہوا تھا پانچ تمغے لے گیا۔ ہندوستان کو البتہ صرف ایک ہی طلائی تمغہ ملا۔

[۱] واضح ہو کہ تین نمبروں کے معنی ایک طلائی تمغہ، دو نمبروں کے معنی ایک نقرئی تمغہ اور ایک نمبر کے معنی ایک برنجی تمغہ ہیں

اس دفعہ کے اولمپک کھیل کے تماشائیوں میں مہاراجہ صاحب بڑودہ، مہاراجہ صاحب اندور اور راجہ صاحب پیرپور (لکھنؤ) بھی موجود تھے۔ جرمنوں نے اس مرتبہ عدیم المثال مہمان نوازی سے کام لیا اس کے متعلق جو انتظامات کئے گئے ہیں انکا اندازہ اسی سے کر لینا چاہیئے کہ اس دفعہ کے اولمپک کھیلوں کو دیکھنے کے لئے پندرہ لاکھ غیر ملکی جرمنی آئے۔ اور مقررہ گاڑیوں کے علاوہ ایکھزار ٹرینیں روزانہ برلن کو چلائی گئیں، کل پنتالیس لاکھ ٹکٹ فروخت ہوئے۔

جب کھیل ختم ہو کر انعامات تقسیم ہو چکے تو "آتش اولمپیا" کو سرد کرنیکا وقت آیا۔ اس کی تاریخ بھی بہت دلچسپ ہے۔ ابتداء میں یہ آگ الطس دیبی کے مندر کے "ہون کنڈ" سے لیجاتی تھی۔ جس کی نگرانی و پرداخت کنواری داسیاں کیا کرتی تھیں۔ اور قدیم سے یہ روایت تھی کہ اس آگ کو دیوتاؤں نے آسمان سے نازل کیا تھا چنانچہ اس روایت کی تقلید میں امسال جرمنوں نے بھی اس کے لئے ایک خاص وفد یونان بھیجا۔ جس کے پایہ تخت ایتھنز کی چودہ منتخب اور حسین لڑکیوں نے قدیم یونانی لباس میں آراستہ ہو کر اپنے ہاتھوں میں آتشی[1] شیشے لیکر ایک مرکز پر جہاں آتشگیر مادہ رکھا ہوا تھا۔ سورج دیوتا کی شعاعوں سے آگ پیدا کی اسی کو خاص اہتمام کیساتھ برلن لایا گیا۔ اور جب کھیل ختم ہو چکے تو یہ "آسمانی آگ" قدیم اولمپک رسمیات کیساتھ رفتہ رفتہ سرد کردی گئی۔

اس وقت تمام اسٹیڈیم برقی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ اور متجسس[2] روشنیوں کی قلمیں ہر طرف سے اسٹیڈیم پر پڑ رہی تھیں۔ گھنٹوں پہلے سے ایک لاکھ سے زیادہ تماشائی جمع ہو چکے تھے۔ دفعتاً بہت سے بگل ایک ساتھ پھونکے گئے اور پہلے دن کی طرح تمام کھلاڑی اپنے قومی جھنڈوں کے ساتھ ہر ہٹلر کو سلام کرتے ہوئے سامنے سے گذرنے لگے۔ ہر سلام کا جواب دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اسٹیڈیم سے اولمپک جھنڈا اُتارا گیا۔ اور آرکیسٹرا نے "قربانی" کا گیت گایا۔ ادھر جرمن مہ جبینوں نے اُتارے ہوئے جھنڈوں پر پھولوں کے ہار چڑھائے۔ جسوقت اولمپک جھنڈا آہستہ آہستہ اُتر رہا تھا۔ توپیں شلک کر کے سلامی اُتاری جا رہی تھی۔ جب جھنڈا اُتر گیا تو سارا مجمع ادب و احترام کیساتھ کھڑا ہو گیا اور سبھوں نے بیک وقت داہنے ہاتھ سے اس جھنڈے کو سلامی دی۔ پھر ایک منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ جس کے بعد اولمپک کلاک نے گھنٹہ بجایا اور پھر ایک منٹ سکوت طاری ہوا۔ اس کے بعد آلات کے ذریعہ سے جاپان کا یہ پیغام براڈکاسٹ کیا گیا:۔

[1] Lenses [2] Searchlights

"میں دنیا کے نوجوانوں کو ٹوکیو آنے کی دعوت دیتا ہوں"! اس کے بعد آرکیسٹرا نے نغمہ گایا۔

اولمپک کھیلوں کے سلسلہ میں رقص و سرود کی محفلیں بھی ہوئیں۔ چنانچہ پندرہ مختلف ممالک کے نامور رقاص شریک مقابلہ ہوئے تھے۔ ہندوستان کی نمایندگی مسز لیلا سوکھے عرف "مینکا" نے اپنی پوری جماعت کیساتھ کی تھی۔ چنانچہ "مینکا" نے فن رقص میں کمالات دکھاکر ہندوستان کیلئے تین مختلف انعامات حاصل کئے۔ پہلا انعام کتھک ناچ کے صلہ میں۔ دوسرا انعام ہندوستان کے قدیم رقصوں کے۔ اور تیسرا انعام مینکا کے ساتھیوں۔ اور سازندوں کو ملا۔

اب ۱۹۴۰ء میں جاپان کا نمبر ہے اور یہ سب سے پہلا موقعہ ہوگا کہ اولمپک کھیل ایشیا کے نامور شہر ٹوکیو میں منعقد ہوں گے۔

جذباتِ شوق

پنڈت جگموہن ناتھ صاحب رینہ۔ شوق

سوزِ دل تجھکو بغیر آگ لگائے نہ بنے
اور پھر کوئی بجھائے تو بجھائے نہ بنے

رنگِ رُخ اُڑنے پہ آجائے تو روکے نہ رُکے
لاکھ وہ راز چھپائیں تو چھپائے نہ بنے

کوئی کیا اس دلِ بیتاب سے اُمید رکھے
اپنی روداد جسے آپ سُنائے نہ بنے

کیا مزہ ہو نہ رہیں یاد جو اندازِ جفا
میں کہوں بھی کہ ستاؤ تو ستائے نہ بنے

اے فلک دیکھ لئے تیرے ستم کے انداز
کوئی افتاد ہو ایسی کہ اُٹھائے نہ بنے

خود وفا ہے مری شاہد کہ وفادار ہوں میں
لاکھ تم دل سے بُھلاؤ تو بُھلائے نہ بنے

دل کے ذرّوں میں ہے وہ جوشِ محبّت کی نمود
خاک میں اُن کو ملاؤ تو ملائے نہ بنے

گردِ الفت نے کچھ ایسی مری صورت بدلی
دامنِ دشت چھپائے تو چھپائے نہ بنے

دل کو اب تابِ تلافی و مداوا بھی نہیں
چارہ گر آئے تو احسان اُٹھائے نہ بنے

کوئی خاکہ مری تصویر کا کھینچے تو سہی
کھنچ بھی جائے کوئی نقشہ تو مٹائے نہ بنے

ایسے ڈھب سے ہو گلہ اُنکے ستم کا اے شوق
بات کچھ چاہیں بنانی تو بنائے نہ بنے

نکتہ سنج خوش نوا

(از ابو الفاضل راز چاندپوری)

حبذا اے نکتہ سنج خوشنوا گیسو بدوش
روح پرور ہے تری تقریر کا جوش و خروش

ادعائے علم و عرفانِ حقیقت، مرحبا
واقعی تو صاحبِ دل ہے یقیناً تیز ہوش

مظہرِ حسنِ تکلم ہے ترا طرزِ بیاں
ایک عالم تیری خوشگوئی کا ہے حلقہ بگوش

بادۂ اسرارِ الفت تیرے پیمانے میں ہے
یاد ہیں ابتک تجھے افسانہائے بزمِ دوش

منکشف ہے تیرے دل پر رازِ بزمِ کائنات
جانتا ہے تو رموزِ میکش و بادہ فروش

ترجمانِ رمزِ کن ہے واقعی تیری زباں
تیرا ہر اک لفظ ہے تفسیرِ پیغامِ سروش

صاف گوئی تیری فطرت کا ہی اک جزوِ لطیف
بے تکلف تو بھری محفل میں ہے نکتہ فروش

یہ تو سب کچھ سچ ہے لیکن کیا کہوں اک راز ہی
کہہ رہا تھا کل کسی میکش سے پیرِ مے فروش

خود فروشی شیوۂ اہلِ ہنر ہوتا نہیں
بے ادب خاموش باش و بادۂ صافی بنوش

اشعار

تجھ پہ ایمان ہے اور تو ایمان
ہم مسلماں ہوئے کافر ہو کر

کیفِ مے میں ہوا عرفاں حاصل
اعتبارِ مے و ساغر ہو کر

بیہوشی لازمۂ ہوش ہوئی
آئے وہ ہوش کا منظر ہو کر

(محمد شایق علیخاں ہندو)

حضرت فراقؔ کے سو اشعار

(از سید حامد حسن بلگرامی۔ ایم اے)

منشی رگھوپت سہائے صاحب فراقؔ۔ ایم۔ اے کی غزلیات کا یہ مختصر انتخاب غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ادب اُردو سے محبت کرنے والے اشخاص جانتے ہیں کہ حضرتِ فراق نے دنیائے شاعری میں پندرہ سال سے زیادہ رہ نوردی کی ہے اور شاعرانہ بلندیوں کی جستجو میں زندگی کے عزیز ترین اوقات صرف کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ ایک خاص رنگ تغزل حاصل کرنے پر قادر ہو گئے ہیں آپ کے کلام میں ایک پُر کیف محویت، اور دلپذیر انفرادیت بھی نمایاں ہے۔ لیکن اس جگہ اس انتخاب کی نسبت اتنا کہنا ضروری ہے کہ اسمیں عموماً وہ اشعار منتخب کئے گئے ہیں جو حضرت فراق کی طبیعت کے ہر رنگ کا آئینہ ہیں۔ اسکے ساتھ یہ بات بھی مدنظر رکھی گئی ہے کہ جہاں تک ہو سکے خیالات کی وہ مناسبت بھی قائم رہے جو عموماً غزلوں کے مختلف اشعار کے انتخاب میں مفقود ہو جاتی ہے۔ اور کل انتخاب میں پروازِ تخیل کی بلندیوں کی بدولت خود ایک تسلسل قائم ہو گیا ہے۔ اسی لئے بعض غزلوں کے دو اور تین اشعار اخذ کرنا پڑے۔ یہ صورت اس خیال سے بھی اختیار کرنا پڑی کہ بعض غزلوں کی وہ ہم آہنگی اور یکرنگی منقطع نہ ہونے پائے جنمیں ایک شعر کا تموج دوسرے شعر سے منسلک نظر آتا ہے۔

یہ مختصر انتخاب کسی خشک منطقی بحث کا متحمل ہو سکتا ہے پھر کیوں نہ اشعار ہی میں رازِ حسن کی تفسیریں اور رازِ عشق کی حقیقتیں دیکھی جائیں ؟ -

جانا اشاروں پر فراقؔ نرگسِ مست یار کے
ہم بھی مزاج داں ہیں کچھ گردشِ روزگار کے

ٹوٹا ہوا خمارِ مئے انتظار کا راز آشنا ہوں میں کسی غفلت شعار کا

درد والے روتے ہیں شائد یہاں اے کوئے دوست
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا۔

اے گرفتار محبت سرِ شوریدہ سنبھال
یہ وہ زنداں ہے کہ دیوار نہ در ہوتا ہے
لاکھ افسانوں کا افسانہ ہے افسانۂ عشق
جتنا بے ربط ہو اُتنا ہی اثر ہوتا ہے

فریبِ رنگ و بو سے بچ کے سیرِ بوستاں کرتے
بہارِ چند روزہ کو بہارِ جاوداں کرتے

غرض کہ کاٹ دئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

دیکھو جب عالمِ ہُو کو تو نیا عالم ہے
بستیاں بھی نظر آنے لگیں ویرانوں میں
جانِ ایمانِ جنوں، سلسلہ جنبانِ جنوں
کچھ کشش ہائے نہاں جذب ہیں ویرانوں میں
بزمِ مے بیخود و بیتاب نہ کیوں ہو ساقی
موجِ بادہ ہے کہ درد اُٹھتا ہے پیمانوں میں
جلوۂ صبحِ ازل، کیفیتِ شامِ ابد
نظر آتے ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں میں

نگاہوں میں ہے شوخی لب پہ ہلکا سا تبسم ہے
کہانی سُن رہے ہیں وہ کسی دُکھتے ہوئے دل کی

لڑتے ہیں شیشے بھی ٹکراتے ہیں پیمانے بھی
نگہِ مست سے جنبش میں ہیں میخانے بھی

اُجڑنا تھا جنہیں اجڑے بھرے گلزار کے ہاتھوں
مُبارک برق کو غارت گرِ صد آشیاں ہونا

فریبِ رنگ و بو کھا کر چمن سے ہاتھ دھو بیٹھے
ترے وحشی تو کب کے لے اُڑے ہوتے گلستاں کو
توجہ ہے، عنایت ہے، کرم ہے، لطف و احساں ہے
مگر کیا کیجئے تیرے تغافل ہائے پنہاں کو

میری جمعیتِ خاطر فراق اب یوں ہی ہوتی ہے
پریشاں اور کر لینا خیالاتِ پریشاں کو

لرز رہی ہے فضا عالمِ محبت کی
کچھ اس طرح نگہ یار شرمسار ہے آج

نگاہِ یار کچھ ایسی پھری حرماں نصیبوں سے
کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غمخوار ہو جائے

اک وقت ہو گا ہم سے جو دیکھا نہ جائے گا
ہم جانتے ہیں اے شبِ ہجراں سحر تری
صبحِ شبِ فراق ہوئی اور ابھی فراق
بیٹھا ہے اپنے گھر کو کئے رہ گزر تری

کھنچتا جاتا ہے جہاں عالمِ بالا کی طرف
ایک نقشہ ہے یہ عالم تیری انگڑائی کا

گل کہاں بادِ بہاری کے ابھر آئے ہیں داغ
آہ سمجھا ہی نہیں رازِ گلستاں کوئی

ذکرِ فراق چھیڑنے کی چیز ہی نہ تھی
اک عالمِ سکوت تری انجمن میں ہے

منہ پھیرے ادھر سے جانے والے
مجھ پر قہرِ خدا کو دیکھا
تری وہی سرگرانیاں سہی
ہم نے اپنی وفا کو دیکھا

ہستی کے بند بند الگ ہو کے رہ گئے
دل پر پڑی تری نگہ بے قرار کیا؟
کچھ لڑکھڑا رہی ہے نسیمِ بہار بھی
ساغر بکف اٹھا کوئی صبحِ بہار کیا؟

رُخِ رنگیں سے گلستاں کو ہو دعویٔ جمال
نام لے نکہتِ برباد نہ رعنائی کا

تعیناتِ تو اُمید و بیم کے ٹوٹے
وہ پا گئے تری ہاتھوں ہمیں جو پانا تھا
کسی کے صبر نے بے صبر کر دیا ہم کو
فراق نزع میں کروٹ کوئی بدلتا تھا

کیا چیز آہ۔ یادِ وطن ہے زمانے میں　　　صیاد ہم قفس میں ہیں یا آشیانے میں

رفتہ رفتہ موت کی نیند آ گئی ہنگامِ قتل　　　سو گئے افسانہ بے دردیٔ قاتل سے ہم

اشاروں پر جنوں کے چل رہے ہیں تیرے زندانی　　　عجب بیساختہ پن آج ہے شورِ سلاسل میں

یہ انتہائے ہوش ہے، یہ بے خودی نہیں　　　خورشید ہی کی آخری منزل تو رات ہے

قید کیا، رہائی کیا، ہے ہمیں میں ہر عالم　　　رُک گئے تو زنداں ہے چل پڑے بیاباں ہے
اے فراقؔ انہیں پا کر ہم یہ دل میں کہتے ہیں　　　سوچیے تو مشکل ہے دیکھیے تو آساں ہے

جو درد کے مٹنے پر ہاتھ آئے وہ درماں ہوں　　　اعجاز سلیماں کی تاخیر پشیماں ہوں

اُمیدِ مرگ تاکے، زندگی کا دردِ سر کب تک　　　یہ مانا صبر کرتے ہیں محبت میں، مگر کب تک
وبالِ وحشت سے کچھ ہو چلے ہیں ان فضاؤں میں　　　میری پرواز میں حائل رہیں گے بال و پر کب تک
گریباں پھاڑ لے، منہ موڑ لے جشنِ گلستاں سے　　　کہ زیرِ آسماں یہ منظرِ رقصِ شرر کب تک

اک نگاہِ شرمگیں تھی داستاں در داستاں　　　اک پیامِ زیرِ لب افسانہ در افسانہ تھا

نزع میں اک شکن جبیں پر تھی　　　داستاں تیری بے وفائی کی
ہم سے کیا ہو سکا محبت میں　　　تو نے تو خیر بے وفائی کی

دوستی جس پر تصدق صلحِ کل جس پر نثار　　　وہ چڑھی تیور تھی اک آمادۂ پیکار کی

کر ترک بھی دنیا کو دنیا کی طلب بھی کر　　　چلتے ہوئے دنیا میں بچتے ہوئے دنیا میں

یہی حیا ہے یہی جان ہے محبت کی　　جو نیچی نظروں سے کہتی ہے "ہم تمہارے ہیں"

ہمارا حال سننے والے تیرے ضبط کے صدقے　　یہ رہ رہ کر تیرا ہم مسکرا دینا سمجھتے ہیں
کہاں کا وصل، تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے　　ترے دم بھر کے مل جانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

ڈرتا ہوں کامیابیٔ تدبیر دیکھ کر　　یعنی ستم ظریفیٔ تقدیر دیکھ کر
اہلِ جنوں کو وسعتیں کچھ اور مل گئیں　　دل بڑھ گئے ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

مدّتیں قید میں گذریں مگر اب تک صیّاد　　ہم اسیرانِ قفس تازہ گرفتار سے ہیں

اُبھر کر اُٹھ چلا اوپر کو عالم　　کوئی انگڑائیاں لیتا اُٹھا کیا؟

اے رازِ جہاں بتانے والے　　اک اور جہانِ راز بھی ہے
اے مُطربِ نغمۂ حقیقت　　اک تارِ رگِ مجاز بھی ہے

کچھ مداوا بھی ہو مجروح دلوں کا اے دوست　　مرہمِ زخم ترا جور پشیماں ہو جائے
یہ بھی سچ ہے کوئی فرقت میں پریشاں کیوں ہو　　یہ بھی سچ ہے کوئی کیوں کر نہ پریشاں ہو جائے

دلِ ویراں کے سوا کچھ دلِ ویراں نہ ہوا　　یہ وہی گھر ہے جو شرمندۂ مہماں نہ ہوا

دنیا کا رنگ و بو بھی وہ رنگ و بو نہیں ہے　　جب سیر کر چکے ہم دنیا کے رنگ و بو کی

اب بارِ زیست کا بھی اُٹھانا ہوا محال　　ہم جرمِ عشق کر کے کسی کی حیا ہوئے

پاتے جو ہم تجھے تو نہ جانے کہ ہوتے کیا　　کھو کر تو ہم تجھے دلِ بے مدعا ہوئے

مستی میں لگاوٹ سے اس آنکھ کا یہ کہنا ۔۔۔ میخوار کی نیت ہوں ممکن ہے بدل جانا

فرقتِ گل میں بھڑک اٹھی ہے تیرے دل کی آگ ۔۔۔ یہ کھلا گلزار اے بلبل تری تصویر ہے
تیلیوں پر ہے نشیمن ساز تنکوں کا گمان ۔۔۔ اب قفس اپنا سراپا حسرتِ تعمیر ہے

نمودِ شاہدِ دنیا تھی اک جاتی ہوئی دنیا ۔۔۔ نگاہِ حسنِ عالم بھی نگاہِ واپسیں نکلی

یہ جذب کیا ہے کہ تصویر خانۂ دل میں ۔۔۔ ہر ایک نقش کو حسرت ہے بیٹھ جانے کی

اب ہمیں بھی نہ یوں ستا پیہم ۔۔۔ اب ہمارا بھی اعتبار نہیں

دھڑکوں میں عمر کاٹی اے شمع میں نے لیکن ۔۔۔ مجھ سے نظامِ عالم ٹھہرا ہوا رہا ہے

نثار پرسشِ غم کے، ترے کرم کے نثار ۔۔۔ ہیں عبرتیں بھی کچھ اے دستِ عشق رسوا کو
نہ ہے یہ ربط پسند اور نہ احتراز پسند ۔۔۔ ابھی سمجھتے نہیں تم مزاجِ دنیا کو

کچھ اور اب اپنی زندگی ہے ۔۔۔ یہ دوستی ہے یہ دشمنی ہے
وحشت پہ فراق کی نہ جانا ۔۔۔ یہ بھی اندازِ بے حسی ہے

جبیں کا خوں کئے کس واسطے سمت مزار آئی ۔۔۔ کہاں سر پھوڑتی اے میری شامِ انتظار آئی

پچھلے پہر کو ساقیا قول ترا یہ دے کے جام ۔۔۔ گردشِ چرخ پھر کھائے دور ہی آخر ہو

ملیں عدم کی حدوں سے حدیں زمانہ کی ۔۔۔ کہاں پہونچ کے کڑی ٹوٹی اس فسانہ کی

لاکھوں ہوئے بے سر و ساماں مگر اے ذوقِ فنا ہم جو باقی ہیں تو کیا بے سر و ساماں ہونگے
یہ تو تمہید کرم ہے دل مجروح ابھی دیکھ کیا کیا نگہِ یار کے احساں ہونگے

اب وہ سودا بھی نہیں جوش تمنا بھی نہیں لیکن اس ترک تمنّا کا بھروسا بھی نہیں
مدّتیں گذریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
تجھ سے سنبھلیں تو سنبھال اپنی حجابِ بیباک میں اٹھا تا حد آداب تماشا بھی نہیں

وہ درد وہ چوکھٹ کیا چھوٹی اے ہمدم قسمت پھوٹ گئی چاہا تھا کہ دل کو سنبھالیں پر کچھ سوچ کے ہمّت چھوٹ گئی
آگے شائد پڑتا ہو عدم کچھ ٹھیک ہمیں معلوم نہیں یہ درد کی حد ہو فراق یہیں سے دل کی بستی چھوٹ گئی

یہ الگ بات ہے جیتے رہے جینے والے یوں تو اپنی سی بہت کی شب تنہائی نے

یوں تو دل بھی دکھا نہیں کرتا یوں تو تم بھی جفا شعار نہیں
میں گریباں لئے ہوئے روؤں اے جنوں تیرا اعتبار نہیں

اب فرق اضطراب و سکوں کیوں مٹا نہ دوں کب تک تری نگاہ کو رسوا کرے کوئی

دیکھنی تھی دیکھ لی اس چھیڑ کی بھی سادگی بے دلوں کو یہ تبسّم ہائے پنہاں کچھ نہیں
کاش اپنے درد سے بیتاب ہوتے اے فراق دوسرے کے ہاتھوں یہ حال پریشاں کچھ نہیں

اہل نظر نہ اہلِ دل دیکھنے والے اب کہاں جلوہ بے قرار کی تابش بار بار کے

فراق ان کو تو دیکھو ہوش میں لائی جنہیں قسمت اور اک تم ہو کہ سر ہے اور در و دیوار زنداں ہے

تیرے وعدے ہزار جھوٹ سہی کیا کریں گر نہ اعتبار کریں

جوششِ تجدیدِ شوق سچ بتلا ۔۔۔ دل کو پھر ہم اُمیدوار کریں

بزمِ انجم دیکھئے صبحِ گلستاں دیکھئے ۔۔۔ اس طرح کب تک فریبِ وصل و ہجراں دیکھئے
حُسنِ آزردہ میں ہیں بیتاب کتنی شوخیاں ۔۔۔ چشمِ پُرنم کے تبسم ہائے پنہاں دیکھئے

اے طلسمِ رنگ و بو! ہاں اے فریبِ آرزو ۔۔۔ ایک دن ہم بھی سمجھتے تھے بہت کچھ دل میں ہو

ہم فریبِ حُسن کو فرقت میں سمجھے اے فراق ۔۔۔ یاد آتے ہیں کسی کے عہد و پیماں بار بار

سرِ شوریدہ دیا دشت بیاباں بھی دے ۔۔۔ یہ میری خوبیِ قسمت کہ وہ زنداں ہو جائے

جذباتِ جگر

(از حضرت جگر بریلوی۔ بی۔ اے)

دماغ و دل پہ جسے کوئی اختیار نہ ہو ۔۔۔ حضور اُس کا گنہگاروں میں شمار نہ ہو
مذاقِ جامہ دری کیا اگر بہار نہ ہو ۔۔۔ جنوں عبث ہے جو ایمائے حُسنِ یار نہ ہو
شریکِ جورِ فلک گر جفائے یار نہ ہو ۔۔۔ تباہیِ دل و دیں ہمکو ناگوار نہ ہو
محیطِ دہر جمالِ نگار و دل ویراں ۔۔۔ بہار میں کوئی آزردۂ بہار نہ ہو
وہ جبر ہے جسے سب اختیار کہتے ہیں ۔۔۔ گناہگار نہ ہوں ہم گر اختیار نہ ہو
چراغِ غمکدۂ زندگی سہی اُمید ۔۔۔ وہ کیا کرے جسے اُمید سازگار نہ ہو
گدا سمجھ کے جہاں اُس نے مجھ کو بخش دیا ۔۔۔ وہیں میں چپ ہوں کہ انکار ناگوار نہ ہو
بہت بلند ہے رتبہ ترا دلِ آگاہ ۔۔۔ کشاکشِ غم و شادی سے بیقرار نہ ہو
خزاں گر آئے نہ ہو شکوہ سنجِ جورِ خزاں ۔۔۔ بہار آئے تو منت کشِ بہار نہ ہو
نظر نہ آئے حقیقت تو کور و کر بن جا ۔۔۔ فریب خوردۂ نیرنگِ اعتبار نہ ہو
کسی کی مدح و ثنا ہو نہ باعثِ پندار ۔۔۔ کوئی بُرا کہے ہر چند ناگوار نہ ہو
ہمیں کو آتشِ دوزخ میں ڈال دے یارب ۔۔۔ ستمگروں پہ اگر تجھ کو اختیار نہ ہو
زمیں پہ ٹیک تو دوں میں جگر جبینِ نیاز ۔۔۔ نشانِ سجدہ غمِ دل کو ناگوار نہ ہو

معلّم

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی۔ بی۔ اے)

تخلیق سے فارغ ہوا جب خالق باری اور جوئے کرم خلد میں یکسر ہوئی جاری
بلوائے گئے سامنے سب نوری و ناری بخشیں یدِ قدرت نے انھیں نعمتیں ساری
اُٹھوائے گئے لعل و گہر بندۂ نمد سے
سینہ ترا معمور کیا علم و ہنر سے

مال و متاعِ دہر جو پایا تھا کسی نے تن پروری میں اپنی اڑایا تھا کسی نے
یا شوق سے دامن میں چھپایا تھا کسی نے غیروں پہ تو ہرگز نہ لٹایا تھا کسی نے
ہمت سے اپنی تو نے عجب کام کر دیا
منہ موتیوں سے اہلِ ضرورت کا بھر دیا

ہے فیضیاب دم سے ترے ساری خدائی انساں وہ نہیں جس کو نہو پیسہ پرائی
حصہ میں ازل سے ہے ترے عقدہ کشائی کھاتے ہیں فرشتے بھی غم ناصیہ سائی
کم ظرف کبھی صاحب ہمّت نہیں ہوتا
انساں کوئی دولت کی بدولت نہیں ہوتا

تو کاشفِ اسرار ہے استادِ جہاں ہے گر علم کا چشمہ ہے تو حکمت کا نشاں ہے
ہر لب پہ سخن بنکے رواں تیری زباں ہے قربان تکلّم پہ ترے حُسنِ بیاں ہے
ہر بات میں اک بات ہے کیا بات ہے تیری
سچ بات ہے متبوعِ جہاں ذات ہے تیری

صد غیرتِ گلزار ہے ہستی ترے دم سے احساں جو کئے تو نے وہ پوچھے کوئی ہم سے
جنبش جو ہوئی پھول جھڑے نوکِ قلم سے حوریں لئے حاضر ہوئیں گل باغِ ارم سے
دستِ کرم نے تیرے گُہر رول لئے ہیں
قربانیوں نے دونوں جہاں مُول لئے ہیں

دنیا میں نورِ علم کا دریا بہا دیا تاریکی جہل کا نشاں تک مٹا دیا
آنکھوں سے کذب و کفر کا پردہ اُٹھا دیا پتلے تھے خاک کے جنھیں انساں بنا دیا
رتبہ زمیں کا چرخ سے دو بالا کر دیا ہر ذرّہ کہہ رہا ہے انا العرش برملا

معراج تخیل

(از شیخ سعید الدین احمد محکمہ کوآپریشن پنجاب)

ملک یونان کے دارالخلافہ ایتھنز میں ہر طرف آہ و بُکا اور گریہ و زاری کی دلسوز اور جگر خراش آوازیں سُنائی دے رہی ہیں۔ حسین و جمیل دوشیزگان مصروف نالہ ہیں۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں اور مرد سسکیاں لے رہے ہیں۔ اور بوڑھے وفور گریہ سے نیم جان ہو رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے بلک رہے ہیں اور ان معصوموں کو کوئی چپ کرانے والا نہیں۔ غرض چھوٹا بڑا ہر کس ناکس مصروف فغاں نظر آتا ہے۔ کلیسا کی گھنٹیوں سے ماتمی صدائیں سُنائی دے رہی ہیں اور تمام شہر پر کچھ اس قسم کی مردنی اور افسردگی چھائی ہوئی ہے جو بیان سے باہر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید صور محشر پھونک دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر ایک ذی روح بے چین اور بے کل نظر آتا ہے۔ جسے دیکھو وہی رو رہا ہے۔ معبدوں میں راہب روتے دکھائی دیتے ہیں۔ فوجی بارکوں میں سپاہی مصروف نالہ و شیون ہیں۔ شاہی محلات سے آہ و فغاں نالہ و بکا اور چیخنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرے رہنما فرشتے نے مجھے کہا "تمہیں معلوم نہیں کہ یہ لوگ کیوں رو رہے ہیں" فرشتے کی اس آواز سے میں چونک پڑا اور اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسی اثنار میں رہبر فرشتہ نے مجھے قصر شاہی کے غرفہ پر لا کھڑا کیا اور کہا "تم ان کے رونے کا سبب سُننا چاہتے ہو" میں نے کہا کہ میں جس وقت سے اس شہر میں آیا ہوں اسی بات پر غور کر رہا ہوں۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا معلوم نہیں کیا معاملہ ہے؟ براہ کرم آپ ہی مجھے آگاہ کیجئے۔ فرشتہ نے کہا "کہانی بہت لمبی ہے مگر میں اختصار کے ساتھ تمہیں سُناتا ہوں"۔

یہ شہر یونان کا دارالسلطنت ہے اور ایتھنز اس کا نام ہے۔ یہاں سے جنوب مغرب کی طرف ایک جزیرہ ہے جسے کریٹ کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہاں کا بادشاہ ایک نہایت ظالم اور سفاک انسان ہے۔ اس کی مملکت میں بہت سے آدم خور درندے ہیں جنکی خوراک انسانی گوشت

ہے۔ کریٹ کا بادشاہ انہیں خوش رکھنے کے لئے ہمیشہ انسانی گوشت ان کی نذر کرتا ہے اور اس کیلئے وہ اپنے باج گذار ممالک سے، نوجوان مرد اور عورتیں منگواتا ہے۔ تین سال ہوئے اس نے ایتھنز پر حملہ کیا تھا جس کی وجہ سے باشندگان شہر کو بہت تکلیف اُٹھانی پڑی تھی۔ طویل محاصرہ کے بعد اس شرط پر صلح ہوئی تھی کہ ایتھنز سے ہر سال آٹھ جوان "منوٹار" نامی بلا کے لئے جایا کریں۔ تاکہ وہ انہیں کھا کر اہل کریٹ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہ ایک نہایت کڑی اور سخت شرط تھی مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ آخر کار ایتھنز والوں کو اس کو قبول ہی کرنا پڑا۔ اب وہ ہمیشہ آٹھ جوان "منوٹار" کی شکم سیری کے لئے ہر سال کریٹ روانہ کرتے ہیں۔ آج کریٹ کو جوان روانہ کئے جائیں گے اور طلوع آفتاب سے پہلے پہلے قرعہ اندازی ہوگی جن نوجوانوں کا نام نکلے گا انہیں کریٹ جانا ہوگا۔ اس لئے تمام شہر ماتم کدہ بنا ہوا ہے اور لوگ مصروف گریہ ہیں۔

فرشتہ اتنا کہکر چپ ہوگیا مگر اس کے بیان سے میری روح کی عمیق ترین گہرائیوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ میں نے اس سے کہا کہ کریٹ کا بادشاہ ان موذی بلاؤں کا خاتمہ کیوں نہیں کردیتا تاکہ ہر سال اتنی جانوں کا نقصان نہ ہو۔ اور مخلوق خدا اس ہلاکت سے نجات پائے فرشتہ مسکرایا اور بولا "میاں تم انسان ہو تمہیں کیا خبر کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ انسان کس طرح انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

ہم آسمان پر پرواز کر رہے تھے صبح کا ستارہ نمودار ہو چکا تھا۔ سمندر کا پانی مصروف رقص تھا بھنور کی آنکھ ان موجوں کے لئے رو رہی تھی جو پیدا ہو کر ساحل سمندر سے نہ ٹکرا سکیں۔ صحراؤں بیابانوں۔ پہاڑوں۔ وادیوں مرغزاروں کوہساروں پر پرواز کرتے ہوئے سمندروں دریاؤں چشموں آبشاروں ندیوں اور نالوں سے اُڑتے ہوئے سبزہ زاروں اور کھیتوں سے اوپر اوپر لہلہاتے ہوئے سرسبز اور شاداب فصلوں سے گذرتے ہوئے ہم ایک نہایت خوبصورت شہر میں داخل ہوئے۔ ابھی میرا رہبر فرشتہ مجھے زمین کی طرف لا ہی رہا تھا کہ شیروں کے گرجنے اور چیتوں کے دھاڑنے کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ میں نے فرشتہ سے پوچھا ہم کہاں آگئے ہیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہم کسی شہر میں اُترنے والے ہیں مگر شیروں کی آواز سے شہر گونج رہا ہے یہ شہر ہے یا شیروں کی کچھار۔

فرشتہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ کہنے لگا "یہی تو روماۃ الکبریٰ ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں انسان شیروں سے پھڑوائے جاتے ہیں۔ یہ وہ شہر ہے جہاں انسانی لہو سے ہولی کھیلی

جاتی ہے۔ یہی عہد حاضر کی تہذیب کا گہوارہ ہے۔ یہی دنیا کا مہذب ترین شہر ہے اسی کے باشندوں کی تمام دنیا پر حکومت ہے۔ مصر وشام پر انہی کا پرچم لہلہاتا ہے۔ الجیریا اور ٹیونس پر یہی حکمرانی کرتے ہیں۔

فرشتہ مجھ سے باتیں کرتا جاتا تھا اور ہم شہر کی طرف آرہے تھے۔ اتنے میں ایک بہت وسیع اور کشادہ میدان دکھائی دیا۔ چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں تھیں۔ فضائے آسمانی میں طیور نغمہ سنجیاں کر رہے تھے۔ درختوں پر طائران خوش الحان مصروف نغمہ تھے۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ اور وفور مسرت سے خوشی کے گیت گاتے جاتے تھے۔ ملکۂ صبح نے اپنے حسن کی ضو پاشی سے دنیا کو بقعۂ نور بنا دیا تھا۔ ناگہاں اس میدان میں میری نظر شیروں کے پنجروں پر پڑی۔ میں نے فرشتہ سے پوچھا "کیا یہ چڑیا گھر ہے" فرشتہ حسب معمول مسکرایا۔ اور کہنے لگا۔

"نہیں یہ کلوزیم ہے" اڑتے اڑتے ہم کلوزیم کے برآمدہ پر جا بیٹھے۔ کلوزیم انسانوں سے پر تھا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید یہ کوئی جلسہ گاہ ہے۔ لیکن وہاں مجھے ایک اکھاڑہ نظر آیا۔ میں سمجھا کہ شاید یہاں کشتی ہوگی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جوان کو چند رومی کشاں کشاں لا رہے ہیں۔ وہ جس وقت اکھاڑہ میں داخل ہوا ایک آواز پیدا ہوئی وہ رومیوں کا قومی نعرہ تھا۔ اکھاڑہ کے پاس ہی شیر کا پنجرہ کھڑا تھا۔ شیر اس آدمی کو دیکھکر غرایا اور ایسا گرجا کہ میرا دل دہل گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ شیر کے پنجرہ کا دروازہ کھول کر اس نوجوان کو اندر داخل کر دیا گیا شیر نے اس پر جست لگائی اور اسے دبوچنے ہی لگا تھا کہ نوجوان نے نیچے سے ایک کٹار شیر کے سینہ میں گھونپ دی۔ بس پھر کیا تھا شیر نے تمام کلوزیم سر پر اٹھا لیا اور پے در پے جوان پر حملے شروع کر دیے۔ مگر اس نے ایک ایسا وار کیا کہ شیر پھر نہ اٹھ سکا۔ تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوئے۔ اور نوجوان پر پھول برسائے گئے۔

اس کے بعد ایک اور آدمی اکھاڑہ میں لایا گیا۔ اور دوسری طرف سے ایک بھینسا اس پر چھوڑ دیا گیا۔ بھینسے نے آدمی کو سینگوں پر اٹھا کر ایک ایسی پٹخنی دی کہ وہ چاروں شانوں چت زمین پر آگرا پھر بھینسے نے اسے اپنے پاؤں سے مسل دیا۔ جوان کو اٹھنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ ایک دفعہ اس نے اٹھنے کی ناکام کوشش کی کہ جھٹ بھینسے نے اپنے سینگ اس کے پیٹ میں گھونپ دیے اور وہ آہ کہہ کر ڈھیر ہو گیا۔

مجھ سے یہ نقشہ نہ دیکھا گیا اور میں نے فرشتہ سے درخواست کی کہ وہ مجھے وہاں سے لے چلے

فرشتہ نے آسمان کی طرف پرواز کی اور کہنے لگا۔ "دیکھا دنیا میں انسان نوع انسان کا کس طرح شکار کرتا ہے۔ تم نے صرف دو ملکوں کا نظارہ دیکھا ہے۔ اور یہ ملک دنیا میں تہذیب و ترقی کے علمبردار ہیں۔ پہلا ملک یونان ہے۔ اسی میں سقراط۔ بقراط۔ افلاطون۔ جالینوس اور سکندر پیدا ہوئے تھے۔ دوسرا ملک روملتہ الکبریٰ ہے۔ اور یہ وہی روم ہے جس نے تمام یورپ کو ننگی کا ناچ نچایا ہے۔ یہ وہی روم ہے جس نے یونان کی تہذیب کو تہ تیغ کر دیا ہے۔ اسی نے ایشیا میں اپنی سطوت کا جھنڈا نصب کیا ہے۔ لیکن اب میں تمہیں ایسا روح فرسا نظارہ دکھاؤں گا جس سے خود میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پہلے آسمان کا دروازہ نظر آیا۔ فرشتہ نے دروازہ کھٹکھٹایا آواز آئی کون ہے۔ فرشتہ نے کہا" میں میکل" "اور تمہارے ساتھ کون ہے" فرشتہ نے کہا یہ ایک آدم زاد ہے جس کے دل میں ملک کی اصلاح کا جذبہ ہے اسے میں سیر کرا رہا ہوں" آواز آئی "حکم دکھاؤ"۔ فرشتہ نے جھٹ دربان کو تمغہ دکھلایا پہلے فرشتہ نے وہ کھڑکی بند کر دی جس سے وہ جھانک کر ہمارے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور دروازہ کھول دیا۔

میں آسمان پر تھا۔ باد بہاری مصروف خرام تھی۔ فرشتے تسبیح و تقدیس میں محو تھے غرض اس ملکوتی عالم کا حال بیان ہی نہیں ہو سکتا۔ آسمان کی فضا میں یہ نغمہ گونج رہا تھا۔ اور فرشتے اس سے متاثر ہو کر خدا کی حمد بیان کر رہے تھے۔

فرمان خدا

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقین سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اس نغمہ کو سن کر میرے دل میں ایک خاص ولولہ اور شوق پیدا ہوا۔ میں اپنے ذوق و شوق کے عالم میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر اپنے غریب ملک کی حالت پر غور کرنے لگا۔ میں اپنے خیالات میں منہمک تھا۔ اپنے ملک کی تمدنی معاشرتی علمی زرعی اور اقتصادی تکالیف کا رہ رہ کر مجھے خیال آ رہا تھا اور خدا کا فرمان فضائے بسیط میں صاف سنائی دے رہا تھا کہ جس کھیت سے دہقان کو روزی میسر نہ آئے اس کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا جائے۔ جہاں سے کسان کو پیٹ پالنے کے لئے دانہ نہ ملے اس کھیت کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ اگر یہی ہونا ہے

تو پھر ہمارے ملک کا کیا حشر ہوگا۔ وہ ملک جہاں لوگ رات کو بھوکے سو جاتے ہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے قابل ہے۔ وہ قوم جس میں فضول خرچی حد سے بڑھ گئی ہو صفحۂ دہر سے حرف غلط کی طرح محو کر دینے کے قابل ہے۔ وہ ملک جہاں افلاس و غربت کی وجہ سے زندگی عذاب بن گئی ہو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے قابل ہے۔

وہ لوگ جو مدت مدید سے خواب غفلت میں مبتلا ہوں ہلاک ہونے کے لائق ہیں۔ ہائے اگر فرمان خدا کی تعمیل ہونے والی ہے تو میرے پیارے ہندوستان کی کیا حالت ہوگی۔ وہ یقیناً سب سے پہلے تباہ کیا جائے گا۔ قعر مذلت کے گہرے گڑھے سے اُسے نکالنے کے بجائے نکبت و افلاس کی تیرہ و تاریک غار میں اسے پورے زور سے ڈھکیل دیا جائے گا۔ یہ خیالات میرے لئے سوہان روح ہو رہے تھے۔ میرے ذہنی تاثرات میں زلزلہ سا آ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے میں انتہائی اضطراب محسوس کر رہا تھا۔

.... ناگہاں رونے اور چلانے کی آواز سنائی دی "ہائے ابا! میری اماں" میں چونک اُٹھا آسمان اور اس پر رونا۔ رہبر فرشتہ بولا "جانتے ہو یہ کون ہیں۔ یہ ہندوستانی بچے ہیں۔ ہر روز یہاں ایک بچہ لایا جاتا ہے۔ یہ ہمیشہ روتے ہی رہتے ہیں۔ یہ ہیں ہندوستانی بچے" میں حیران ہوا کہ یہ تو میرے ہی ملک کے سپوت ہیں۔ میں نے فرشتہ سے پوچھا "یہ رو کیوں رہے ہیں" فرشتہ بولا "بڑوں کی جان کو روتے ہیں۔ روئیں نہ تو اور کیا کریں۔ انکی ماؤں نے ہمیں عجب مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ان کا رونا سنکر ہمیں خود ہی رونا آتا ہے یہ وہ بچے ہیں جنہیں ہر سال ہندوستان میں قتل کیا جاتا ہے"

میں نے کہا "ہمارے ہاں تو کوئی قتل نہیں ہوتا۔ قتل تو ہم نے کریٹ اور روم میں دیکھے ہیں۔ ہمارے ملک میں تو تم نے آجتک کوئی ایسا نظارہ نہ دیکھا ہوگا" فرشتہ مسکرایا اور کہنے لگا۔

"یہ قتل کریٹ اور روم کے واقعات سے زیادہ اہم ہیں" میں حیران تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ اتنے میں ایک چھوٹا سا لڑکا میرے پاس سے گذرا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہو۔ میں نے ذرا تامل کیا تو یاد آیا کہ یہ ہمارے ہی شہر کا لڑکا ہے اس کے والدین نے اسے ایک مرتبہ کوئی زیور پہنایا تھا۔ بس پھر لڑکے کا پتہ نہیں کہ کہاں گیا سُنا تھا کہ لڑکے کو کوئی بدمعاش زیور کے لالچ میں اُٹھا کر لے گیا تھا۔

فرشتہ کہنے لگا " میاں کیا سوچ رہے ہو۔ یہ تمہارا ہی محلہ دار ہے اور کروڑی مل کا لڑکا سادھو رام ہے۔ اب بتاؤ لالہ کروڑی مل زیادہ موذی ہوئے کہ "مُنوٹار"۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر روز ایک معصوم بچہ محض اسلئے قتل کیا جاتا ہے کہ اس کے والدین اسے زیور پہناتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ ایھنز والے صرف آٹھ نوجوانوں کیلئے کس طرح رو رہے تھے مگر جس ملک کے تین سو پچاس یا ساٹھ بچے ضائع ہو رہے ہیں اسے اس بات کا علم ہی نہیں اس کے باشندوں میں اسقدر احساس ہی نہیں۔ انہیں خبر ہی نہیں کہ بچوں کو زیور پہنانا ان کی ہلاکت کا باعث ہے۔ بچوں کے قتل کے ذمہ دار خود ان کے والدین ہیں۔ اب بتاؤ 'روم کا کُلوزیم' زیادہ خطرناک ہے کہ ہندوستان کے جاہل والدین "

میں عجب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ دل ہی دل میں پشیمان ہو رہا تھا۔ اپنے ملک کی تذلیل دیکھکر میرا دل بھر آیا۔ میں نے بہت ضبط کیا۔ مگر اشکوں کا سیلاب نہ تھم سکا۔ بس رویا اور خوب رویا آنسو آنکھوں سے نکلکر میرے رخساروں کو تر کر رہے تھے۔ وفور گریہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرا تکیہ آنسوؤں سے تر ہو رہا ہے۔ یہ وہ آنسو تھے جو میں نے اپنے ملک کی اس قبیح رسم پر بہائے۔ لیکن اس واقعہ کے احساسات ہمیشہ میرے لئے روحانی عذاب کا سبب رہیں گے۔

میں ہر وقت اسی سوچ بچار میں رہتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح میری دلی کیفیات سے وہ ہیجان دور ہو جو اس واقعہ سے پیدا ہو گیا ہے لیکن ملک کی موجودہ پستی دیکھ دیکھکر دل میں ہوک اٹھتی ہے اور درد میں اضافہ ہوتا ہے۔ بہت غور وخوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر ہمارے ملکی بھائی تمام مذہبی اور قومی اختلافات کو بالائے طاق رکھکر اس امر کی کوشش کریں کہ جس طرح ہو سکے ہمارے ملک میں علم کو فروغ حاصل ہو تو بگڑی بن سکتی ہے۔ ہمیں تمام اختلافی مسائل کو اسوقت چھوڑ کر اس بات کی تن من اور دھن سے کوشش کرنا چاہئے کہ جس طرح ہو سکے اپنے ملک کی عزت اور وقار کی کشتی کو سمندر کی متلاطم موجوں سے نکال کر ساحل مراد پر پہونچایا جائے۔ موجودہ صورت حال میں ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ اپنے پیارے ملک کی گذشتہ شہرت کو برقرار رکھنے کیلئے اس بات کی مکمل طور پر کوشش کریں کہ یہاں کا ہر ایک باشندہ سونے چاندی کے زیورات کی بجائے زیور تعلیم سے آراستہ ہو۔ علم کے زیور سے مزین ہو کر ہم دنیا کی مہذب ترین محفلوں میں بلا روک ٹوک داخل ہو سکتے ہیں۔ اور اگر ہماری یہی

حالت رہی تو وہ وقت دور نہیں جب ہم اپنی موجودہ عزت بھی کھو بیٹھیں گے۔

رہنمایانِ ملک اور لیڈران قوم کی خدمت میں میری یہ مؤدبانہ گذارش ہے کہ اسوقت وہ صرف اس بات پر زور دیں کہ ہمارے ملک میں تعلیم کا چرچا اور رواج عام ہو۔ جبوقت ملک تعلیم یافتہ ہوگا۔ تو باشندگان میں خود بخود وسیع القلبی پیدا ہو جائے گی اور تمام اختلافات کافور ہو جائیں گے۔

گائے

(از پنڈت امرناتھ زتشی صاحب)

خدا کے نام سے کرتا ہوں ابتدائے سخن
اسی سے دار فنا میں ہوئی بنائے سخن

یہ ناخدائے سخن ہے یہی خدائے سخن
یہ ابتدائے سخن ہے یہ انتہائے سخن

بیان ہو گائے کی تعریف مدعا یہ ہے
سخنوروں کو شکایت نہ ہو مزا یہ ہے

خدا نے خوب عطا کی ہے لوح پیشانی
بہار دید ہے اُس کی جبیں نورانی

بیاں میں آئے کہاں دلفریب عنوانی
بجا ہے کہئے اگر اس کو زُہرہ ثانی

ہلال عید سے خوشتر ہیں کنگرے سر پر
رواں ہے دودھ کی دھاروں میں چشمۂ کوثر

اسی کے فیض سے رہتے تھے یہاں کتنے
نصیب دودھ ہو جن کو رہے یہاں کتنے

اسی کی ہند میں پہلے دہائی پھرتی تھی
جدھر یہ پھرتی تھی ساری خدائی پھرتی تھی

جفائیں سہتی ہے اہل وفا سے مستغنی
جو درد اس کو ہے وہ ہے دوا سے مستغنی

بشر کو رکھتی ہے گویا غذا سے مستغنی
خدا کے واسطے ہے ماسوا سے مستغنی

کہاں تک اسکی ہو توصیف مختصر یہ ہے
کہ ہندیوں کے لئے سورۂ بقر یہ ہے

آرزو

از گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری۔ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔

رنگینیٔ فلک سے عیاں ہے پیامِ شوق
گویا شفق ہے جلوۂ عنوانِ آرزو

پھر دامنِ فلک سبدِ گل فروش ہے
پھر بڑھ رہی ہے وسعتِ دامانِ آرزو

پھر آ رہے ہیں جھونکے ہوائے بہار کے
پھر جوشِ عشق دل میں ہے مہمانِ آرزو

پھر کالی بدلیاں نظر آتی ہیں چرخ پر
پھر اڑ رہی ہے زلفِ پریشانِ آرزو

پھر ہو رہا ہے ابرِ بہاری گہر فشاں
پھر بچھ رہا ہے شوق سے دامانِ آرزو

پھر برقِ شعلہ ریز کو جنبش ہے چرخ پر
رقاص پھر ہے شعلۂ عریانِ آرزو

پھر ماہتاب بامِ فلک پر ہے جلوہ ریز
پھر ضو فشاں ہے شمعِ شبستانِ آرزو

پھر باصرہ نواز ستارے چمک اٹھے
پھر شعلہ زا ہے سوزشِ پنہانِ آرزو

پھر یاد آ گیا کوئی محفل فروزِ حسن
پھر بڑھ رہی ہے رونقِ ایوانِ آرزو

پھر بڑھ گئیں کسی کے تصور کی شوخیاں
پھر تازہ کشمکش میں پھنسی جانِ آرزو

رخصت ہوئی مناظرِ لطف آفریں کی سیر
اب میں ہوں اور کاوشِ پنہانِ آرزو

جمعیتِ نشاط کا ساماں کہاں نصیب
اک دل ہے اب سو وہ بھی پریشانِ آرزو

عام فہم زبان

(از مسٹر سلیم جعفر)

آٹھ بجے سیر سے لوٹ کر میں اپنے ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دوست تشریف فرما ہیں اور ان کے ساتھ ایک کرسی پر ایک اجنبی بھی۔ علیک سلیک کے بعد میرے پوچھنے پر میرے دوست نے جواب دیا۔

"آپ کا نام ششدھر شرما ہے۔ آپ مدھوکر کے ایڈیٹر ہیں۔"

میں۔ آپ سے نیاز حاصل کر کے بے اندازہ خوشی ہوئی۔ یہاں کس غرض سے تشریف لائے ہیں۔

دوست۔ پرچہ کی اشاعت کے سلسلہ میں۔

میں۔ تو کیا آپ کو امید ہے کہ میں خریدار بن جاؤنگا۔

دوست۔ کیوں نہیں۔ اُمید نہ ہوتی تو میں انہیں یہاں لاتا ہی کیوں۔

میں۔ آپ کو دھوکا ہوا۔ آپ جانتے ہیں کہ گھر بھر میں این مین ساڑھے تین آدمی ہیں اور میں چار پرچوں کا خریدار ہوں۔

دوست۔ تو پانچویں سواروں میں یہ بھی سہی۔

میں۔ بجا۔ لیکن سوال "نقدہ حرمتہ" کا ہے۔ میرے جیب میں آتے ہی ان کے پر لگ جاتے ہیں اور پھر ان کو بلانے میں جو مصیبتیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ انہیں کچھ میں ہی خوب جانتا ہوں۔

ششدھر۔ مہاشے۔ اس پتر کا بارشک مولیہ کیول چھ روپے ہے۔ پرتی دوس ایک پیسے سے نام ماتر ہی ادھک ہوا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ اس سے ادھک کی تو آپ بیڑیاں ہی پی جاتے ہوں گے۔

میں۔ میں بیڑیاں نہیں پیتا۔ لیکن اس قصہ کو جانے دیجئے۔ اتفاقیہ آپ سے نیاز حاصل ہو گیا اسلئے اگر ہرج نہ ہو تو مجھے یہ بتا دیجئے کہ ایڈیٹر کرتا کیا ہے۔"

ششدھر۔ اس کا کام ہے کہ اوروں نے جو لیکھ بھیجے ہیں ان میں سے پتر کیلئے چنے۔ سوئم بھی

کچھ لیکھ اور "ٹپنیاں" لکھے۔

میں۔ اوہو۔ تو ایڈیٹر بننا تو کھیل ہی نکلا پرچے کے لئے مصالح اور ہی بھیج دیتے ہیں جس کا مضمون چاہا چھاپ دیا اور جس کا چاہا ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ رہیں ٹپنیاں۔ یہ کیا بلا ہیں۔ اور کیونکر لکھی جاتی ہیں۔ اگر کچھ ہرج نہ ہو تو بتا دیجئے۔

گفتگو یہیں تک ہوئی تھی کہ ایک پڑوسی آ گئے اور ہنس کر کہنے لگے "ایڈیٹر صاحب آپ بھی کہاں آ پھنسے یہ تو خود صفحے کے صفحے کالے کیا کرتے ہیں۔ اور ایک رسالہ کی جان کو بلائے بے درماں ہیں"

ششدھر۔ (ہنستے ہوئے) تو مہاشے آپ مجھے بنا رہے ہیں۔

میں۔ آپ کا خیال غلط ہے۔ چونکہ میں نے کبھی کسی رسالہ کی ایڈیٹری نہیں کی۔ آپ سے یہ فن سیکھنا چاہتا ہوں۔

ششدھر۔ اب ان باتوں کو چھوڑیے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ہندی پڑھے ہیں اور اسمیں سندیہہ نہیں کہ یدی آپ چیشٹا کریں تو ہندی میں بھی لیکھ لکھ لینگے۔ کرپیا ایک آدھ لیکھ ہمیں بھی دیجئے۔

میں۔ مجھے اتنی ہندی نہیں آتی کہ مضمون لکھ سکوں۔ اردو میں کچھ لکھ بھی دیا تو وہ آپکے کس کام کا۔

ششدھر۔ یدی آپ ایسی بھاشا لکھیں گے جسے سروسا دھارن سمجھ لیں تو ہم آپ کا لیکھ اوشیہ چھاپیں گے۔ پرنتو بھاشا کلشٹ بھی ہوئی تو بھی کوئی چنتا نہیں۔ ہم نے انوواد ک رکھ چھوڑے ہیں وہ اس کی سرل ہندی بنا دینگے

میں نے مضمون دینے کا اقرار کر لیا اور ادھر اُدھر کی چند باتیں کر کے ایڈیٹر صاحب کو رخصت کیا۔ ان کے جانے کے بعد کرسی پر سے اٹھکر مونڈھے پر جا بیٹھا۔ کیونکہ انگلش چیر سے یہ انڈین چیر زیادہ آرام دہ ہے۔ اور سوچنے لگا کہ "سروسا دھارن" کسے کہتے ہیں "سرل بھاشا" کس بلا کا نام ہے۔ کیا ایڈیٹر صاحب کے منہ سے جو پھول جھڑ رہے تھے انہیں کا نام "سرل بھاشا" ہے یہ تو ہر شخص آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔ فضائے اردو میں بھی آجکل "عام فہم زبان" کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ آخر یہ بیماری کیا ہے۔

اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ ڈاکٹر بلیر کی تصنیف "بلاغت و ادب" کا خیال آیا فوراً اٹھا کر دیکھی لکھتے ہیں۔

"جس مصنف کی زبان میں سلاست و سادگی ہوتی ہے وہ اپنا مطلب اس طرح بیان کرتا ہے

کہ پڑھنے والا اس کی تحریر دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ میں لکھتا تو یونہیں لکھتا۔" ہورلین سادگی کی تعریف یوں کرتا ہے۔

"مشہور کہانیاں بے کر ایسے قصے لکھوں گا کہ جو دیکھے یہی سمجھے کہ وہ بھی ایسے ہی لکھ سکتا ہے لیکن لکھنے بیٹھے تو چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔"

"ایسے مصنف کے بیان میں صناعت کے آثار نہیں ہوتے معلوم ہوتا ہے فطرت خود بول رہی ہے۔ اس کی طرز سے مصنف اور اس کی دماغ سوزی نہیں جھلکتی بلکہ اس سے اسکی بشریت اور فطرت کا پتہ چلتا ہے"

مگر یہ ایک ذرا دقیانوسی مصنف کی رائے تھی اس لئے میں نے ہیزلٹ کی طرف رخ کیا جو اس کے بعد کا مصنف ہے۔ اگرچہ دونوں کے زمانے میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ وہ "عام طرز تحریر" سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"اس طرز میں بے معنی شکوہ سے مردود نہیں۔ بلکہ اس سے ہر طرح کا ابتذال بستی۔ بے ربطی بے محل تلمیحات بھی خارج ہیں۔ اس طرز کے یہ معنی نہیں کہ جو لفظ سب سے پہلے سوجھ گیا لے لیا اس کا مطلب ہے کہ اچھے سے اچھا لفظ جو استعمال عام میں ہو وہ لیا جائے۔ اس طرز کا مقصد یہ نہیں کہ جیسے جی چاہا ویسے ایک جگہ جمع کر دیئے بلکہ اس کا مطلب ہے زبان کے صحیح روزمرہ کا استعمال کرنا اصلی عام طرز اس طرح لکھنے کو کہتے ہیں کہ جس سے معلوم ہو کہ کوئی ایسا شخص باتیں کر رہا ہے جسے لفظوں اور ان کے انتخاب پر پوری قدرت حاصل ہے۔ جو بے تکلفی، قوت اور صفائی سے باتیں کرتا ہے اور جو عالمانہ اور خطیبانہ انداز سے دامن بچاتا ہے"۔

یہ دونوں مصنف کسی قدر دقیانوسی سہی لیکن اکثر دقیانوسیت عیب نہیں ہوا کرتی جبکہ وہ کسی مستقل حقیقت کی مظہر ہو۔ مثلاً ان دونوں مصنفوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ محض لفظوں کی الٹ پلٹ ہے۔ خیال میں کوئی واقعی فرق نہیں۔ بیر کہتا ہے کہ "ایسے مصنف کے بیان میں صناعت کے آثار نہیں ہوتے معلوم ہوتا ہے فطرت خود بول رہی ہے" اور ہیزلٹ اسی خیال کو یوں ادا کرتا ہے "اصلی عام طرز اس طرح لکھنے کو کہتے ہیں جس سے معلوم ہو کوئی ایسا شخص باتیں کر رہا ہے.... جو عالمانہ اور خطیبانہ انداز سے دامن بچاتا ہے۔ اس لئے بعد کے استادان فن کے اس بارہ میں جو خیالات رہے ہیں ان کا پتہ لگا کر انہیں زمانہ حال تک لانا فضول ہے۔ وہ بھی صرف لفظوں کو بدلتے رہے ہونگے۔ قصہ مختصر خیالات کو اس طرح کے لفظوں میں ظاہر کرنا جو عام طور سے بولے

جاتے ہوں اور جسمیں پیچ نہ ہو یہی معیار سادگی یا عام فہمی ہے
لیکن یہ معیار کوئی معیار نہیں۔ ایک شخص بالکل طبعی اور فطری طریق سے گفتگو کر سکتا ہے اسکے نقرے قواعد اور محاورہ کی رو سے بالکل صحیح ہو سکتے اور فصاحت و بلاغت کے معیار پر پورے اتر سکتے ہیں اور پھر بھی وہ فہم عام سے بلند تر ہو سکتے ہیں۔ کبھی یہ بات نفس مضمون پیدا کرتا ہے اور کبھی اس کی وجہ گفتگو کرنے والے کی علمیت ہوتی ہے۔

"فہم عام" بھی کچھ مبہم سی اصطلاح ہے۔ لفظ "عام" ایک وسیع المعنی لفظ ہے "فہم" کی پست ترین سطح جاہلوں سے شروع ہوتی ہے۔ چونکہ ان کے خیالات اور اُن کی واقفیت محدود ہوتی ہے اس لئے اپنا مطلب بیان کرنے کیلئے انہیں بہت سے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور ان کا کلام اکثر ان آرائشوں سے پاک ہوتا ہے جو علم معانی و بیان سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی گفتگو میں تشبیہ و استعارہ دونوں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی تشبیہیں مشاہدات روزمرہ کیلئے جو لفظ ہیں ان سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اور استعارے صرف وہی ہیں جو دو چار انہوں نے خود بنا لئے ہیں یا جو عالموں کے حلقہ سے نکل کر جاہلوں تک جا پہونچے ہیں۔ ایک قصہ ہے کہ کسی ملک کا راجہ لاولد مر گیا۔ ارکان دولت نے طے کیا کہ جو شخص سب سے پہلے صبح سویرے فلاں دروازے سے دار السلطنت میں داخل ہو وہ ہی گدی پر بٹھایا جاوے اتفاق کہ ایک چمار کسی گاؤں سے آرہا تھا سب سے پہلے اُس دروازہ سے دار السلطنت میں داخل ہوا حسب قرارداد اسے ہاتھی پر بٹھا کر لائے اور گدی پر بٹھا دیا۔ خوب خاطریں ہوئیں۔ پان کھلائے گئے پلنگ پر سونے لیٹا تو لونڈیاں باندیاں پاؤں دابنے آئیں اس آؤ بھگت سے یہ گھبرا کر نکل بھاگا اور اپنے گاؤں میں پہنچکر اپنی رہائی کی خوشی میں عورتوں کی ناچ گانا ہوا یہ چمار جو کچھ اسپر بادشاہی کے زمانہ میں بیتی ان لفظوں میں بیان کرتا ہے

چار پاؤں کو ٹھمبک ٹھمبا، جا کے پونچھ لگیّا
جا پے چڑھ کے امبر[۱] دیکھو، تو بھی نہ مردمری میّا
باجا باجے رے مرے بھیّا!

پیپل کے سے پتے منگائے، جاپے لاڑے[۲] دھیّا
سارے راتاں لوہو تھوکو، تو بھی نہ مردمری میّا!
باجا باجے رے مرے بھیّا!

چار پری ارس[۳] سے اتریں، جن پہ لال رجیّا
سارے راتاں ڈکن مارو، تو بھی نہ مردمری میّا!
باجا باجے رے مرے بھیّا!

بیچارے نے نہ کبھی ہاتھی دیکھا تھا۔ نہ پان کھائے تھے۔ نہ خوش لباس لونڈیاں باندیاں دیکھی تھیں۔ ان کی تصویریں کھینچ کھینچ کر دکھا رہا ہے۔ اس کا سامان جتنا ہے اس کے گاؤں

[۱] آسمان۔ [۲] دہی ڈالا۔ [۳] عرش

کی حد سے باہر کا نہیں ہے۔ ہاتھی کے پاؤں کو کھمبوں سے۔ پان کو پیپل کے پتوں سے۔ چونے کو دہی سے پیک تھوکنے کو لہو تھوکنے سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ اس ایرانی شاعر کے سے استعارے کہاں سے لاتا جو کہتا ہے۔ ؎

لولو از نرگس فرد بارید گل را آب داد　　　وز تگرگ روح پرور مالش عناب داد

یہ تو ایک مصیبت زدہ کی کہانی تھی اب ایک غیرت مند بی بی اپنے سڑ بلے میاں کی شکایت کر رہی ہے۔ وہ چمار شاید ممالک متحدہ کا رہنے والا تھا۔ یہ عورت دلی کی نکیٹی ریاست الور کی رہنے والی ہے

پیہر لو، کیسے جاؤں رانڈ کو موہ لجا تو ڈوبے　　　کونڈا ینچے دھر یو ملیدو چنا گٹکتو ڈوبے

پیہر لو کیسے جاؤں

بارہ برس میں پیہر چالی ٹھس ٹھس رو تو ڈوبے　　　کھونٹی پے تو دھرے دھوتی تنیا باندھیو ڈوبے

پیہر لو کیسے جاؤں

دیکھئے اس بیان میں کس بلا کی صفائی وسادگی ہے۔ جذبات کا کیسا سچا اور اچھا فوٹو ہے لیکن یہ بھی گاؤں کی حدود سے باہر نہ نکل سکا۔ ان دونوں کا فہم ایک ہی مرتبہ پر ہے۔ انکو پیش نظر رکھا جائے تو عام فہم وہ عبارت ہوگی جو اس قسم کے تمام لوگوں کے دائرہ فہم سے باہر نہ ہو۔

اس سطح سے بلند تر وہ لوگ ہیں جن کے دماغ ضیائے علم سے منور ہیں۔ ان کی گفتگو اور سخن فہمی پر خارجی اثر پڑے ہیں۔ ان کا لفظیات وسیع ہے ان کو اپنی گفتگو میں رنگینی پیدا کرنے کے طریقے سکھلائے گئے ہیں۔ لیکن اس طبقے کے بھی مدارج ہیں۔ جو "مقدار علم" پر مبنی ہیں۔ جو جتنا زیادہ پڑھا ہے وہ اتنا ہی زیادہ سمجھ سکتا ہے۔ مدارج میں مدارج پیدا کرنے والے مختلف علوم ہیں۔ چونکہ ہر علم کی طرز بیان الگ الگ ہے۔ اس کی اصطلاحیں الگ ہیں۔ اس لئے بے انتہا طبقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً منطق کو لیجئے۔ کیا اس علم میں قیاسات اور قضایا کے وہی معنی ہیں جو اس علم سے ناواقف کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جنہوں نے منطق پڑھی ہے وہ ان کے معنی جانتے ہیں۔ اگر ان پڑھ کے سامنے کسی منطقی مسئلہ پر بحث ہو رہی ہو اور قضیہ سالبہ وموجبہ کا ذکر آجائے تو وہ بے تکلف سمجھ جائیں گے حالانکہ جو اس علم سے ناواقف ہیں وہ کہیں گے کہ یہ عالمانہ گفتگو ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ یعنی جو گفتگو ایک طبقہ کے لئے عام فہم ہے وہ دوسرے کیلئے نہیں مدارج علم بے انتہا طبقے پیدا کرتے ہیں اور ہر طبقے کے ساتھ ساتھ اصطلاح "عام فہم" بھی بدل

جاتی ہے۔

لیکن اس اصطلاح کے ایک ایسے معنی بھی لئے جا سکتے ہیں جو اُن سب مدارج پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ جو تفاوت "مقدار علم" سے پیدا ہوتے ہیں وہ اس صورت سے کہ بلند سے بلند مرتبہ والا اس زبان میں بات چیت کرے جو پست سے پست درجہ والے فہم سے بالاتر نہ ہو۔ اس قسم کی گفتگو ممکن ہے مگر اسمیں دو دقتیں ہیں ایک تو یہ کہ علمی اصطلاحوں کی وجہ سے جو عام فہمی میں دقّت ہوتی ہے وہ ہرگز رفع نہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ حُسن کلام اور خوبی بیان میں بڑا فرق آجائیگا۔ کیونکہ تزئین کلام کے لئے جو تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں ان سے پست ترین درجہ کی گفتگو کا بیشتر حصہ معرّا ہوتا ہے۔ اور خوبی بیان سے معنی یابی میں جو دقّت پیدا ہو جاتی ہے پست ترین طبقہ یا تو اس کا عادی نہیں ہوتا یا اس کی سمجھ اسقدر اجلی نہیں ہوتی کہ وہ ان کو آسانی سے سمجھ سکے۔ اگر عبارت کو عام فہم بنانے کیلئے ان سب باتوں کو خیرباد کہہ دیا جائیگا جو حسن کلام کی تعریف میں آتی ہیں تو وہ محض روکھی پھیکی اور اکثر بے اثر نہ ہو جائے گی بلکہ بعض اوقات جو باتیں کہنے والا کہنا چاہتا ہے اگر کہے گا تو اتنے بھونڈے اور کریہہ پیرایہ میں کہے گا کہ اس سے سننے والے کو خواہ مخواہ نفرت ہوگی۔

تشبیہہ۔ استعارہ۔ جدت ادا وغیرہ ہی کائنات تزئین کلام ہیں اور بیشتر ایسے مطالب ان کے ذریعہ سے نہایت خوش اسلوبی سے ادا کئے جاتے ہیں جن کا سیدھے سادے لفظوں میں بیان کرنا شستہ مذاق پر گراں گزرتا ہے۔ مصنف گلزار نسیم[1] نے حق محاکات ادا کرنے کیلئے تین موقعوں پر وصال کا سماں کھینچا ہے اور انہیں تدبیروں سے کام لے کر ابتذال کو تہذیب کا جامہ پہنایا ہے۔

(۱) یہ کہہ کے ملے بہم وہ ایسے ــــــ صفحے خطِ تواماں کے جیسے

(۲) طومارِ حجاب کو کیا طے ــــــ ساغر پہ جھکا وہ شیشۂ مے

(۳) کاوش پہ ہوا گہر سے الماس ــــــ غنچہ نے بجھائی اوس سے پیاس

واں غنچۂ یاسمیں تھا گلنار ــــــ یاں دامن سرو ارغواں زار

واں صبح صفا تھی گل بداماں ــــــ پھولی رخ مہر پر شفق یاں

اس مصنف کو جب یہ دکھانا پڑا کہ ایک عورت کایا پلٹ ہو کر مرد ہو گئی اور ایک مرد عورت بن گیا تو یوں سخن سنج ہوتا ہے۔

بھالے میں یہاں اُگا صنوبر ــــــ واں شیشہ رہا ترش کے ساغر

مرد جب اپنی اصلی حالت پر آتا ہے تو اس کا بیان یوں کرتا ہے۔

---

[1] اس کا قلمی نسخہ میرے پاس ہے جس کی نقل بروز جمعہ ۲۰ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۴ مئی سنہ ۱۸۴۷ء ختم ہوئی تھی یعنی یہ نقل نسخہ کی تصنیف کے ۹ برس بعد کی لکھی ہوئی تھی۔

ترکش پہ نگاہ کی تو تھا تیر　　قبضہ میں پھر آئی کھوئی شمشیر

زین الملوک عرصے کے بعد اپنے بیٹے تاج الملوک سے ملتا ہے اور پوچھنا چاہتا ہے کہ اُس نے شادی کی یا نہیں لیکن فرق مراتب صاف صاف سوال کرنے سے مانع ہے۔ لالہ نہال چند لاہوری مصنف گل بکاؤلی اس کی زبان سے یہ لفظ ادا کراتے ہیں۔ "سرو آزاد ہوا کسی شمشاد قد سے پیوند کیا" اگر استعارہ سے مدد نہ لی جاتی تو تسنیم حق محاکات ادا نہ کر سکتے اور لالہ نہال چند زین الملوک کی دقت حل کرنے سے قاصر رہتے۔ دونوں کے کلام جدتِ ادا سے عاری اور خلاف تہذیب ہوتے۔

اگرچہ مراتب علم سے جو مدارج پیدا ہوتے ہیں وہ مٹائے نہیں مٹ سکتے اور علوم مختلفہ کے اسلوب بیان سے زبان کی عام فہمی میں جو دقتیں پیش آتی ہیں وہ ہرگز دور نہیں ہو سکتیں۔ لیکن یہ کوشش کی جا سکتی ہے کہ بے وجہ لغت بازی سے دامن بچایا جائے اور جدت ادا کو ایک مناسب حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ مثلاً اس فقرہ کا لطف "پھر جان دیدینا ہے تو ہمت و شجاعت کی آخری منزل نہیں"۔ میرے نزدیک فہم عام کی قربان گاہ پر یوں بھینٹ چڑھایا جا سکتا ہے "پھر ہمت اور بہادری یہی تو نہیں کہ جان دیدی جائے"۔ یا تشنہ روح کی پیاس سے بیتاب ہو کر شراب شوق کی حلاوتوں سے لذت آشنا ہونے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا" اسکا خون اس طرح کیا جا سکتا ہے" جوانی کی امنگوں سے بیچین ہو کر مزے لوٹنے کیلئے اپنا سب کچھ کھو بیٹھے مگر اس تجویز پر عمل کرنا بہت دشوار ہے۔ رہا میں۔ میرا یہ عیب ہی کہ صلاح دے سکتا ہوں مگر اس پر عمل نہیں کر سکتا۔

دورِ جدید

(از حضرت بسمل الہ آبادی)

اے شیخ و برہمن یہی ایک اسمیں پیچ ہے　　ایمان جب نہیں ہے تو مذہب بھی ہیچ ہے
کوئی ناخوش ہو کہ خوش یہ غم نہیں　　ممبری پیغمبری سے کم نہیں
مزا ملاپ کا دل سے جو دل ملے تو ملے　　بندھی کلی نہیں کھلتی کلی کھلے تو ملے
بڑھا کے رم گھٹائیں یہ غیر ممکن ہے　　کسی سے حضرت بسمل اگر ملے تو ملے

کرشن اوتار

از حضرت برق دہلوی مرحوم

مٹانے ظلمتِ ہستی کو جلوہ بار آیا — زمیں پہ حسنِ ازل ہو کے بیقرار آیا
جگانے ذرّوں کی تقدیر تابشِ رُخ سے — ضیا فروزِ جہاں مہرِ تابدار آیا
نظر کو نور۔ دلوں کو سرور دینے کو — سحابِ لطف و کرم برق در کنار آیا
سکھانے پریت کی ریت اور سنانے پریم کے گیت — لئے وہ بانس کی پوری میں لالہ زار آیا
طلسمِ ہستیٔ بے بود بے نقاب ہوا — امینِ راز برائے کشودِ کار آیا
مٹی جو ظلمتِ اوہام کھُل گئیں آنکھیں — کہ منکروں کو حقیقت کا اعتبار آیا

تجلّیٔ رُخِ روشن سے نور پھیل گیا
شرابِ نور سے کیف و سرور پھیل گیا

گوال بنکے بسر کی گوال بالوں میں — رہا بہارِ جناں بنکے نونہالوں میں
تجلّی پاش تھا جھرمٹ میں گوپیوں کے رہی — تھا ایک چاند کا جلوہ ہزار ہالوں میں
سرورِ عشق سے تھا ساقیِ ازل سرور — مئے طہور کا تھا دور حسن والوں میں
اُسی کے نور کے پرتو سے تھا فروغِ جمال — ضیائے مہر منوّر تھی مہ جمالوں میں
ہزار رنگ سے جلوہ نمائی کی اُس نے — بسا دلوں میں۔ سمایا کبھی خیالوں میں
اماں جہان کو دی کنس کے مظالم سے — حیاتِ نو ہوئی پیدا شکستہ حالوں میں

نچایا کوہ کو اُنگلی پہ کاہ کی صورت
مٹایا نقشِ شبِ تار ماہ کی صورت

نوائے نے سے حقیقت کی ترجمانی کی — کدم کی چھاؤں میں دادِ گلفشانی کی
فضائے دہر کو نغموں سے کردیا سرشار — نسیمِ لطف چلی کیف جاودانی کی
ہٹا کے مارِ سیاہ کالی دہ کو پاک کیا — بڑھائی آبرو آبِ گہر سے پانی کی

سحابِ فیض سے سیراب تشنہ کام ہوئے
رواں دواں ہوئی اک لہر شادمانی کی
ہر ایک ذرۂ بیجاں میں جان سی آئی
وہ روح پھونک دی احساس زندگانی کی
عمل کے پردے میں "نشکام" کا سبق دیکر
دکھائی منزلِ مقصود کامرانی کی
ہوا و حرص سے نفسانیت سے پاک کیا
بلند رتبہ آلودگانِ خاک کیا

کیا جہاں کو منوّر ضیائے عرفاں سے
فروغِ نور ہوا جلوۂ فراواں سے
بقدرِ ذوق دیا سب کو لطفِ جلوۂ دید
نظر نوازیِ تنویر روئے تاباں سے
انھیں بھی بارشِ انوار سے کیا شاداب
جلے تھے خرمنِ ہستی جو برقِ عصیاں سے
جہانِ تیرہ کو "گیتا" سے جلوہ زار کیا
مٹائی تیرگیِ جہل بزمِ امکاں سے
"وراٹ روپ" میں ارجن کو جب دیئے درشن
کیا حجابِ خودی دور چشمِ حیراں سے
بنایا محرمِ اسرار ناشناسوں کو
علیمِ راز کیا وصلِ جان و جاناں سے
نہفتہ رازِ حیات و ممات کھول دیئے
تمام عقدۂ بند و نجات کھول دیئے

غزل

از جناب افسر صدیقی امروہوی

نظر حدود کی خوگر جمال نامحدود
مرے نصیب میں ہے ماتم مذاقِ شہود
اِدھر گمانِ تصوّر کہ میں اکیلا ہوں
اُدھر یقینِ محبّت کہ آپ ہیں موجود
سوادِ شب میں نہاں ہو رہی ہے تابشِ مہر
عجیب شے ہے ترا جلوہ حجاب آلود
اسی لباس میں وحشی کو نذرِ خاک کرو
کفن کو کیا کبھی ہونا نہیں غبار آلود
تم آؤ گے بھی تو کیا چین آئیگا مجھکو
علاجِ دردِ نہاں صبر ہے سو نا موجود
اِدھر اُدھر سے نظر کو بچا کے دیکھ ذرا
حجابِ ناز سے باہر ہے چہرۂ مقصود
حیات و موت سے افشا ہوا یہ راز افسر
کہ اک زیاں ہے نہاں زیرِ پردۂ ہر سود

تنقید کتب

مادرِ ہند [1]

یہ کتاب خان بہادر سید علی محمد صاحب شاؔد عظیم آبادی کی ایک مثنوی ہے جو مرحوم نے آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ملکہ وکٹوریہ کے جشن جوبلی کے موقعہ پر تصنیف فرمائی تھی۔ اُسوقت اس کا نام "نوید ہند" رکھا گیا تھا۔ اس میں ملک کے ہندو مسلمانوں کو انگریزی حکومت سے تعاون کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اسوقت ان کا اس مثنوی کو طبع کرانیکا ارادہ نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۰۰ء میں بعض احباب کے اصرار پر حضرت شاؔد نے اس مثنوی پر نظر ثانی کر کے اس کا نام "مادر ہند" رکھا۔ جو اس لحاظ سے بہت مناسب ہے کہ اس میں ہندوستان کے دو بیٹوں رام و رحیم (ہندو مسلمان) کی باہمی ناچاقیوں کی وجہ سے جو خانہ ویرانی ہوئی ہے اس کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ اس طرح لائق مصنّف نے ایک نصیحت نامہ لکھکر بھارت ماتا کے ہندو مسلم فرزندوں کے لئے پیش کیا ہے یہ مثنوی حسن و عشق کی چاشنی سے معرّا ہے۔ اس پر بھی اسمیں سلاست زبان، مضامین کی بلندی اور فن شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ شروع سے آخر تک مثنوی پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کی خوبیوں کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی تعریف میں ارشاد فرماتے ہیں ؎

عظمت میں کنشت سے فزوں تر | خوبی میں بہشت سے فزوں تر
ہر گوشہ زمیں کا رشکِ گلشن | جس نخل کو دیکھئے وہ چندن

عیسیٰ نفسی جو تھی صبا میں | صحت تھی ملی ہوئی ہوا میں
ہر سنگ کو لعل پر شرف تھا | الماس بصورت خزف تھا

ہر ذرہ تھا آبرو میں گوہر | ہم سنگِ جواہرات پتھر
بازار عدن وہاں کے رستے | پانی کے عوض گہر برستے

مخمل کی طرح زمیں میں نرمی | سردی تھی سوا نہ تیز گرمی
خوشرنگ ہر اک شجر کے اثمار | کوزوں میں لئے نبات تیار

جس پھول کو سونگھئے وہ خوشبو | جس نخل کو دیکھئے وہ دلجو

یہ بھارت ورش کا حال تھا۔ اب بھارت ماتا یا مادر ہند کا حال سنئے۔ فرماتے ہیں:۔

دیکھے ہوئے سیکڑوں زمانے | دنیا کے پڑھے ہوئے فسانے | ذی جاہ و خجستہ کام تھی وہ | عالم میں بلند نام تھی وہ

---

[1] ملنے کا پتہ:۔ شاد بک ڈپو چوکھرہ۔ پٹنہ سٹی

مشہور تھا فیض عام اس کا ۔ تھا "مادرِ ہند" نام اس کا
آتے تھے جب اسکے گھر میں مہماں ۔ کرتی تھی وہ سب طرح کے احساں
آتا جو کوئی تو مال دیتی ۔ طالب کو بجیب حال دیتی
شاہوں سے زیادہ اس کا درجا ۔ جتنے راجہ تھے، اس کے پرجا

اور اس مادر ہند کے بیٹے کیسے تھے؟

ہر گوشۂ ملک سبز و شاداب ۔ راجہ تھا کوئی تو کوئی نواب
غفلت میں بھی سب کا تھا یہ عالم ۔ سوئے ہوئے شیر سے نہ تھے کم
دم بھر کو اگر وہ جاگ جاتے ۔ ضیغم بھی ڈپٹ سے بھاگ جاتے

لیکن جب مادر ہند کے دونوں فرزند رام و رحیم آپس میں لڑ کر خانہ ویرانی کا سامان بہم پہونچانے لگے تو ماں کا دل کڑھتا ہے۔ اور وہ کس محبت و شفقت سے اور کس سلیس زبان میں دونوں بیٹوں کو نصیحت کرتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

وہ چارہ گر شکستہ حالاں ۔ وہ بانوئے دلفگار و نالاں
سوچی کہ رہوں خموش اگر میں ۔ کھو بیٹھو نگی آپ اپنا گھر میں
دونوں بیٹوں کو تب بلایا ۔ شفقت سے ملی، گلے لگایا
الفت سے ہر ایک پر نظر کی ۔ کس جوش سے لیں بلائیں سر کی
پھر گرم سخن ہوئی وہ اس طرح ۔ تہ ہے مجھے نیند آئے کس طرح
قسمت کا پلٹ گیا ہے پاسا ۔ ایک ایک کے خون کا ہے پیاسا
اپنی ہے خبر تمھیں نہ گھر کی ۔ لٹتی ہے کمائی عمر بھر کی
کھک کر دیا دونوں نے خزانہ ۔ سب مٹ گیا میرا کارخانہ
آپس ہی میں لڑ کے زور کھوئے ۔ بیٹو کس طرح ماں نہ روئے
ماں صدقے دلوں میں کیا سمائی ۔ کی بھائی نے بھائی سے برائی
مجھ ماں کا تو کچھ کرو ٹھکانا ۔ پیری کا اب آگیا زمانہ
لیجائے گا کس کے گھر مقدر ۔ گذریگی آخر عمر کیوں کر
جس ماں نے پلا کے دودھ پالا ۔ آغوش میں جس کی پر نکالا
جس ماں نے کئے برے بھلے دن ۔ جو ماں کہ ہو اس طرح کی محسن
جس ماں نے کبھی نہ کچھ کیا چین ۔ بیچین رہی تمھیں دیا چین
راحت کسی طرح آئے تم کو ۔ سینے سے رہی لگائے تم کو
رکھا تمھیں ہر گھڑی نظر میں ۔ دی تم کو جگہ دل و جگر میں
اس ماں کا خیال تک نہ آیا ۔ بیٹو! مجھے دل سے یوں بھلایا"

غرض یہ مثنوی اس قسم کے انمول جواہر پاروں کا خزانہ ہے۔ البتہ کہیں کہیں بہاری زبان و محاورہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ مثلاً:-

دونوں ہی ہیں نیکیوں میں مشہور ۔ ہنہار ہیں دونوں چشم بد دور

دہلی اور لکھنو والے "ہونہار" بولتے ہیں اور مصنف صاحب پہلے مصرعہ کو یوں بھی لکھ سکتے تھے:-

ہیں دونوں ہی نیکیوں میں مشہور

کتاب کے شروع میں مولانا سیماب اکبرآبادی کا ایک طولانی دیباچہ بھی ہے جس میں مولانا موصوف نے "مثنوی" پر ایک تاریخی مضمون لکھکر اُردو و فارسی مثنویوں کی ایک طویل

فہرست بھی دی ہے جو یقیناً مفید ہوگی۔

اکثر کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں مگر اس کے لئے ایک غلطنامہ بھی دیدیا گیا ہے چھوٹی تقطیع کے ۱۷۰ صفحات پر کتاب ختم ہوئی ہے۔

اُردو اصطلاحات[1]

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے کالجوں اور اسکولوں کے طلباء کے فائدہ کی غرض سے انگریزی زبان کی خاص خاص اصطلاحات کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں ہے۔ کہ بعض اصطلاحات کا ترجمہ خاصہ کیا گیا ہے۔ ورنہ پچھتّر فیصدی انگریزی الفاظ کو اُردو حروف ہی میں لکھ دیا گیا ہے۔ بعض ترجمے غلط، بعض تشنۂ تکمیل اور بعض خالص پنجابی ہیں۔ ہم ذیل میں چند الفاظ بطور نمونہ درج کرتے ہیں:۔

لفظ	ترجمہ کتاب	ریمارک
Aesthetic Feelings	مذاقی تأثرات	
Apparatus	آلات	
Background	بیک گراؤنڈ	[بعض اصحاب اب اسکی جگہ پس منظر لکھتے ہیں]
Belt	بیلٹ	[اس کے لئے اُردو لفظ پٹی موجود ہے]
Corporal Punishment	بدنی سزا	[اسکی جگہ جسمانی سزا بہتر ہوگا]
Correspondent	کارسپانڈنٹ	[نامہ نگار کا لفظ عام طور پر رائج ہوگیا ہے]
Poultry	مرغی خانہ	
Puddling	گدّڑ کرنا (یہ غالباً خالص پنجابی اصطلاح ہے)	پشتہ باندھنا کہیں گے۔

بہر حال یہ کتاب خوبیوں سے خالی نہیں ہے۔ اور طلباء اس کے ذریعہ سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اصل انگریزی الفاظ اور ترجمہ میں اکثر جگہ املا کی غلطی ہوگئی ہے، جو اُمید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں رفع ہوجائے گی۔

اس کتاب کا حجم ڈھائی سو صفحات ہے۔

اجنٹا کی نقّاشی

اجنٹا کے غاروں میں قدیم ہندوستان کی نقاشی کے صدہا بیش بہا نمونے موجود ہیں۔ مگر

---

[1] ملنے کا پتہ:۔ رائےصاحب گلاب سنگھ پبلشرز لاہور۔ قیمت غالباً ایکروپیہ

فن مصوری کے یہ انمول جواہر پارے صدیوں تک عوام کی نظر سے پوشیدہ رہے، اور دستبرد زمانہ اور تغیرات موسم کی بدولت انہیں بہت کچھ نقصان پہونچتا رہا آخر انیسویں صدی کے آغاز میں حسن اتفاق سے انگریزی فوج کے چند سپاہیوں کو ان غاروں کا سراغ مل گیا جس کے بعد رفتہ رفتہ ان غاروں کا دنیا بھر میں شہرہ ہوگیا۔ چنانچہ دور دور سے ماہرین فن ان کی سیر کرنے آتے ہیں۔ اور قدیم ہندوستان کے فن نقاشی کا کمال دیکھ کر خود نقش حیرت بنجاتے ہیں۔

سرکار نظام کا تمام ملک پر احسان ہے کہ اُس نے قدیم ہندوستان کی اس نادر الوجود میراث کو محفوظ رکھنے کی ہر امکانی تدابیر اختیار کیں چنانچہ ہز اگزالٹڈ ہائی نس کی گورنمنٹ کیطرف سے ریاست حیدر آباد کی تاریخی یادگار کی حفاظت کے لئے عرصہ سے آثار قدیمہ کا محکمہ قایم ہے۔ جس کے ناظم ملک کے نامور ماہر آثار قدیمہ جناب غلام یزدانی صاحب ایم۔ اے۔ ایف۔ اے۔ ایس ہیں۔ اس محکمہ کی ان تھک کوششوں سے جملہ تصاویر بہت کچھ اپنی حالت پر اب تک قایم ہیں۔

یزدانی صاحب نے شروع ہی سے اجنٹا کے غاروں میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ ان تصویروں کی مذہبی روایات اور ان کی تاریخی اہمیت سمجھنے میں آپکو قابل قدر کامیابی ہوئی ہے۔ آپنے ان تصویروں کو مختلف مدوں میں تقسیم کرکے اور ان کے دلچسپ حالات دریافت کرکے فنون لطیفہ کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ اس کتاب میں جو اس وقت ہمارے سامنے ہے مسٹر ممدوح نے ایک مختصر مگر جامع تنقیدی مضمون کیساتھ ان غاروں کے بارہ میں چند تصاویر شائع کی ہیں۔ تصویریں غیر معمولی اہتمام کیساتھ جرمنی میں چھپوائی گئی ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جس قابلیت کیساتھ یہ رنگین پلیٹیں طبع ہوئی ہیں اس سے کتاب کی شان دوبالا ہوگئی ہے۔ یہ تصویریں زیادہ تر بدھ مذہب کی دیومالا سے تعلق رکھتی ہیں۔ جنھیں سمجھنے کے لئے بدھ دھرم کے اصول و ارکان جاننے کی ضرورت تھی۔ مگر یزدانی صاحب کو قدیم تاریخ کی تحقیق و تفتیش کا عشق ہے اور وہ علوم و فنون کے بھی ماہر کامل ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بدھ مذہب کی تاریخی معلومات پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ اس کتاب میں سلیس و عام فہم زبان اور عمدہ پیرائے میں مختلف تصویروں کے محاسن اور فن کی باریکیوں پر قابل قدر روشنی ڈالی گئی ہے۔

درحقیقت اس کتاب کو شائع کرکے اُردو پر احسان عظیم کیا گیا ہے۔ کیونکہ ابھی تک اُردو کے ادبی خزانہ میں اس قسم کی کتابیں معدوم ہیں۔ اس کتاب کی لکھائی چھپائی کاغذ سبھی قابل تعریف ہیں۔ ہماری رائے میں ہر ترقی خواہ اُردو اور قدردان فن کو یہ کتاب اپنے

کتب خانہ میں رکھنا چاہئیے۔ قیمت صرف تین روپیہ ہے۔

انقلابِ روس

روس کے سیاسی انقلاب پر ابتک سیکڑوں مضامین اور بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن زیادہ تر افراط تفریط سے کام لیا گیا ہے۔ البتہ کتاب مندرجہ عنوان میں جو انجمن خادمان ہند کے نامور رکن پنڈت کشن پرشاد صاحب کول نے ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی فرمایش سے تحریر فرمائی ہے، حتی الامکان اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ مبالغہ آمیز جانبداری سے پرہیز کر کے بالشویک انقلاب کی اصلی صورتِ حال اور اُس کے نتائج کا جو روس میں رونما ہوئے ہیں، صحیح صحیح نقشہ پیش کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ بالشویک انقلاب نے ملک روس میں نیا ایمان نئے عقائد نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دیا ہے۔ اس کے علمبرداران کا دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے جہنم زار روس کو جنت ارضی بنا دیا ہے اور اگر زمانہ نے اُنکا ساتھ دیا تو وہ دن دُور نہیں جب وہ تمام دنیا کو اپنے رسم و رواج اور عقائد کے ماتحت فردوس بریں کا نمونہ بنا دیں گے۔ دوسری طرف مخالفین کا دعویٰ ہے کہ بالشویکوں نے ملک کو تباہی و بربادی کے عمیق غار میں جھونک دیا ہے۔ اور باشندگان پر ایسے ناگفتہ بہ مظالم کئے ہیں جن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملسکتی۔ انقلاب روس کے صحیح حالات مرتب کرنے میں ایک دقت یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں اس کے لئے کافی مسالہ موجود نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو روس کے متعلق بہت سی کتابوں کا یہاں داخلہ ہی ممنوع ہے، اور جو کتابیں یہاں ملتی ہیں اُن میں اکثر رنگ آمیزی کیساتھ تصویر کا ایک ہی رُخ دکھایا گیا ہے۔ ایسی حالت میں صاف ظاہر ہے کہ فاضل مصنف کو اس غیر جانبدارانہ کتاب لکھنے میں کسقدر دقتوں کا سامنا ہوا ہوگا۔ مگر ہمکو اس کتاب کے ہر صفحہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کول صاحب ان تمام مشکلات پر بخوبی حاوی ہوگئے ہیں۔ آپ نے انقلاب روس کے تاریخی حالات لکھکر وہ تمام اثرات بھی مفصل بیان کئے ہیں جو انقلاب کی وجہ سے روس کے لٹریچر، فنونِ لطیفہ اور روزمرہ زندگی میں رونما ہوئے ہیں۔ کتاب کا تاریخی حصّہ کسیقدر طویل ضرور ہوگیا ہے۔ لیکن فاضل مصنف نے اس کتاب کے تمام ضروری معاملات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ہم کو اُمید ہے کہ اہل ملک اس مفید و دلچسپ تصنیف کی قدر کریں گے۔ کتاب ٹائپ میں عمدہ دبیز کاغذ پر چھپی ہے۔ ضخامت ڈھائی سو صفحات

کلام جوہر ؔ

یہ مختصر سی کتاب مولانا محمد علی مرحوم جوہر کے کلام مجموعہ ہے، جسے مولانا عبدالماجد صاحب بی۔اے دریابادی نے مرتب اور مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی نے مصنّف کے فوٹو کیساتھ عمدہ کاغذ طباعت وکتابت کیساتھ شائع کیا ہے۔ شروع میں ڈیڑھ جزو کا قابل قدر مقدمہ ہے جسکو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا پہلا حصّہ خود مولانا محمد علی کا لکھا ہوا ہے جس میں مرحوم نے اپنی شاعری کی ابتداء اور بعض دیگر امور پر روشنی ڈالی ہے۔ اسے مولانا کی خود "نوشت سوانح عمری" سمجھنا چاہیئے۔ دوسرے حصہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا کے حالات لکھے ہیں اور تیسرے میں ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

مولانا کی شاعری زیادہ تر سیاسی اور مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ مگر آپ کے اشعار ابھی تک احباب واغیار کے دلوں میں چٹکیاں لیتے ہیں انکا کلام تعریف وتوصیف سے مستغنی ہے۔ ایک شعر میں التجا کی تھی ؎

یوں بچ سکو مواخذۂ حشر سے تو ہاں ۔۔۔ مار و دیار غیر میں ہم کو وطن سے دور

یہ درخواست ایسی پوری ہوئی کہ دیار غیر میں مرنے کے بعد قبر بھی وہیں بنی۔

تسخیر یاس ؔ حصۂ اول

مولانا سید محمد شرف الدین یاس ٹونکی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اُردو اور فارسی کے پروفیسر اور پرانی وضع کے بزرگ ہیں۔ آپ کا کلام بھی پُرانی وضع کا ہے۔ کہیں حکیم مومن کی تخئیل ہے تو کہیں داغ دہلوی کی زبان ہے۔ کہیں کہیں غالب کے فلسفہ وحکمت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ مکتبہ ملیہ دہلی نے آپ کا کلام تبرکاً شائع کیا ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ چھوٹی تقطیع کے دو جزپر شائع ہوا ہے۔ قیمت پانچ آنہ

بیمار ؔ

یہ چھوٹے سائز کے اُنیس (19) صفحوں پر ایک مختصر ڈرامہ ہے جسے سجاد ظہیر صاحب نے لکھا ہے۔ کل ڈرامہ کا لب لباب یہ ہے کہ میزبان عزیز اور بیمار مہمان بشیر میں بحث ہوتی ہے جسمیں بشیر بالشویک خیالات کا اظہار کرتا ہے اور مرجاتا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ اچھا ہے۔

قیمت چار آنہ ہے۔ ملنے کا پتہ:- جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

ؔ ۱-۲-۳ چھوٹا سائز ۱۴۰ صفحات قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ دہلی۔

لطفِ سخن

جناب اختر جوناگڑھی

ہرسو نظر آتا ہے ہر جا نظر آتا ہے
پر چشم تماشا کو دھوکا نظر آتا ہے
آرائش و تزئین کو خود حُسن کہاں دیکھے
آنکھوں کو کہیں اپنا سُرمہ نظر آتا ہے
حیرت نے کیا ظاہر جو راز تھا آنکھوں میں
یاں شوق تماشا بھی رسوا نظر آتا ہے؟
وہ وادیٔ سینا ہو یا قُلّۂ فاراں ہو
مشتاق تجلّی کو جلوہ نظر آتا ہے
ملتے ہی نہ ہو دھوکا کیوں عرض تمنّا کو
دل تھا جو کبھی میرا اُن کا نظر آتا ہے
اللہ ری تنگ ظرفی ارمان بھرے دل کی
بندا اتنے سے کوزہ میں دریا نظر آتا ہے
ہے بند زبان اختر آنکھوں کو ہے سکتہ سا
کچھ کہہ نہیں سکتا میں کیا کیا نظر آتا ہے

اثر۔ مسٹر فضل اثر بی۔ اے۔ آگرہ

ہو کے ہم مایوس عشرت آہ و نالہ کیا کریں
غم سے تم خوش ہو تو پھر غم ہی نہ کیوں مانگا کریں
تشنگیٔ ذوق کا مٹنا حقیقی موت ہے
سامنے آنے سے بہتر ہے کہ وہ پردا کریں
لالہ و گُل میں چھپے رہنے کا مقصد ہے ضرور
یعنی جب پردہ کو اُلٹیں ہم تجھے دیکھا کریں
دیر و کعبہ برہمن اور شیخ کی جاگیر ہیں
اے تعین دوست! آخر ہم کہاں سجدہ کریں؟
یا ہمیں بیچارگی کے طعن دینا چھوڑ دے
یا وہ اک آنسو بتا دے ہم جسے دریا کریں
نام لیوا ہیں بہت آبادیوں میں اے اثر
چلکے ویرانوں میں اُنکے حُسن کا چرچا کریں

اقبال۔ مولوی اقبال الدین احمد صدیقی

ساقیا کس لئے در بند ہے میخانے کا
فصلِ گل! اور چلے دور نہ پیمانے کا!
عمر بھر شغل رہا شیشہ و پیمانے کا
ہم سے چھوڑا نہ گیا در کبھی میخانے کا
یہ بھی سچ ہے گروہ سُنتے رہیں بیٹھے کبتک
سلسلہ ختم نہ ہو جب مرے افسانے کا
شمع رو یاں جہان سے نہ ملو اے اقبال
حشر تو دیکھ چکے عشق میں پروانے کا

خنجر۔ مرزا فدا علی لکھنوی

مبارک ہیں جو رنگِ محفلِ عالم سمجھتے ہیں ۔۔۔ مسرت کو مسرت اور غم کو غم سمجھتے ہیں
تکلف سے بری ہیں پیروانِ پیرِ میخانہ ۔۔۔ گلی ساغر بھی ملتا ہے تو جامِ جم سمجھتے ہیں
کوئی چارہ نہیں ہے لذتِ تقریر سے ورنہ ۔۔۔ ترے چلتے ہوئے فقروں کا مطلب ہم سمجھتے ہیں
فلک کی آنکھ کے آنسو لئے ہیں پھول دامن میں ۔۔۔ حقیقت آشنا رازِ دُرِ شبنم سمجھتے ہیں
حیا پرور نگاہوں سے سرشک آلود آنکھوں سے ۔۔۔ سمجھنے والے حسن و عشق کا عالم سمجھتے ہیں
نفس کی آمد و شد سے فنا کا درس ملتا ہے ۔۔۔ سرودِ ساز ہستی کو نوائے غم سمجھتے ہیں
نظر شیشے پہ، ساغر ہاتھ میں اور لب پہ توبہ ہو ۔۔۔ بڑے ہی پارسا ہو تم کو خنجر ہم سمجھتے ہیں

رعنا۔ منشی برج لال جگی۔ بی۔ اے ضیائی۔ راولپنڈی۔

کیا بزمِ تجلی سے اسیرِ خاکداں مجھکو ۔۔۔ کہاں سے کھینچ کر ذوقِ نمو لایا کہاں مجھ کو
مہ و خورشید سے ظاہر ہے تیرے حسن کا جلوہ ۔۔۔ سُناتی ہیں ہوائیں تیرے دم کی داستاں مجھ کو
مثالِ عکس ہر اک آئینے میں میری منزل ہو ۔۔۔ کیا میلانِ خود بینی نے پابندِ مکاں مجھ کو
مثالِ نقشِ پا قائم ہوا ہوں دشتِ الفت میں ۔۔۔ بنایا پائمالی نے تری رہ کا نشاں مجھ کو
طلسمِ آب و گل کو اک تڑپ میں توڑ کر رکھدوں ۔۔۔ اگر مل جائے رعنا غیب سے دردِ نہاں مجھ کو

سنبل۔ گوری سرن لال بی۔ اے گورکھپوری

قلب میں لیلیٰ و شوخ کے اور نہ ویرانے میں ہے ۔۔۔ میں تو سمجھا ہوں کہ مجنوں میرے افسانے میں ہے
زندگی در اصل ہے مر مر کے بھی جینے کا نام ۔۔۔ تو یہ سمجھا ہے کمالِ زیست مرجانے میں ہے
بے ریائی کے سبب پروانہ پروانہ ہوا ۔۔۔ ورنہ سنبل کیا دھرا جل جل کے مرجانے میں ہے

عروج۔ جناب عروج زیدی بدایونی مدیر رسالہ "مومن"

سعئ تلاش میں تری، ہونے لگا ہے انحطاط ۔۔۔ پردۂ رخ اٹھا کے پھر، جوشِ طلب بڑھا بھی دے
حدِّ کمالِ رنج ہی، مژدۂ انبساط ہے ۔۔۔ سعئ جمالِ دلفریب، درد کو دل بنا بھی دے

فرحت۔ مسٹر گنگا دھر ناتھ بی۔ اے۔ ایل ایل بی کانپور

پیمانہ بھر چکا ہے مرے اضطراب کا ۔۔۔ ساقی بڑھا ادھر بھی پیالہ شراب کا
کیا انقلاب ہے کہ ابھی ہو ابھی نہیں ۔۔۔ ہستی دکھا رہی ہے تماشہ حباب کا
جس درجہ جوشِ غم میں ہو شانِ سکونِ غم ۔۔۔ اتنا ہی مرتبہ ہے بلند اضطراب کا

ہستی و موت دہر میں کہنے کے نام ہیں
دراصل جلوہ ہو وہ عطا و عتاب کا
غافل فریب ہوش ہو وہم نمود و بود
اتنا خیال رکھ کہ یہ عالم ہے خواب کا
دنیا نے جس کو وصل سے تعبیر کر دیا
فرحت وہ تھا سکون مرے اضطراب کا

فضا - سید دل محمد فضا جالندھر

تارِ نفس کو تارِ گریباں کئے ہوئے
جوشِ جنوں ہے کارِ نمایاں کئے ہوئے
اُس کی نظر کو حاصلِ ایماں کئے ہوئے
دل ہے سکونِ عشق کا ساماں کئے ہوئے
تصویرِ دشت کھینچ گئی اے جوشِ آرزو
بیٹھا ہوں اب نظر کو بیاباں کئے ہوئے
اب تو اٹھے نگاہ کہ اک عمر ہو گئی
لختِ جگر کو زینتِ داماں کئے ہوئے
ناکامیاں لئے ہوئے آئی ہو چشمِ شوق
تیری تلاش تا حدِ امکاں کئے ہوئے
اُسکی نگاہِ شوخ کا اندازِ دلفریب
جیسے ہو کوئی تیغ کو عُریاں کئے ہوئے
دنیا سمجھ رہی ہے نہیں جرأتِ سوال
میں خود ہوں رازِ عشق کو پنہاں کئے ہوئے
وارفتگیِ دل کا نگاہوں میں ہو مآل
رُخ اے فضا ہوں جانبِ زنداں کئے ہوئے

ماہر - از منظور حسین ماہر القادری

کسی کی مست آنکھوں کو فقط اکبار دیکھا تھا
مرا دل آج تک اک کیف سا محسوس کرتا ہے
کوئی اہلِ نظر اس فلسفہ کو کاش سمجھا دے
نظر کو کس طرح جلوہ ترا محسوس ہوتا ہے
خدارا قوتِ ادراک تو ہی فیصلہ کر دے
نگاہیں دیکھتی ہیں جسکو جلوہ ہو کہ پردا ہے
یہاں آکر بدل جاتی ہو دنیا دل کی لے ماہر
دکن کی سرزمین کیا ہے تمناؤں کی دنیا ہے

از جناب محمد یحیٰ صاحب اعظم گڈھ

مجھ کو ادائے شکر قابل بنا دیا
ان کی نگاہ ناز نے بسمل بنا دیا
کیا کیئے جاں نوازیِ پیکانِ یار کو
ہر ہر لہو کی بوند کو اک دل بنا دیا
دیکر متاعِ شوق، دلِ بے قرار کو
قطرہ کو تو نے بحر کا حامل بنا دیا
کیا تھی وگرنہ قطرۂ خونابہ کی بساط
ان کی نظر نے دل کو مرے دل بنا دیا
تڑپا دیا پھر اس دلِ شوریدہ نے مجھے
بے تابیوں نے پھر اسے قاتل بنا دیا
ہاں ان کی چشمِ مست نے کونین سے مجھے
غافل بنا دیا، مجھے غافل بنا دیا
کس جانِ انتظار کی شمعِ جمال نے
خلوت کو میری غیرتِ محفل بنا دیا
جب بزمِ کائنات کی تکمیل ہو چکی
دنیا اضطراب کو اک دل بنا دیا

علمی نوٹ اور خبریں

اپنے نامور والد بزرگوار کی طرح مولوی عنایت اللہ صاحب بی۔ اے سابق ناظم دارالترجمہ ریاست حیدرآباد دکن اردو ادب کی توسیع و ترقی میں مصروف ہیں۔ دارالترجمہ میں رہ کر آپ نے اردو کی جو قابل قدر خدمت انجام دی ہے اس کا مفصل حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔ اس عہدہ سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد آپ دہلی آکر تصنیف و تالیف و ترجمہ میں مصروف ہوگئے ہیں۔ حال ہی میں آپ نے "نجم السحر" کے نام سے انگریزی زبان کے مشہور و معروف فسانہ نگار رائیڈر ہیگرڈ کی ایک مشہور تصنیف کا ترجمہ کرکے شائع کیا ہے۔ اس کا حجم ۴۸۲ صفحات ہے اور قیمت صرف عہ۸؍

آپنے "سلامبو" نام سے ایک مشہور فرانسیسی ناول کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ حال میں آپ نے اٹلی کے فلسفی شاعر ڈانٹے کی مشہور کتاب "داستانِ جہنم" کا ترجمہ کیا ہے جو ہمعصر ساقی دہلی کے اکتوبر نمبر میں تمام و کمال شائع ہوا ہے +

مولوی سید محمد صاحب ایم۔ اے لکچرار سٹی کالج حیدرآباد کی کتاب "ارباب نثر اردو" کا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی و اضافہ کیساتھ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ اس کتاب میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے اہل قلم کی ادبی خدمات کا مفصل بیان ہے +

رسالہ عصمت دہلی نے اپنے نامور بانی اور ادیب اُردو مولانا راشد الخیری مرحوم کی یادگار میں ایک خاص نمبر شائع کیا ہے جسمیں مولانا مرحوم کے قدر شناسوں نے اُن کی زندگی اور ادبی خدمات کے ہر پہلو پر معلومات کا کافی ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ اس رسالہ کا حجم ۲۹۷ صفحات اور قیمت عہ۸؍ ہے +

رسالہ ادب لکھنؤ نے راجہ صاحب محمود آباد کی گدی نشینی کی تقریب میں محمود آباد نمبر کے نام سے ایک خاص نمبر غیر معمولی اہتمام سے شائع کیا ہے اسمیں ریاست محمود آباد کی تاریخ اور سابق رؤساء کے حالات کے علاوہ علمی ادبی اور تاریخی دلچسپی کے کئی قابل قدر مضامین ہیں۔ ریاست محمود آباد کے مہاراجگان کی ذات والاصفات سے اودھ اور اگرہ دونوں کو ہمیشہ پبلک فوائد حاصل ہوتے

رہے ہیں خصوصًا سابق مہاراجہ سر علی محمد خاں صاحب بالقابہ نے ملک وصوبہ کی جو اہم قومی خدمات انجام دیں اور جس فراخ حوصلگی سے وہ احباب کی خاطر تواضع ومہمان نوازی کرتے رہے اُس کی یاد عرصہ تک دلوں میں تازہ رہے گی۔ ہمکو اُمید ہے کہ نئے راجہ صاحب بھی اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر ملک کی تمام مفید تحریکوں کے حامی ومددگار رہیں گے۔

ہم کو دلی افسوس ہے کہ آجکل ملک میں ہر طرف اُردو ہندی کی ناگوار بحث چھڑی ہوئی ہے حالانکہ دونوں زبانیں "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" کے اصول پر اپنے اپنے طور پر ترقی کر سکتی ہیں۔ فی الحال ملک بھر میں مجموعی حیثیت سے کسی ایک زبان کے عام رواج پانے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ یہ ضرور ہے کہ عام تعلیم کی ترقی اور احساس قومیت کیساتھ ساتھ ہندؤں میں ناگری حروف اور ہندی زبان کا رواج قدرتاً بڑھ رہا ہے لیکن جہانتک اُردو کا تعلق ہے وہ خود ہندو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کی محبوب زبان اور تاریخی حیثیت سے دونوں کے ارتباط باہمی کی ایک قابل قدر یادگار ہے اسکو نہ کسی کا رقیب بننے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دوسری زبان کو اس سے رقابت ہونا چاہیئے۔ اگر یورپ کے لوگ تہذیب وترقی کے خاطر کئی کئی زبانیں جاننا ضروری سمجھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندو مسلمان دونوں اُردو ہندی سے بخوبی واقف اور اُنکے قدردان نہ ہوں۔ مگر دونوں طرف پُرجوش اصحاب باہمی ردوکد میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ہندی ساہتیہ پریشد کے گذشتہ اجلاس میں بعض لیڈران ملک نے اس معاملہ میں نئی اُلجھن پیدا کر دی ہے جس کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن اُردو نے کیسقدر گرمجوشی کیساتھ شرح وبسط سے لکھا ہے۔ مہاتما گاندھی اور بعض دیگر اصحاب کیطرف سے رفع شکوک کی کوشش کی گئی ہے مگر اس سے اس مسئلہ میں پہلے سے بھی زیادہ گنجلک پیدا ہو گئی جسکا ہر محب وطن کو دلی افسوس ہوگا۔ البتہ اس ردوکد کا ایک مفید نتیجہ یہ ضرور نکلا ہے کہ حامیان اُردو اپنا گھر سنبھالنے میں مصروف ہوگئے ہیں چنانچہ خاص خاص مقامات میں اُردو کو ترقی دینے کی تحریک شروع ہو گئی ہے اور اس کے لئے مختلف انجمنیں قایم ہو رہی ہیں۔ مگر اس کام میں فوری جوش سے زیادہ غیر معمولی انہماک صبر واستقلال اور ایثار کی ضرورت ہے جس کے بغیر در اصل کوئی بڑا کام کبھی انجام نہیں پایا۔

مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے اردو کی حفاظت وترقی کی ایک مفصل اسکیم تیار کی ہے۔ جس پر غور کرنے کے لئے ۲۴ و ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو علی گڑھ میں

ایک آل انڈیا کانفرنس طلب کی گئی ہے۔ جسمیں ملک کے منتخب خادمانِ اُردو کو شریک ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس اسکیم کے ضمن میں جو تجاویز سوچی گئی ہیں انمیں بعض یہ ہیں:-

(۱) کافی سرمایہ سے اردو کا ایک پبلشنگ ہاؤس قایم کرنا۔

(۲) دنیا کے مختلف زبانوں کی بہترین قدیم وجدید تصانیف کے ترجمے شائع کرنا۔

(۳) اُردو کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کا ایک وسیع پیمانہ پر کتبخانہ قایم کرنا۔

(۴) رسم الخط کی اصلاح اور املا کی صحت کے متعلق مشورہ دینے کے لئے ایک ادبی مجلس قایم کرنا۔

(۵) اردو ٹائپ کو رواج دینا۔

ہم اس کانفرنس کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی ذات گرامی اس بات کی کافی ضمانت ہو کہ یہ کانفرنس کسی فوری جوش کے زیر اثر یا فرقہ وارانہ جذبات کے ماتحت نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس کے ذریعہ اُردو کی توسیع و ترقی کا باضابطہ کام انجام پائے گا۔

اُردو ہندی مسئلہ کے متعلق ایک قابل قدر مضمون کے دوران میں پنڈت کشن پرشاد صاحب کول ممبر انجمن خادمانِ ہند نے ایک نہایت معقول تجویز یہ پیش کی ہو کہ صوبہ متحدہ کے مدرسوں میں اُردو ہندی دونوں کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ اس کے پہلے عرصہ ہوا مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی نے بھی زمانہ میں اس قسم کی تحریک پیش کی تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی (جنکی رائے بقول ہمعصر الناظر اُردو کیلئے بالکل ویسی ہی ہو جیسی قانوندان اصحاب کیلئے پریوی کونسل کی نظیر) اسکی تجویز کی پُرزور تائید کی ہو وہ لکھتے ہیں۔ کہ:- "دونوں کے پڑھنے سے دونوں کو تقویت ہوگی اچھی اُردو کے لئے ہندی جاننا ضروری ہے اسی طرح اچھی ہندی لکھنے کے لئے اردو کا جاننا ضروری"۔

ہمکو بھی اس رائے سے کامل اتفاق ہے۔

ناظرین کو معلوم ہے کہ کچھ عرصہ سے ترقی پسند مصنفین کی ایک آل انڈیا انجمن قائم ہوئی ہے جس کا مقصد ملکی ادب کو گذشتہ زمانے کے پامال دفرسودہ روش سے ہٹا کر نئے رخ پر لانا اور اسکو ملک کی روزمرہ زندگی کیلئے مفید کارآمد بنانے کی کوشش کرنا ہے چنانچہ اُردو کے متعلق الہ آباد۔ لکھنؤ و دہلی وغیرہ میں اسکی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ پچھلے ماہ اس انجمن کی تحریک پر اکثر مقامات میں روس کے نامور ادیب میکسم گورکی کے تعزیت میں یادگاری جلسے ہوئے۔

دہلی میں اس انجمن کی جو شاخ قائم ہوئی ہے اسکے پُرجوش سکرٹری مسٹر شاہد احمد ایڈیٹر ساقی ہیں۔ چنانچہ ان کے جوش عمل سے یہ شاخ خاص طور پر سرگرم کار ہے۔ حال میں اس کے کئی جلسے بھی ہوئے جسمیں اس کے عام مقاصد

کے مطابق قابل قدر مضامین پڑھے گئے اس شاخ نے ایک رسالہ بھی شاہجہاں کے نام سے جاری کیا ہے جس کا ایک خاص نمبر پچھلے ماہ ترقی نمبر کے نام سے شائع ہوا ہے۔ خادمان اُردو کو اس پرچہ میں کئی قابل توجہ مضامین اور بہت سی کام کی باتیں ملیں گی۔

ہمکو یہ سُنکر بہت افسوس ہوا کہ جولائی گذشتہ میں جناب عرش گیاوی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم طرز قدیم کے خوش فکر و کہنہ مشق شاعر اور حضرت تسلیم کے نامور شاگرد تھے، آپکی تصانیف میں حیاتِ تسلیم۔ حیاتِ موسن، اور دیوان غزلیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں آپنے کئی کتابیں اور بھی لکھیں مگر یہ ابھی تک طبع نہیں ہوسکیں۔ ذیل میں انکے چند اشعار بطریق یادگار ہمعصر سیار پٹنہ سے نقل کرکے ہدیہ ناظرین ہیں:۔

بے داغ الم دل میں پھپھولا نظر آیا ۔۔۔ اس نخل میں پھول آنے سے پہلے ثمر آیا

اک چھیڑ نکالی وہیں پیکان ستم نے ۔۔۔ کچھ دیر کو بھی دل کا جہاں زخم بھر آیا؟

جی ہی تو ہے اپنا جسے چاہا اُسے چاہا ۔۔۔ دل ہی تو ہے ظالم جدھر آیا اُدھر آیا

اب رات نہیں۔ صبح کے آثار ہیں ظاہر ۔۔۔ بیدار ہو لے عرش کہ وقتِ سفر آیا

افسوس کہ صوبہ متحدہ کے پُرانے اخبار نویس سید ابن علی صاحب ایڈیٹر نیر اعظم مراد آباد کا بھی پچھلے ماہ انتقال ہوگیا آپ قدیم وضع کے بزرگ اور شمالی ہند کے سب سے پُرانے ایڈیٹر تھے۔ ساٹھ برس سے اخبار نیر اعظم کی ایڈیٹری کررہے تھے۔ کئی سال ہوئے آپ حج کرنے گئے تو عراق و شام و فلسطین وغیرہ ممالک کی سیر و سیاحت بھی کرآئے جس کے متعلق آپ نے ایک مفصل سفر نامہ شائع کیا۔ خدا غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطاء فرمائے۔

ہمارے ناظرین زمانہ کے لئے رائے بہادر پنڈت شیونراین صاحب شمیم کی وفات از حد افسوسناک ہے۔ آپ رسالہ کے پُرانے مضمون نگار تھے اور اکثر مضامین لکھتے رہتے تھے۔ اس طرف کچھ عرصہ سے بیمار تھے افسوس صد افسوس کہ آپکا بھی ستمبر کے آخری ہفتے میں لاہور میں انتقال ہوگیا۔ پنڈت صاحب شاید چالیس پچاس سال سے مضمون نگاری کے عادی تھے۔ تیس چالیس سال پہلے کی آپکی کئی کتابیں ابتک مشہور ہیں۔ آپ نے ایک ناول "ایم۔ اے بناکے کیوں میری مٹی خراب کی" کے نام سے لکھا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ بقول ہمعصر ریاست اُردو اخبارات و رسائل میں سب سے زیادہ مضامین لکھنے والوں میں خان بہادر سلطان احمد خاں صاحب کے بعد آپ ہی کا نمبر تھا۔ کسی زمانہ میں شاید ہی کوئی پرچہ آپ کے مضامین سے خالی ہوتا تھا بلطف یہ کہ یہ خدمت آپ نے کبھی کسی مالی نفع کے خیال سے اپنے ذمہ نہیں لی بلکہ ملک کی ادبی خدمت کو وہ اپنا فرض

مقدم سمجھتے تھے۔ مذہب کے اعتبار سے آپ بدھ مت کے پیرو تھے۔ اور اس کے متعلق آپ نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ کچھ دنوں تک آپ پنجاب چیف کورٹ کے جج بھی رہ چکے تھے۔ اور ایک مقدمہ سازش کے کمیشن کے ممبر بھی مقرر ہوئے تھے۔ آپ نے اس کمیشن کے فرائض نہایت آزادی و انصاف پسندی سے انجام دئے۔ ان خدمات جلیلہ کے صلہ میں گورنمنٹ نے آپ کو "رائے بہادر" کا خطاب دیا اور رعایا میں بھی آپ کو ہر دلعزیزی حاصل رہی۔ پنجاب ہائی کورٹ میں آپ کو جو خاص پوزیشن حاصل تھی اس کا ثبوت صاحب چیف جسٹس کے تقریر سے ملتا ہے جو موصوف نے آپ کے ماتمی جلسے میں کی ہے۔ جسٹس ینگ صاحب نے آپ کی وفات حسرت آیات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے بجا طور پر فرمایا۔ کہ

"مرحوم فرقہ پرستی کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ اُن کا کام فرقہ پرستی کے اسپرٹ سے پاک و صاف ہوتا تھا۔ حالانکہ پنجاب میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کو فرقہ پرستی سے قطعی مبرا کہا جاسکے"

اس سے زیادہ کسی محب وطن ہندوستانی اور ملکی ادیب کی اور کیا تعریف ہوسکتی ہے۔ ہم کو بھی اسپنے دیرینہ محسن کے انتقال کا دلی صدمہ ہے۔ ایشور ان کی آتما کو شانتی اور ان کے اہل خاندان کو اس حادثہ کے برداشت کرنیکی قوّت عطا فرمائے۔

یہ مہینہ اُردو ادب کے لئے خاص طور پر منحوس ثابت ہوا چنانچہ اس ماہ کے پہلے ہفتہ میں اُردو کے نامور ادیب و محسن مولوی نور الحسن صاحب نیّرؔ کاکوروی کا بھی انتقال ہوگیا۔ مولوی صاحب مرحوم کو ادب و شاعری کا ذوق اپنے نامور والد حضرت محسنؔ سے ورثہ میں ملا تھا چنانچہ ضروری مشاغل سے جتنا وقت بچتا تھا وہ آپ ہمیشہ اردو ادب کی خدمت میں صرف کیا کرتے تھے۔ مولانا نیّرؔ کا سب سے بڑا کارنامہ "نور اللغات" ہے جو چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ یہ عظیم الشان کام ارباب علم کی ایک جماعت کے کرنیکا تھا مگر آپ نے سالہا سال کی جانکاہ کوشش اور محنت شاقہ سے اسکو تن تنہا انجام دیا۔ نور اللغات پر لکھنؤ کے بعض احباب نے مخالفانہ تنقید بھی کی ہے لیکن ان اعتراضات کے باوجود نور اللغات کی تالیف و تدوین اتنا عظیم الشان کام ہے کہ اُس کی اہمیت اپنی جگہ پر بدستور قائم ہے اور رہے گی۔ اس کی بدولت نیّرؔ مرحوم کا نام نامی صدیوں تک زندہ رہے گا۔

ادھر چھ سال سے آپ کی صحت قابل اطمینان نہ تھی۔ آخر ش علالت نے مرض الموت کی صورت اختیار کرلی۔ اور آپ ۸ ستمبر ۱۹۳۶ء کو اس دنیائے فانی سے رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔ خدا غریق رحمت کرے اور صاحبزادوں کو صبر کی توفیق دے۔ اردو ادب کے لئے آپ کا انتقال پر ملال ایک ناقابل تلافی حادثہ ہے۔ زمانہ اور اس کے ایڈیٹر پر آپ ہمیشہ نظر عنایت رکھتے تھے۔

بدست عوام فروخت کے لئے

نمونہ نمبر ۱۶۹

فارم اطلاعنامہ حسب دفعہ ۹ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ

اسپیشل ججی درجہ اوّل فرخ آباد

باجلاس مسٹر جیون چندر ملک صاحب بہادر اسپیشل جج درجہ اوّل فرخ آباد

نمبر مقدمہ ۶ سنہ ۳۶ء　　تاریخ پیشی ۲۳ دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء مقرر ہے

ہر گاہ ایک درخواست حسب دفعہ ۴ - ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ سنہ ۱۹۳۴ء (ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۹۳۴ء) جیسا کہ بروئے ایکٹ ۴ سنہ ۱۹۳۵ء ترمیم ہوا ہے محمد جلیل خاں خلف حافظ محمد امیر خاں قوم پٹھان ساکن موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد نے ______ اس غرض سے ______ پیش کی ______ ہے کہ ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ کے احکام اُس سے متعلق کئے جائیں

لہذا اس تحریر کی رو سے حسب دفعہ ۹ (۱) ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ سنہ ۱۹۳۴ء جیسا کہ بروئے ایکٹ ۴ سنہ ۱۹۳۵ء ترمیم ہوا ہے - اطلاع دی جاتی ہے کہ جملہ اشخاص جو محمد جلیل خاں مذکور کی ذات یا جائداد کے خلاف ہر دو ڈگری شدہ وغیرہ ڈگری شدہ خانگی قرضہ جات کے متعلق دعوے رکھتے ہوں وے گزٹ میں اس اشتہار کے شایع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے دعووں کے متعلق تحریری بیانات اُس حاکم کے روبرو پیش کریں جس کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں - اور بصورت خلاف ورزی اس کے ہر ایک دعویٰ ڈگری شدہ یا غیر ڈگری شدہ خلاف سائل مذکور جملہ اغراض و موقعہ جات کے لئے زیر دفعہ ۱۳ - ایکٹ مذکور باضابطہ بیباق متصور ہوگا +

نام قرضخواہان

(۱) موہن لال ولد ہنچل سنگھ قوم کورمی ساکن موضع پتورہ پرگنہ کمپل
(۲) سورج بھان ولد نتھو سنگھ قوم کورمی ساکن موضع بھٹاسہ پرگنہ شمس آباد پچھم
} ضلع فرخ آباد

دستخط (بابو) منو لال
منصرم اسپیشل جج صاحب بہادر درجہ اوّل
ضلع فرخ آباد - مقام فتحگڈھ

مہر عدالت

نوٹس حسب دفعہ ۱۱-ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۹۳۴ء

باجلاس جناب اسپیشل جج صاحب بہادر درجہ اول ضلع فرخ آباد مسٹر جیون چندر ملک صاحب بہادر اسپیشل جج درجہ اوّل

تاریخ پیشی ۲۳ دسمبر ۳۶ء مقرر ہے۔ نمبر مقدمہ ۶ سنہ ۱۹۳۶ء

محمد جلیل خاں ولد محمد امیر خاں پٹھان ساکن موضع پتورہ پرگنہ کمپل

بنام

سوہن لال ولد نہچل سنگھ قوم کورمی ساکن موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد

سورج بھان ولد نتھو سنگھ قوم کورمی ساکن موضع بھٹاسہ پرگنہ شمس آباد پچھم۔ ضلع فرخ آباد

ہرگاہ ایک درخواست حسب دفعہ ۴۔ ایکٹ جایداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ سنہ ۱۹۳۴ء (ایکٹ ۲۵ سنہ ۱۹۳۴ء) جیسا کہ بروئے ایکٹ ۴ سنہ ۱۹۳۵ء ترمیم ہوا ہے سائل نے اس غرض سے پیش کی ہے کہ ایکٹ جایداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ کے احکام اُس پر لگائے جاویں لہذا اس تحریر کی رو سے حسب دفعہ ۹ (۱) ایکٹ جائداد ہائے مقروضہ ممالک متحدہ سنہ ۱۹۳۴ء جیسا کہ بروئے ایکٹ ۴ سنہ ۱۹۳۵ء ترمیم ہوا ہے۔ اطلاع دی جاتی ہے۔ کہ جملہ اشخاص جو سائلان مذکور کی ذات یا جائداد کے خلاف ہر دو ڈگری شدہ یا غیر ڈگری شدہ خانگی قرضہ جات کے متعلق دعویٰ رکھتے ہوں وے گزٹ میں اس اشتہار کے شائع ہونے کی تاریخ سے تین ماہ کے اندر اپنے دعووں کے متعلق تحریری بیانات اُس حاکم کے روبرو پیش کریں جس کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں اور بصورت خلاف ورزی اس کے ہر ایک دعویٰ ڈگری شدہ یا غیر ڈگری شدہ خلاف سائل مذکور جملہ اغراض و موقعہ جات کے زیر دفعہ ۱۳- ایکٹ مذکور باضابطہ بیباق متصور ہوگا +

فہرست الف

نام موضع و پرگنہ و محال و پٹی	تعداد حقیت سایل	مالگذاری حصہ سائل
(۱) موضع امراپور نگلہ کوڑہ محال جھام راج پٹی ۱/۱ پرگنہ شمس آباد پچھم ضلع فرخ آباد	۱۸ بسوہ ۱۵ بسوانسی	240/-/-
(۲) موضع امراپور نگلہ کوڑہ محال شیو پرشاد پٹی ۱/۱ پرگنہ شمس آباد پچھم ضلع فرخ آباد	۱۶ بسوہ ۱۸ بسوانسی ۲ کچوانسی ۱ انوانسی	490/-/-
(۳) موضع رانی پور گوڑ محال نیاز محمد خاں پٹی ۱/۱ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد	۱۸ بسوہ ۱۵ بسوانسی	77/8/-

(۴) موضع رانی پور گور محال محمد منیر خاں پٹی ۱/۲ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد		۸ ابسوہ ۱۵ ابسوانسی		61/8/-

(۵) موضع سنجا پور محال ضبطی پٹی ۲۳ پرگنہ کمپل		منجملہ ۹۶-۲ کے ۸۴ سہام میں ۴۵ سہام

تفصیل دیگر جائداد مندرجہ وقف نامہ مورخہ یکم مئی ۱۹۳۳ء مصدقہ رجسٹری ۹ مئی ۱۹۳۳ء جس کو محمد جلیل خاں سائل نے اپنی درخواست و بیان تحریری میں نہیں ظاہر کیا ہے اور سوہن لال قرضخواہ نے اپنے بیان تحریری میں مقبوضہ سائل ہونا ظاہر کیا ہے۔

نام و پتہ متولی

(۱) مسماۃ نواب جان بیگم زوجہ محمد جلیل خاں قوم پٹھان ساکن موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد

(۲) محمد توفیق خاں عرف پیارے میاں ولد محمد جلیل خاں قوم پٹھان ساکن موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

تفصیل جائیداد

(۱) ایک قطعہ باغ ابنہ قلمی و کٹھل وغیرہ جس کی چہار دیوار پختہ پورب رویہ واقع موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

پورب قبرستان و درختان ابنہ تخمی۔ پچھم راستہ بعدہٗ باغیچہ نارنگی و مکان احمد منیر خاں و مکان مہر شاہ خاں وغیرہ۔ اوتر تالاب دکھن اراضی افتادہ منتقر۔

(۲) ایک قطعہ باغیچہ نارنگی و کٹھل و ابنہ قلمی معہ نشست گاہ اندرون باغیچہ جس کی چہار دیوار دروازہ خام جانب دکھن واقعہ موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

پورب آراضی افتادہ عبدالرحمن شاہ خاں وغیرہ۔ پچھم راستہ۔ اوتر راستہ سیر بعدہٗ کیفیت طوطا رام وغیرہ۔ دکھن راستہ گلی۔

(۳) آراضی افتادہ معہ درختان ابنہ و جامن و بیل وغیرہ و قبرستان و تالاب واقعہ موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

پورب باغیچہ نارنگی وغیرہ و درختان کنارا احمد منیر خاں و تالاب جانعالم خاں وغیرہ۔ پچھم مکان مسکونہ محمد جلیل خاں و مکان جس میں اندر کھٹکے عایا آباد ہے۔ اوتر باغیچہ ابنہ قلمی موقوفہ و قبرستان۔ دکھن مکان طوطا رام دسری رام وغیرہ کالیستھ۔

(۴) آراضی افتادہ معہ درختان املی و ابنہ تخمی و کٹھل و قبرستان جس میں قبر شہید صاحب موسومہ دمدمہ واقع ہے واقعہ موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

پورب پانت درختان ابنہ موسومہ چکیا والی۔ پچھم باغیچہ ابنہ وکٹھل موقوفہ۔ اوتر تالاب۔ دکھن آراضی افتادہ موقوفہ۔

(۵) درختان پانت ابنہ تخمی موسومہ چکیا والی جس کے شروع میں درخت کٹھل و آخر میں درخت ابنہ موقوفہ چکیا واقعہ ہے واقعہ موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

پورب باغیچہ نارنگی وکٹھل وابنہ قلمی موقوفہ وراستہ دسیر وکھیت طوطارام وغیرہ۔ پچھم آراضی افتادہ موقوفہ وقبرستان۔ اوتر تالاب۔ دکھن نشست گاہ ونشست گاہ مکان سکونتی محمد جلیل خاں۔

(۶) ایک قطعہ مکان معہ نشست گاہ سکونتی محمد جلیل خاں تعمیر پختہ وخام اوتر رویہ جس کے اندر جانب پچھم سہ دری پختہ دو جانب پورب کمرہ پختہ دو جانب دکھن سہ دری خام وباورچی خانہ واقعہ ہیں و رعقب کمرہ پختہ مذکور کے سہ دری خام چھپر چھپیر کاہی معہ صحن و درختان نیب وغیرہ واقعہ موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

پورب مکان مسماۃ محمدی بیگم ومکان مسماۃ نیازن بیگم۔ پچھم آراضی افتادہ موقوفہ اوتر پیش دروازہ۔ دکھن مکان صادق علی ومکان محمد جلیل خاں۔

(۷) ایکقطعہ مکان تعمیر خام جسمیں اندر کھٹک رعایا آباد ہیں۔ واقعہ موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

پورب مکان صادق علی پچھم درخت جامن وتالاب۔ اوتر آراضی افتادہ موقوفہ۔ دکھن پیش دروازہ۔

(۸) ایک قطعہ مکان تعمیر خام جس میں دس منڈیاں کاہی واقعہ ہیں جس میں کہا والا وکھٹک وغیرہ آباد ہیں واقعہ موضع پتورہ پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد۔

پورب مکان محمد جلیل خاں پچھم راستہ گلی بعدہٗ مکان طوطارام کالیستھ وغیرہ۔ اوتر گلی، بعدہٗ مکان صادق علی دکھن گلی بعدہٗ مکان طوطارام ومکان مہابیر پرشاد کالیستھ۔

(۹) حقیقت زمینداری تعدادی ۷ بسوہ ۱۷ بسوانسی ۲ کچوانسی ۷ انوانسی سے ۵ء۴ سہام معہ جمیع لوازمہ وتوابع متعلقہ واقعہ موضع بہنار محال محمد منیر خاں پرگنہ کمپل ضلع فرخ آباد منجملہ ۸ء۴ سہام کے ؎

دستخط (بابو) منولال منصرم

عدالت اسپشل جج درجہ اول

فرخ آباد

مہر عدالت

ڈاکٹر ایس - کے - برمن لمیٹڈ

صیغہ نمبر ۶۹ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

پچاس برس سے مشہور ولائتی دیسی پیٹنٹ دواؤں کا ہندوستانی وسیع کارخانہ

STAR
TRADE S.K.B MARK
(REGD)

کف کف

(ٹریڈ مارک)

(کف کھانسی اور سردی کی بڑھیا دوا)

روگ کا گھر کھانسی ہی ہے۔ اسے کبھی بھی بڑھنے نہ دینا چاہیئے۔ تدارک بھی آسان ہے۔ چاہے کیسی بھی کف اور کھانسی کی بیماری کیوں نہ ہو یہ دوا فوراً آرام کرتی ہے۔ پیتے ہی سردی کو بچا کر کھانسی کو دباتی ہے۔ سستی اور حرارت کو دور کرتی ہے۔

قیمت بڑی شیشی ایک روپیہ پانچ آنہ ۵؍۱
ڈاک محصول دس آنہ ۱۰؍
چھوٹی شیشی ۱۱؍
ڈاک محصول سات آنہ

فائدہ مند دوائیں ہیں

Regd

رنگ رنگ

(مرہم داد)

ایک بار لگاتے ہی خارش رفع ہو کر سوزش جاتی رہتی ہے۔ نیا خواہ پرانا کیسا ہی داد کیوں نہ ہو اسکے دو تین بار لگانے ہی آرام ہو جاتا ہے

قیمت فی ڈبیہ چار آنہ ۴؍ ڈاک محصول چھ ڈبیوں تک سات آنہ ۷؍

قیمت نمونہ ۱؍ ڈیڑھ آنہ۔ جو صرف ایجنٹوں سے ہی مل سکتا ہے۔

نوٹ:- ہر جگہ ہمارے ایجنٹوں کے ہاں اور دواخانوں میں ملتی ہے۔ دوا خریدتے وقت اسٹار ٹریڈ مارک اور ڈاکٹر نام ضرور دیکھ لیا کریں۔

(۱) کانپور ۳۹ نیا گنج کے ایجنٹ محمد حفیظ محمد بشیر (۲) کانپور کلکٹر گنج کے ایجنٹ چھوٹے لال اینڈ سنز (۳) کانپور نیا گنج کے ایجنٹ رام اینڈ کمپنی

سری لبھہ پرنٹر نے ببیر دال پریس کانپور میں چھاپا　ایڈیٹر و پبلشر منشی دیا نراین نگم بی۔ اے

زمانہ

مرتبہ:- دیانرائن نگم، بی۔اے

نمبر ۴	اکتوبر ۱۹۳۶ء	جلد ۶۷

فہرست مضامین

تصاویر:- منشی پریم چند مرحوم۔ علامہ نیر کاکوروی

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا
قیمت سالانہ ممالک غیر سے ۶؎، ششماہی ۵؎، ہندوستان کے لئے ششماہی ۳؎

حدیثِ حُسن

کے متعلق

ملک کے مسلّم الثبوت ادبا کے سابق اور تازہ ارشادات کے چند اقتباسات

مولانا اقبال سہیل سطور ذیل کی نگارش کا محرک وہ دلکش مجموعہ نظم ہے جو ملک کے جوان بخت فرزند اور نوجوان سال ادیب سید شمیم احمد صاحب فطرتؔ واسطی نے حدیث حسن کے نام سے شایع کیا ہے، نام ہی شعریت اور نسبتیا شاعری ہونیکے علاوہ فیض فطرت نے نکتہ سنج طبیعت اور نکتہ بار زبان عطا کی ہے۔ نظموں کے تیور کہہ رہے ہیں کہ ان کے مصنف کو آیندہ نسل شعرا کا گل سر سبد ہو کر رہنا ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح کی سراپا محشرستان جذبات نظمیں اردو میں شاذونادر ہی نظر آسکتی ہیں۔ جدت کے باوجود تشبیہات کی ندرت استعارات کی تازگی۔ ترکیبوں کی شگفتگی۔ تصویروں کی دلکشی جذبات کی شدت اور خیالات کا جزر ومد وہ محاسن ہیں جو یکجا طور پر پختہ کاروں کے کلام میں بھی مشکل سے مل سکتے ہیں۔

علامہ نیاز فتح پوری فطرتؔ صاحب یو۔ پی کے ان چند ذہین نوجوانوں میں سے ہیں جو دنیا میں سب کچھ بن سکتے ہیں۔ فطرتؔ کی شاعری میں جو بات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہ ہے کہ انھیں معارف و حقایق کا شوق نہیں وہ جو کچھ لکھتے ہیں اپنے تاثرات کے تحت میں لکھتے ہیں۔ ان کے یہاں ندرت بھی کافی پائی جاتی ہے اور سلاست و حلاوت بھی۔

مولانا سلیمان ندوی حیرت ہوئی کہ عین اس وقت جب یہ یقین ہو چلا تھا کہ ہماری شاعری کی فرسودہ راہ میں کوئی جدت اب پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس نوجوان شاعر نے طریق تقلید کو چھوڑ کر تجدید کی ایک نئی راہ پیدا کی ہے۔

حضرت جوش ملیح آبادی فطرتؔ کو قدرت نے محسوس کرنے والا دل اور مطالعہ کرنے والی آنکھیں بخشی ہیں حساس دل اور اظہار خیال کی قوت بھی شاعری کی دو بنیادی چیزیں ہیں جو انھیں حاصل ہیں کچھ دنوں میں آپ ہندوستان کے بہترین شاعروں کی صف میں ایک ممتاز درجہ حاصل کرلیں گے۔

منشی دیانراین نگم حدیث حسن سید شمیم احمد صاحب فطرتؔ واسطی کی پچاس نظموں کا خوبصورت مجموعہ ہے فطرتؔ صاحب اردو کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ خیالات میں بلندی اور الفاظ میں روانی و ترنم۔ بندشوں میں چستی بھی موجود ہے۔ غرضیکہ کلام پڑھنے سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے اس کتاب میں واسطی صاحب کا فوٹو بھی ہے۔

لکھائی۔ چھپائی۔ کاغذ عمدہ۔ چھوٹی تقطیع کے صفحات مجلد۔ قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمایئے

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید کتابیں

مجبور وفا نان کواپریشن کے زمانہ کا ایک دلچسپ افسانہ۔ مصنفہ پنڈت کشن پرشاد کول۔ قیمت عہ

قربانی ایک سوشل ڈراما۔ مصنفہ پنڈت کشن پرشاد کول قیمت ۸ر

جہان آرا بیگم بنت شاہجہان کی مفصل سوانحعمری مصنفہ ضیاء الدین احمد صاحب برنی۔ بی۔ اے۔ ۸ر

ہندو تیوہاروں کی اصلیت اس کتاب میں مصنف نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور ان کی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح و آسان زبان میں لکھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور تمدنی انتظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے۔ اردو ایڈیشن کی قیمت ۹ر ہندی ایڈیشن کی قیمت جس میں اردو ایڈیشن کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل دی گئی ہے عہ

مرقع ادب حصہ اول و دوم مرتبہ جناب صفدر مرزاپوری۔ ہندوستان کے مشہور انشاپردازوں اور شاعروں کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے اعزا وغیرہ کو لکھے ہیں۔ حصہ اول ۸عہ حصہ دوم ۶ر

بیوہ از منشی پریم چند صاحب بی۔ اے مرحوم۔ اس کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات اور ان ترغیبات کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ بیواؤں کے لیے کس قسم کی زندگی بہترین ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت صرف عہ

جدید اردو شاعری مصنفہ جناب پروفیسر عبدالقادر سروری جس میں غدر کے بعد سے موجودہ زمانہ تک اردو شاعری کے تغیرات۔ رجحانات۔ خصوصیات اور ارتقائی تاریخ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے جو چار سو صفحوں پر ضمیموں، تصویروں، انڈکس اور نفیس جلد کے ساتھ شایع ہوتی ہے۔ قیمت ۶ر

مثنوی سحر یعنی وشنیت و شکنتلا منظوم حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز۔ قیمت ۸ر

خیالات عزیز یعنی مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب حجم ۲۰۰ صفحات۔ سرورق پر مصنف کی عکسی تصویر ہے۔ ٹائٹل خوشنما۔ رنگین لکھائی چھپائی اعلیٰ ہے۔ قیمت صرف ۶ر

طریق دولتمندی

دولت کی چاہ سبکو ہے۔ لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کتاب میں دولت کے آسان طریقے بتائے گئے ہیں۔ قیمت صرف ۸ر

اثرستان

ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ تیر و نشتر ہے قیمت عہ

روٹھی رانی

جس میں حسن و عشق کی جیتی جاگتی تصویر ناز و نیاز کا دلچسپ معرکہ اور تراہٹ کی دلکش مثال موجود ہے قیمت ۱۲ر

پریم بتیسی

ملک کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کے بہترین قصوں کا مجموعہ۔ زبان نہایت سادہ اور طرز بیان بیحد دلچسپ ہے۔ حصہ دوم عہ ۱۲ر

اردو مضمون نویسی

مضمون نویسی پر منشی نانک پرشاد صاحب مرحوم بی اے۔ کی نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے اسکے مطالعہ سے بہت جلد اردو مضمون نویسی کی مہارت اور ہر موضوع پر آسانی کے ساتھ مضمون لکھنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے قیمت ۸ر

شریمد بھگوت گیتا

یعنی کرم لوگ شاستر المعروف بہ غذائے روح بالتصویر مترجمہ پنڈت پربھو دیال مسر عاشق

قیمت ۶ر

ہندستان میں ذات پات کی تفریق

قیمت ۲ر

فلسفہ جنگ

جنگ کے فلسفہ پر ایک دلچسپ اور واضح بحث۔ قیمت ۵ر

گلزار داغ

فصیح الملک جناب داغ دہلوی مرحوم کا مشہور و مقبول دیوان جو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ داغ کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں قیمت صرف عہ

انسانی قربانیاں

چند اصلاحی و معاشرتی مضامین کا نہایت ہی دلچسپ اور دلگداز مجموعہ۔ قیمت آٹھ آنہ

روح رواں

یعنی دنیائے اردو ادب کے مایۂ ناز شاعر خوش بیان و شیریں زبان چودھری جگت موہن لال صاحب رواں (مرحوم) ایم-اے کا کیف آگین وجد آفریں کارنامہ جس کا پیش نامہ شہرۂ آفاق شاعر اعظم عزیز لکھنوی نوراللہ مرقدہٗ نے تحریر فرمایا ہے۔ جس میں محض غزلیں نظمیں اور خمسے ہی نہیں بلکہ خیام ہند کی ادبی کوششوں کا شاہکار یعنی رباعیات بے مثال بھی شامل ہیں۔

لکھائی چھپائی بنہایت نفیس اور دیدہ زیب

قیمت عہ علاوہ محصولڈاک

جملہ کتابیں

منیجر دفتر زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے

ہاف ٹون و عکسی تصویریں۔ مشاہیر زمانہ ایک آنہ فی تصویر

مرزا غالب، مومن، انیس، آزاد۔ مولانا حالی، علامہ شبلی، سرشار، اقبال، چکبست، نظر لکھنوی، حضرت وصل بلگرامی، عزیز لکھنوی، شاد عظیم آبادی، رسوا، لالہ سری رام، سلیم پانی پتی، برق دہلوی، طباطبائی، اثر لکھنوی، ناشاد، محروم، تسکین، افسر، حسرت موہانی، راز چاندپوری، فرحت اللہ بیگ، امیر مینائی، داغ، ذکاء اللہ، ڈاکٹر نذیر احمد، نثر لکھنوی، سر سید احمد خاں، سرور جہان آبادی، ریاض خیر آبادی، اکبر الہ آبادی، مولانا صفی لکھنوی، عزیز، شوق قدوائی، مہر دہلوی، جوش ملیح آبادی، رواں مرحوم، حفیظ جالندھری، جگر مراد آبادی، کیفی، سدرشن، منشی بالمکند گپتا۔ منشی پریم چند مرحوم، محشر لکھنوی،

پنڈت آنند نراین ملا ایم اے، جگر بریلوی۔ گروپ ہندوستانی اکیڈیمی۔ رام بابو سکسینہ۔ راشد الخیری وغیرہ

نوٹ:۔ ان تصویروں کا البم ۱۲ میں ملیگا۔

رنگین آرٹ پیپر پر ۲ فی تصویر

تاج محل کا تخیل، عمر خیام، خواب راحت، تار شکستہ، لسنت رت، رفیق طفلی، دربوستاں، نمود شام، صبح صادق، سنگار، پردہ نشین، نور جہاں کی حسن تدبیر، انتظار، روح اور گناہ، پیام کرشن، گل بیچ روزہ، پیام محبت، شکنتلا کا نامہ شوق، موہنی، بلبل گرفتار وغیرہ

نوٹ:۔ ان تصویروں کا البم ۱۲ میں ملیگا۔

ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر - کر اپر صاحب بہادر سی - آر - ایس - فیلو آف کمیسٹری لندن

جنکی بابت لندن، کلکتہ، پنجاب، آگرہ، میڈیکل کالج کے سند یافتہ ڈاکٹروں، نوابوں اور راجاؤں معزز حکما و صاحبان ڈپٹی کلکٹران و معزز یوروپین انگریزوں نے بعد تجربہ لکھا ہے کہ ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ آنکھوں کی بیماری اور ترقی روشنی کے واسطے مفید ہی اور سب سے زود اثر دوا ہے۔ ملک روس افریقہ کے معزز ڈاکٹروں اور ہندوستان کے حکیموں و دیدول نے آنکھوں کی بیماری میں اور دوا چھوڑ کر اس سرمہ کو استعمال کیا ہے۔

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اس میں کامیابی

نگاہ ناپ کر سرمہ لگائیے، دو ہفتہ میں روشنی بڑھ جائیگی اور جملہ نقایص دور ہو جائینگے عینک کی ضرورت نہیں رہتی دھند، ڈھلکا، آنسو بہنا، سوزش، آنکھوں کے سامنے اندھیرا - پلکوں کے اندر کی سرخی گوہانی دور ہو جاتی ہے، کمزور نگاہ سے سوئی میں تاگا بہت جلد ڈال لیجئے - پربال، سیل، جالا، پھولا - ابتدائی موتیا بند، ناخونہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا - ڈر سا آنا بند ہو جاتا ہے، لکھنے پڑھنے سے آنکھ کی تکان اور سرخی بہت جلد صاف کرتا ہے اور امراض چشم سے محفوظ رکھتا ہے۔

قیمت فی تولہ تین روپے (عہ) محصول ڈاک ۵ ر - نمونہ ۱۰ر ہے کم قیمت پر نہیں ملتا -

ملنے کا پتہ : - مینیجر نگم کمپنی نیا چوک کانپور ۔

شاعری سیکھئے

خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کی معرکۃ الآرا تصنیف شاعری کا سیٹ جس سے بیشمار شاعر اس وقت تک مستفیض ہو چکے ہیں اور برابر ہو رہے ہیں جسمیں تقطیع کرنیکا آسان قاعدہ صنایع و بدایع کا بیان اصلاح دینے کے اصول اور ابتدائی مشق کے آسان قاعدے بالتفصیل مذکور ہیں۔ ابتک اس سے زائد آسان کتاب جسکو مبتدی پڑھکر آسانی سمجھ سکے نہیں تھی - اگر آپکو اردو زبان دانی و شاعری کا شوق ہے تو پہلے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے اور مشق کی ترکیب پر عمل کیجئے - ایک سال میں آپ کامل شاعر بنجائینگے - حال میں کچھ اور مفید اضافہ کر کے کتاب کا حجم زیادہ کر دیا گیا ہے - مکمل سیٹ کی قیمت دو روپیہ (۲) ہے -

مصنف موصوف کی اور دیگر مشہور مصنفین کی تصنیفیں پتہ ذیل سے طلب فرمائیے -

مینیجر عشرت بکڈپو گینگ اسٹریٹ احاطہ خانساماں لکھنؤ

راماین مسدس

(مصنفہ جناب منشی رامجی مل صاحب ضا کپور سنبھلی)

اس راماین میں مخصوص خوبی یہ ہے کہ قابل مصنف نے شری رامچندر جی کے چرتر کو عجیب و غریب مرغوب انداز میں ظاہر کیا ہے جو بمقابلہ دیگر راماینوں کے نیا اور انوکھا ہے اور فرسودہ مضمونوں سے پاک و صاف ہی آپکے جدت طراز ذہن رسا نے ایسے ایسے نازک نادر استعارات و تشبیہات و لکش اس حسن و خوبی سے استعمال کی ہیں جو دیدہ زیب جابمہ فرحت و روحانی و وجدانی لطافت سے مملو اور معنی آفرینی میں قریب المأخذ ہیں۔ ہر شعر چلتا ہوا جادو اور نشتر کا کام کرتا ہے۔ لطف محاکات و بلند پروازی تخیل قابل تحسین ہے اشعار کی نوعیت کا رنگ بالکل نیا ہے - فصاحت کا دریا لہریں لے رہا ہے۔ غرضکہ یہ راماین تفریح اور عبرت کا درس دینے میں بےنظیر ہے - راماین کے اندر نو تصویریں رنگین نہایت عمدہ ہیں -

حجم ۲۰۸ صفحات قیمت مجلد با تصویر تین روپیہ عہ

زمانہ

جلد ۶۷ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء نمبر ۴

مغرب میں لامذہبیّت کا ارتقاء
ایک سرسری نظر

(از سیّد اختر علی صاحب تلہری)

یوروپ میں عیسائیت نے جب اقتدار کے پرپُرزے نکالے تو اُس نے طاقت و حکومت کے پندار میں "مذہبی رواداری" کا نظریہ یک لخت نظر انداز کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ مختلف جابرانہ قوانین کے ذریعہ قوائے فکر و استدلال کو مفلوج بنا دینے کی سعی کی۔ مذہبی حدود کو اپنے غلط طبعیاتی و فلکیاتی مزعومات" تک پھیلا دیا۔ اور جن علوم سے ان اغلاط کی تصحیح ہو سکتی تھی انھیں جسارت کیساتھ شیطانی مشغلہ کی چیزیں قرار دیکر علم و سائنس کی ترقی روک دینے کا پورا تہیّہ کر لیا۔

اسمیں شک نہیں کہ تیرہویں صدی تک عیسائیت "آزاد خیالی" کے روکنے میں کامیاب ہوئی لیکن یہ کوششیں تقاضائے عقل و فطرت کے بالکل خلاف تھیں اسلئے ان کا رد عمل ہونا لازمی تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی میں اٹلی سے اس مد کا جزر شروع ہوا اور وہاں کے باشندوں کے خیالات عبد اور معبود کے تعلقات کے بارہ میں "عیسائی تخیل" سے علٰحدہ ہونے لگے لیکن یہ سلسلہ نہایت آہستگی سے جاری تھا کیونکہ قدم قدم پر تشدد و سخت گیری آزاد خیالی کے سدِ راہ تھی سترھویں صدی سے غور و فکر کی قوتیں عیسائیت کے خلاف باقاعدہ طور پر میدان میں آنے لگیں۔ اُنیسویں صدی میں مغرب میں عیسائیت کا زور اسقدر کم ہو گیا کہ اس نے قریب

قریب آثار قدیمہ کی حیثیت اختیار کرلی۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں صاحبان غور وفکر کے عیسائیت اور انجیل کو مسترد کرنے کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ اُن کا باہمی تضاد وتناقص بعید از فہم تھا۔ اُن کے خیال کے مطابق مسیحی عقیدوں میں بہت سی اخلاقی دشواریاں نظر آتی تھیں لیکن جب انیسویں صدی کے آغاز ہی سے سائنس کے نت نئے اکتشافات ہر طرف سے اس کے استقبال کے لئے بڑھے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسوقت کے بہت سے عیسائی اعتقادات پہلے سے بھی زیادہ متزلزل ہوگئے۔

سترھویں صدی میں صاحبان غور وفکر کی اچھی خاصی تعداد اس نتیجہ تک پہونچ چکی تھی کہ عیسائیت نے دنیا کا جو تخیل قائم کر رکھا ہے وہ حکیمانہ نہیں ہے اس لئے بعض لوگوں نے اس کو علانیہ مسترد کردیا اور کچھ لوگوں نے عقیدہ اور عقل کی حدیں علیحدہ علیحدہ قائم کرکے اپنے مذہبی عقائد محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔

بیکن ڈیکارٹ اور لاک

بیکن نے اگرچہ وہ ہمیشہ راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کا مدعی رہا اپنی تحریروں کے ذریعہ یہ فضا پیدا کرنا چاہی کہ علمی تحقیقات کا فریضہ آزادی سے جاری رہے اور مذہبی عقائد اُس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔ عیسائیت میں جو توہمات وتعصبات مختلف وجوہ سے داخل ہوگئے تھے اُن کا قلع وقمع کرنے کے لئے اس تبلیغ کی ضرورت بھی تھی جسے بیکن کی پُر مغز تحریروں نے ایک حد تک خوش اسلوبی سے انجام دیا، ڈیکارٹ فلسفۂ جدید کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ اس نے بھی اس تبلیغ کو تقویت پہونچائی۔ اگرچہ اس پختہ کار حکیم نے عیسائی دنیا کو رضامند رکھنے کی پوری کوشش کی تاہم اُس کا فلسفہ "فکری حریت"، کو تقویت دینے کا اچھا خاصا سامان بن گیا۔ اُس فلسفہ کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ سابق کے تمام مسلمات سے انکار کردیا جائے اور خالص غور وفکر کی مدد سے زندگی کے معمہ کا حل پیش کیا جائے۔

"چونکہ میں سوچتا ہوں اس لئے میں موجود ہوں"، جس فلسفہ کا "نقطۂ آغاز" یہ ہو وہ اسی منزل کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔ مگر سابق کے تمام خیالات ومسلّمات کے نقوش مٹا کر اپنی دنیا آپ بنانے کا مسلک اگر حریت فکر کا باعث نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟

گذشتہ صدیوں کے عیسائیوں کی سخت گیری نے مفکرین میں عقل کو نقل پر ترجیح دینے کا عام رجحان پیدا کردیا تھا۔ بیکن و ڈیکارٹ کے فلسفیانہ نظریوں نے اس رجحان میں پوری قوت پیدا کردی تھی لیکن اس رجحان کو صحیح معنوں میں عملی جامہ پہنانے والا انگلستان کا

نامور حکیم لاک ہے۔ جس نے عقل کو نقل پر ترجیح دینے کا اصول اتنی مضبوطی سے قائم کر دیا تھا۔ کہ اٹھارھویں صدی کے حامیان و مخالفان مذہب کی باہمی معرکہ آرائیوں میں دونوں گروہوں کے اسلحۂ جنگ عقلی دلائل ہی قرار پائے۔ عقیدہ کو کسی ممتاز حامیٔ مذہب نے بھی بطور امر فیصل پیش نہیں کیا۔

لاک اپنی مشہور کتاب (Concerning human understanding) میں اس مسئلہ سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے :-

میرے خیال میں اس کا تذکرہ غیر مناسب نہ ہوگا کہ خواہ عقیدہ استدلال سے کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو لیکن بہر حال اُس کا مفہوم "مستحکم دماغی اذعان وقبول" کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور اگر اسے مرتب اور منضبط بنایا جائے، اور ایسا کرنا ہمارا فرض ہے، تو اُسے استدلال سے بے نیازی نہیں ہو سکتی۔ پھر ایسی صورت میں یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ عقیدہ استدلال کے مخالف ہوتا ہے۔

جو شخص بغیر کسی دلیل کے کسی چیز پر اپنا اعتقاد قائم کر لیتا ہے وہ اپنے تخیلات کا عاشق وشیدا تو ہو سکتا ہے لیکن صداقت کا جویا اور اپنے خالق کا مطیع بندہ نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ وہ اُن قوائے ممیّزہ سے کام نہیں لیتا ہے جو اُسے غلطیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے دئے گئے ہیں۔

جو شخص اپنے مقدور بھر ان قوتٰی سے کام نہیں لیتا ہے ممکن ہے کہ اس کے قدم صحیح جادہ پر ہوں لیکن یہ محض اتفاقی بات ہوگی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اتفاقی خوش نصیبی سے اُسکی اس کارروائی کا باضابطہ کفارہ ہو سکتا ہے۔

اپنے علم اور اپنے تصورات پر غور کرنے کے بعد جن صداقتوں کا بھی ہم پر انکشاف ہوتا ہے وہ ہمارے لئے اُن سے زیادہ قطعی اور یقینی ہوتی ہیں جو "روایتی الہام" کے ذریعہ ہم تک پہونچتی ہیں۔ کیونکہ اس امر کا علم کہ یہ الہام اولاً خدا کی طرف سے ہے اتنا یقینی نہیں ہو سکتا جتنا کہ وہ علم جو ہم اپنے تصورات کے ائتلاف وعدم ائتلاف کے واضح احساس سے حاصل کرتے ہیں۔

مثلاً طوفان نوح کا تاریخی واقعہ ہم تک اُن تحریروں کے ذریعہ پہونچا ہے جو الہامی ہیں لیکن یقیناً کسی شخص کو اس طوفان کا اتنا یقین نہیں ہو سکتا ہے جتنا خود حضرت نوحؑ کو ہوگا یا بہ الفاظ دیگر کسی شخص کا یقین اُس یقین کے برابر نہیں ہو سکتا ہے جو طوفان کے ذاتی مشاہدہ سے بہم پہونچتا۔ لہٰذا وہ تصدیقات جن کے یقینی ہونے کی بنیاد تصورات کے ائتلاف وعدم ائتلاف کے احساس پر ہو وہ خواہ فوری ارتقار کے ذریعہ سے حاصل ہوئے ہوں جیسا کہ بدیہی قضایا میں ہوتا ہے یا "استدلالی استخراج" کے ذریعہ

حاصل ہوئے ہوں۔ ہمیں اُن کے قبول کرنے کے لئے وحی و الہام کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ علم کے فطری ذریعے ان مقدمات کو دماغ میں پیشتر ہی سے مرتسم کر دیتے ہیں۔ اُن صورتوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جہاں خدا نے فوری الہام کے ذریعہ ہمارے دل میں القا کر دیا ہو یقین حاصل کرنے کی بہترین امکانی صورت یہی ہے۔ لیکن میرے خیال میں کوئی چیز اپنے الہامی ہونے کی بدلت ہمارے صاف و واضح علم کی بنیاد نہیں ہلا سکتی یا اگر وہ "الہامی علم" ہمارے فہم وادراک کے بالکل ہی مخالف ہے تو کسی شخص کے لئے اُسے عقلی حیثیت سے مان لینا ناممکن ہے۔ ہم کسی چیز کو جو براہ راست ہمارے صاف اور واضح علم کے متضاد ہے سچا تسلیم نہیں کر سکتے۔ اسی طرح کوئی ایسا مقدمہ وقضیہ "ایز دی الہام" کا نتیجہ نہیں سمجھا جا سکتا جو ہمارے واضح وحدسی علم کے مخالف ہو۔ کیونکہ ایسی صورت میں ہمیں علم شہادت و قبولیت کے تمام اصولوں کو منقلب کر دینا ہوگا۔ اگر ہم نے مشکوک قضایا کو بدیہی قضایا کی جگہ لے لینے دی اور اُن اُمور کو جن میں غلطی کا امکان ہو ایسی چیزوں پر ترجیح دے دی جو یقینی ہیں تو پھر جھوٹ اور سچ میں کوئی فرق ہی نہ رہے گا اور دنیا میں قابل اعتقاد و غیر قابل اعتقاد امور کا کوئی معیار ہی نہ بن سکے گا۔

خدا کا وحی والہام قطعاً سچ ہوتا ہے لیکن اس کا فیصلہ کہ یہ ربانی الہام ہے استدلال ہی سے ہونا چاہیئے۔ دلیل و استدلال دماغ کو اس کی کبھی اجازت نہیں دے سکتے کہ ایک کم واضح امر کے قبول کرنے کے لئے واضح تر امر کو مسترد کر دیا جائے یا علم وتیقن کے مقابلہ میں اُس چیز کو مان لیا جائے جس کا ہونا اغلب نہیں ہو۔ اس کی کوئی شہادت نہیں مل سکتی کہ کوئی خاص روایتی الہام اُنھیں لفظوں میں ہم تک پہونچا ہے اور انھیں معنوں میں جو ہم سمجھے ہیں ربانی ہے اور وہ اتنا ہی واضح ولیقینی ہے جتنا کہ ہمارے استدلال کے اصول و قوانین ہیں۔ اسی وجہ سے کوئی ایسی چیز جو استدلال کے واضح و بدیہی نتایج کے مخالف ہو اس کا حق نہیں رکھتی ہے کہ اُسے بطور عقیدہ تسلیم کر لیا جائے۔"

لاک نے عبارت بالا میں جس عنوان سے عقل کی برتری ثابت کی ہے اُسمیں "روایتی الہام" کی عظمت کا پردہ چاک نہیں کیا ہے تاہم اُس نے اُس کی بہت کچھ حد بندی کر دی ہے۔ کاش مذہب کے پرستار اِن خیالات سے اس بات کا اندازہ کرتے کہ ہوا کس رخ سے چل رہی ہے۔ اور دنیا میں کس قسم کے طوفان کا سامان اکٹھا ہو رہا ہے۔

اگر اُس زمانہ کے مذہبی پیشوا سمجھ سے کام لیتے ہوئے مذہب سے رسمی و رواجی چیزیں علیحدہ

کر دیتے اور مذہبی حدود کو غیر متعلقہ مسائل (جیسے زمین کا کروی ہونا یا مسطح ہونا یا اُس کا ساکن ہونا یا متحرک ہونا وغیرہ) کی سرحد سے الگ کر لیتے تو "لامذہبیت" کو یہ فروغ نہ ہوتا۔

تو ائے فکر یہ غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو رہی تھیں کسی فطری مذہب کی فطری اور موافق عقل تعلیمات یورپ کے مفکرین کی دماغی تسلی کر دیتیں اور وہاں کا روحانی افق اتنا تاریک نہ ہونے پاتا لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ مذہبی جماعت کی اکثریت نہایت غیر مفاہمت پسند ہوتی ہے۔ اور اپنے جذباتی فیصلوں کو عقل و دانش کی حکومت سے علیحدہ ہی رکھنا چاہتی ہے۔ چنانچہ یورپ کے مذہبی حلقوں نے ان آثار و علامات سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا اور بدستور اپنے تعصبات و توہمات کی پرستش میں مصروف رہے۔

اُسوقت کا مسیحی یورپ ساحری سے بجید خائف تھا۔ اُس کی نظر میں ٹونے ٹوٹکوں سے دلچسپی رکھنے والی عورتیں شیطان کی ایجنٹ تھیں۔ وہ اُنھیں طرح طرح کی عقوبتوں میں مبتلا کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتا تھا۔ اس نے ساحری کے قلع قمع کے لئے متعدد قانون بنائے عقل اس صورتِ حال کو کیونکر جایز رکھ سکتی تھی۔ اُس نے عیسائیت کے اس طرزِ عمل کے خلاف کوششیں کیں اور ۱۷۳۵ء میں یہ تمام قوانین مسترد ہو گئے لیکن اس کا اثر براہ راست مذہب پر پڑا کیونکہ اُس وقت کے عیسائی ساحرہ عورتوں کے استیصال کو انجیلی حکم سمجھتے تھے۔ اُن کی نظر میں اس حکم کی مخالفت مذہب کی مخالفت تھی۔ اسی بنا پر اُس عصر کے کسی فہمیدہ شخص نے کہا ہے کہ "سحر کا اعتقاد نہ رکھنا انجیل کے منکر ہونے کے مرادف ہے"۔

ہالبس | سترھویں صدی کا ایک مشہور برطانوی مفکر ہالبس ہے۔ یہ بالکل آزاد خیال اور مادی عقائد رکھنے والا شخص تھا۔ اگرچہ حریت خیال کے کسی پرستار کو ضمیر کی آزادی کا دشمن نہ ہونا چاہیئے مگر یہ مفکر "اس آزادی" کا مخالف ہی نہیں بلکہ اُس کے دبانے کے معاملہ میں سخت ترین تشدد کا بھی حامی تھا۔ اُس خصوص میں اس کا نظریہ یہ تھا کہ بادشاہ عقائد میں بھی مطلق العنان حکمراں ہے۔ اور رعیت کا یہ فرض ہے کہ اُسی مذہب کو قبول کرے جو بادشاہ اُس کے لئے پسند کرے۔ چنانچہ اس کے لئے بادشاہ مذہبی تشدد بھی کر سکتا ہے لیکن اُس نے کلیسا کو کوئی حق نہیں دیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ اہل مذہب کی توہم پرستیوں اور سخت گیریوں نے ہالبس کو کلیسا کی طرف سے اتنا بد دل بنا دیا تھا کہ وہ اُس کے اقتدار کی بنیاد گرانے کے لئے اُن نظریوں سے بھی پرہیز نہیں کرنا چاہتا تھا جن میں سرے سے عقلی استحکام موجود ہی نہیں تھا حالانکہ ضمیر کی آزادی کی مخالفت اور

مذہبی عقائد میں بادشاہ کی مطلق العنانی کا مان لینا اُس مرض سے بدتر ہے جس کے علاج کے لئے اُس نے یہ نسخہ تجویز کیا ہے۔

ہابس نے مذہب سے اخلاق کو بھی علیحدہ کر لیا تھا۔ اُس کے خیال کے بموجب فلسفۂ اخلاق صحیح قوانین فطرت کے بالکل مطابق ہے۔

مذہب کے متعلق وہ نہایت بیباکی سے یہ رائے ظاہر کر گیا ہے کہ:۔

"غیر مرئی اشیاء سے جو خیالی خوف انسان پر طاری ہوتا ہے وہی اس جذبہ کی بنیاد ہے جس کو مذہب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جہاں کہیں اس خوف کی نوعیت یا پرستش کا طریقہ مختلف ہوتا ہے تو ہم اسے توہم قرار دیتے ہیں"۔

چارلس دوم کے دور حکومت میں ہابس کی زبان بند کر دی گئی تھی اور اُس کی تمام کتابیں جلا دی گئی تھیں۔

ہابس کے ملحدانہ خیالات کو یورپ میں اُس وقت کے لحاظ سے جو تھوڑی بہت مقبولیت حاصل ہوئی وہ محض اس وجہ سے کہ فہمیدہ و سنجیدہ طبقہ کے لوگ عیسائیوں کی مذہبی سخت گیری، اُن کے مفسدانہ عقائد اور غلط معاشرتی طریقوں سے پریشان ہو چکے تھے۔ شخصی و قومی توہمات اور مقامی رسم و رواج کو مذہب کے لباس میں پیش کرنے ہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مذہب سے بدظن ہو چلے۔

اسپنوزا | اسپنوزا ہالینڈ کا مشہور یہودی النسل فلسفی تھا۔ اُس نے دیکارٹ اور ہابس کے خیالات پوری طرح جذب کر لئے تھے۔ اُس کے فلسفیانہ افکار و رائیں اُس زمانہ کے کٹر مذہبی عقائد سے صریحی بغاوت کے مرادف تھے۔ اُس کے خیالات چونکہ اُس وقت کے انداز فکر سے بالکل علیحدہ تھے اس لئے انھیں کوئی وقتی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ اسپنوزا انسان کے فاعل مختار ہونے کا قائل نہ تھا۔ چنانچہ وہ اس پر زور دیتا تھا کہ انجیل میں بھی دوسری کتابوں کی طرح تاویل کی گنجائش ہے۔

وہ آخری واقعیت (حقیقت نہائیہ) (Ultimate reality.) کو کامل مطلق۔ غیر مادّی۔ غیر شخصی اور ایک ایسی شے قرار دیتا تھا جو تصوّر اور وسعت پذیر استداد در صفتوں سے مرکب ہو۔ اُس کی نگاہ میں یہی شے خدا تھی۔ وہ تمام مسرتیں خدا کی محبّت میں پنہاں سمجھتا تھا۔ اس سے اُس کا منشاء وہ علم اور تصوّر تھا جو معینہ اور غیر اختلاف پذیر قوانین کے ماتحت ہو۔

اسپنوزا کو اُس وقت کے مذہبی حلقوں نے کافر قرار دیا تھا۔ چنانچہ ۱۶۵۶ء کا مشہور تاریخی فتوائے کفر اُس کے خلاف مذہبی جماعت کی انتہائی برہمی کا ثبوت ہے۔ اس فتوے کی عبارت دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"اُن مقدس کتابوں کی موجودگی میں جو ۶۱۳ نصیحتوں پر مشتمل ہیں ہم بروش اسپنوزا کو فرشتوں کے فیصلے اور اولیا کے احکام کے بموجب مرتد قرار دیتے ہیں اور مقاطعہ کرتے اور اُسے اُس خدائی مار کا مستحق سمجھتے ہیں جو یوشع نے جریکو (Jerico.) کے لئے تجویز کی تھی ہم اس پر اس طرح کی لعنت بھیجتے ہیں جو الیاس نے اپنی اولاد پر بھیجی تھی نیز وہ تمام لعنتیں بھیجتے ہیں جو اُس مقدس کتاب میں موجود ہیں۔

خدا اُس پر دن میں لعنت کرے۔ رات میں لعنت کرے۔ اُس وقت لعنت کرے جب وہ اُٹھتا ہے اُس وقت لعنت کرے جبکہ وہ باہر جاتا ہے۔ اُس وقت لعنت کرے جب وہ اندر آتا ہے۔ خدا اُسے کبھی معاف نہ کرے اور ایزدی قہر وغضب اسے ہمیشہ جلاتا رہے اور اُس کے لئے وہ تمام لعنتیں ہوں جو کہ اُس مقدس کتاب میں درج ہیں۔ خدا اُس کا نام مٹادے۔ خدا اُسے اسرائیلی قوم میں سے عذاب کے لئے علیحدہ کرے اور اُس کے لئے وہ تمام عقوبتیں مخصوص کردے جو اس کتاب میں مذکور ہیں۔ کوئی شخص اُس سے کسی قسم کی بات نہ کرے اور نہ اُس پر کسی طرح کی مہربانی دکھائے۔ کوئی شخص اُس کیساتھ ایک مکان میں نہ رہے اور نہ اُس کے قریب آئے"

اس فتوے سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُس وقت کے حامیان مذہب کے خیالات میں تشدد اور سخت گیری کا کتنا زہر سرایت کرچکا تھا لیکن کیا تکفیر کے ان فتووں کی درشتیاں کچھ مفید ثابت ہوئیں۔ کیا لامذہبیت کی بڑھتی ہوئی رو روکی جاسکی؟ کیا اتحاد کے اُڈتے ہوئے بادل ہٹائے جاسکے؟ یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ اس کے بعد مذہب کے خرمن پر غیر معتدل آزاد خیالیوں کی بجلیاں پیہم گرتی رہیں اور مذہبی افکار و معتقدات برابر "انانیت" "لاادریت" کے طوفان میں ڈوبتے رہے۔

اسمیں شک نہیں کہ اسپنوزا کی زندگی ان خیالات کی بدولت عیش میں نہ کٹی اور اُسے برابر مصیبتیں ہی جھیلنا پڑیں لیکن مذہبی جماعت اس سے کوئی مستقل فائدہ نہ اُٹھاسکی۔ عیسائیت نے خدا کی زمین کو اپنے خیال میں اسپنوزا پر تنگ بناکر وقتی حیثیت سے اپنے انتقامی جذبہ کو ضرور تسکین دے لی لیکن اُسوقت کے حالات دیکھتے ہوئے مذہبی حمایت کا جو حقیقی مقتضا ہوسکتا تھا اُس سے کوسوں دور ہٹ گئی۔

رازِ بقا

از مسٹر محمود اسرائیلی

کسی نے فصل گل میں جاکے پوچھا خاک گلشن سے — ہوائے مشک بیز اُڑنے لگی پھر تیرے دامن سے
پھر آئے ابر کے جھونکے تجھے شاداب کرنے کو — گیاہِ سبز اُٹھی پھر بستر کمخواب کرنے کو
ترے دامن سے پھر اٹکھیلیاں کرتی صبا نکلی — شگوفے کے دہن سے ایک دھیمی سی صدا نکلی
درِ شبنم نے پھر اوراقِ گل پر تارے چمکائے — اور ان تاروں میں لاکھوں عکسِ مہر و مہ نظر آئے
فضا میں چہچہے گونجے ہیں تیرے نغمہ خوانوں کے — چُنے جانے لگے شاخوں پہ تنکے آشیانوں کے
عجب حیرت فزا ہے یوں ترا آباد ہو جانا — خزاں آتے ہی پھر پژمردہ و برباد ہو جانا
بنا ہے حسن کیا دنیا میں یوں مٹنے مٹانے کو — یہ کیا اک محض دھوکا ہے ہمیں احمق بنانے کو
یہ سُن کر گوشۂ گلشن سے دھیمی سی صدا آئی — کہ نو وارد ہے تو اے بزمِ قدرت کے تماشائی
نہیں دیکھا ہے اس عبرت کدے کو بے خبر تو نے — نہیں کی ہے یہاں کے ذرہ ذرہ پر نظر تو نے

بقا ہستی کی پوشیدہ ہے اس مٹنے مٹانے میں
کہ آئینِ تغیّر کارفرما ہے زمانے میں

دورِ جدید

(جناب بسمل الہ آبادی)

کہیں تحسین کا نعرہ کہیں تحسین کا جوش — کہیں اخبار کا غل اور مضامین کا جوش
ہوگئی غرقِ فنا کشتیِ مذہب بسمل — قعرِ دریا میں نہیں ہے تو فقط دین کا جوش

مجھے اپنی جگہ سے خود بخود ہلنا ہی پڑتا ہے — نہیں ملنے کو دل کہتا مگر ملنا ہی پڑتا ہے
کیا مجبور فطرت کی طرح پھولوں نے اے بسمل — مجھے گلزارِ دنیا میں کبھی کھلنا ہی پڑتا ہے

سائینس اور شاعری

(از سید ظہیر الدین احمد علوی جون پوری ۔ بی اے ۔ ایل ایل بی)

موجودہ صدی میں جو سائینس کی اعلیٰ ترین ترقی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعری کیا اور اس کے اثرات کیا ہیں ۔ آجکل ہر سائینس داں اپنے تجربات سے ایک ایک نیا کرشمہ دکھاتا ہے مثلاً ہیئت داں اپنے حدبی آئینوں اور دوربینوں سے پاتال کی سیر کراتا ہے اور تعجب نہیں کہ وہ کرۂ ارض کو مریخ سے ملا دے ۔ علم کیمیا کا ماہر اپنی شیشیوں اور تیزابوں سے فضا کو طرح طرح کی خوشبو سے مہکا رہا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ عنقریب وہ معمولی سے معمولی دہات یہانتک کہ مٹی کو بھی سونا بنا دیگا ۔

طبیعات کے ماہر نے فضا کے ذرّوں کے ہیجان اور برقی قوت سے ہزارہا میل کے لکچر ۔ افسانے اور گانے آپکو ریڈیو کے ذریعہ سے گھر بیٹھے سنا دئے ۔ بجلی کو جو ابتک آسمانی شئے سمجھی جاتی تھی آپ کا غلام بنا دیا ۔ جاروب کشی سے لیکر بڑے سے بڑا کام اس سے لیا جاتا ہے تخت سلیمان کی پرواز جو ابتک افسانہ سمجھی جاتی تھی اب روزمرہ ہوائی جہاز کی شکل میں دکھائی دے رہی ہے ان سائنسدانوں کے مقابلہ میں ایک طرف ہمارا غریب شاعر بھی اپنے خیال میں غرق ہے ۔ یہ سوال کہ شاعری کیا ہے اور اس کے اثرات کیا ہیں ؟ کوئی جدید سوال نہیں بلکہ رفتار زمانہ کے ساتھ یہ سوال اکثر پیدا ہوا اور اس کا جواب دیا گیا چنانچہ اسی سوال کے جواب میں سر فلپ سڈنی نے ایک کتاب (Defence of poetry) لکھی پھر انیسویں صدی میں انگریزی شاعر شیلی نے اس سوال کا جواب دیا ۔ اب تیسری بار پھر موجودہ صدی میں یہ سوال پیش کیا جا رہا ہے مخالفین شاعری کا دعویٰ ہے کہ دنیا کو اس وقت کار آمد اور کارکن افراد کی ضرورت ہے اور طبقۂ شعراء چونکہ بالکل بیکار محض اور ناکارہ ہوتا ہے اسوجہ سے اس کا وجود ہی دنیا کے لئے گراں ہے کیونکہ یہ جو کچھ کرتے ہیں وہ دنیا کے لئے بیکار ہوتا ہے ۔

ایسے شدید الزامات لگائے جانے پر ضروری معلوم ہوا کہ ان الزامات کا جواب دیا جائے

اب تک جو جوابات دئے گئے وہ مدافعانہ تھے۔ یہ ثابت کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی کہ شاعری بھی ایک سائینس ہے۔ اس مضمون میں فن شاعری پر سائینس کے نقطۂ نظر سے نظر ڈالی جارہی ہے اس لئے ممکن ہے کہ شعرا کے نزدیک بعض اصول میں اختلاف ہوجائے۔

شاعری کی تعریف اندرونی جذبات اور تخیلات کو جو ذہن میں غیر محسوس ہوں الفاظ میں ظاہر کرنا شاعری ہے اور اندرونی جذبات اور تخیلات کو جو ذہن میں محسوس طریقہ پر ہوں الفاظ میں ادا کرنے کو نثاری یا نثر نگاری کہتے ہیں۔ نثاری کے لئے دلیل اور شاعری کے لئے تخئیل ضروری ہے اور تخیلات الفاظ کے واسطے سے ہم تک پہونچتے ہیں۔ آواز خیالات اور جذبات کو ظاہر کرتی ہے اور الفاظ سے پیدا ہوتی ہے اور یہی طریقہ ہے جس سے شاعری میں غیر محسوس اشیاء کا تصور ذہن میں آتا ہے جب الفاظ کے ذریعہ سے ادا کیا جاتا ہے۔ لہذا اگر اس نقطۂ نظر سے شاعری کو دیکھا جائے تو دیگر سائنس کے برخلاف شاعری ایسی اشیاء کا پتہ دیتی ہے جو عالم میں غیر محسوس رہی ہوں اور اسلئے شاعری کسی طرح دیگر سائنس سے کم نہیں۔

اس دعوی کے ثبوت میں مختلف شعرا کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ دکھایا جائے گا۔ کہ واقعی شاعری کیا ہے اور اس نے کیا کیا۔

شاعری اندرونی جذبات کو خواہ وہ سوسائٹی کے نقطۂ نظر سے کیسے ہی ہوں بلا تکلف ظاہر کر دیتی ہے۔ ایک جلیل القدر صوفی حضرت عثمانؒ ہارونی کی غزل کا مطلع ہے:۔

نمی دانم کہ چوں آخر دم دیدار می رقصم
مگر نازم بریں ذوقے کہ پیش یار می رقصم

ملاحظہ فرمائیے کہ رقص کی خواہش سوسائٹی کے مذاق اور آداب مجلس کے خیال سے چاہے جسقدر گری ہوئی چیز ہو اور معشوق کے سامنے ناچنا رواج زمانہ کے لحاظ سے چاہے جتنا رکیک ہو لیکن اس شعر میں کسقدر پر لطف پیرایہ میں شاعر نے اس خواہش کو بدرجہ اتم پورا کرلیا ہے۔ معشوق کی دید پر یہ جذبہ بے اختیارو بیخودی کا پیدا ہوجانا بالکل قدرت کے مطابق ہے۔

دوسری مثال مسلمانوں کے نزدیک خانۂ کعبہ سے زیادہ عزت کسی گھر کی نہیں ہوسکتی، لیکن احترام کعبہ کا خیال رکھتے ہوئے صنم خانہ یا دیر کے متعلق حضرت امیر مینائی نے یہ شعر لکھا ہے:۔

دیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخ حرم
آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بتخانہ تھا

تیسری مثال | شاہ بخارا بغرض تفریح ہرات تشریف لے گئے اور وہاں کے گوناگوں مشاغل اور دلچسپیوں میں ایسے منہمک ہوئے کہ مسلسل تین سال تک وہیں مقیم رہے اور بخارا کی واپسی کا ارادہ بھی نہ کیا۔ اہالیانِ بخارا شاہ کی عدم موجودگی سے سخت پریشان تھے کیونکہ جملہ احکام سلطنت شاہ کے نہ ہونے کی وجہ سے ملتوی تھے یہانتک کہ خزانہ سے ایک حبّہ بھی نکالا نہ جاسکتا تھا اور تنخواہ کی تقسیم موقوف تھی یہانتک کہ اکثر لوگوں کو فاقہ کشی کی نوبت پہونچگئی تھی۔ شاہان مشرق کے رعب و دبدبہ کی وجہ سے کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ شاہ سے واپسی وطن کے لئے کہہ سکے چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے وزراء و امراء نے رودکی کو پانچہزار اشرفی دیکر روانہ کیا کہ جس طرح سے ہوسکے وہ شاہ کو وطن واپس لے آئے۔ خیال فرمائیے کہ اتنے اہم کام کے لئے ایک غریب شاعر دونوں آنکھوں سے اندھا چند اشعار اور اپنا سرود بطور آلہ مدافعت لیکر ہرات پہونچا اور شاہ کے دربار میں مجرا عرض کرنیکے بعد سرود پر اشعار ذیل گانے لگا:-

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی | یاد یار مہرباں آید ہمی
ریگ آمو با درشتی ہائے او | زیر پایم پرنیاں آید ہمی
آب جیحوں باہمہ پہناوری | خنگ مارا تامیاں آید ہمی
اے بخارا شاد باش و شاد زی | شاہ سویت میہماں آید ہمی
شاہ ماہ است و بخارا آسماں | ماہ سوئے آسماں آید ہمی
شاہ سرو است و بخارا بوستاں | سرو سوئے بوستاں آید ہمی

تمام درباری اور امراء وزراء منتظر تھے کہ دیکھئے آج رودکی کا کیا حشر ہوتا ہے مگر رودکی اپنے جذبات میں مستغرق نغمہ زن تھا۔

وہ آخری شعر پر پہونچا ہی تھا کہ شاہ بے اختیار ہو کر تخت سے اُترا اور دربان کا گھوڑا لیکر برہنہ پا سوار ہو کر نہایت عجلت سے بخارا کی طرف روانہ ہوگیا اور راستے میں کہیں قیام کئے بغیر بخارا آکر ہی گھوڑا روکا۔ تھوڑی دیر کے لئے اپنے ذہن میں اس واقعہ کا نقشہ کھینچیے کہ شاہ بخارا برہنہ پا دربان کے گھوڑے پر سوار نہایت تیز رفتار سے بخارا کی طرف رواں ہے اور اس کے پیچھے تمام وزراء و افواج ایک غیر منظم حالت میں جا رہے ہیں۔ کیا صرف یہی مثال شاعری کے تاثرات کو ظاہر کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟۔ رودکی اندھا ہونے کی وجہ سے شاہ کے اُن جذبات کا اندازہ جو چہرے کے رنگ سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ نہیں کر سکتا لیکن اس کا طریقہ ادا اور طرز بیان اُصول پر مبنی ہیں اور اُصول

اپنا کام کرجاتے ہیں۔ا

اُسے یہ معلوم ہے کہ شاہ کے دل میں حب وطن ضرور ہے لیکن اُس محبت پر ہرآت کی دلچسپیوں نے قبضہ کرلیا ہے۔ اس لئے اس نے اپنے اشعار میں پہلے وطن کی مختلف اشیا رکی یاد دلائی ہے اور پھر سفر بخارا کی ترغیب دی ہے۔ پہلے مصرعہ میں اس نے "جوئے مولیاں" کا ذکر کیا اور مصرعہ ثانی میں ایک "یار مہربان" کا ذکر ہے واللہ اعلم یہ یار مہربان کون تھا اور شاہ پر اسکی یاد سے کیا کیفیت طاری ہوئی۔ دوسرے شعر میں وہ نہایت ہوشیاری کیساتھ بخارا وہرآت کا مقابلہ کرتا ہے اور کہتا ہے۔ کہ اس "یار مہربان" کی یاد کی وجہ سے دریائے آمو کی ریگ باوجود سختی کے مخمل اور ریشم کے مانند معلوم ہوتی ہے۔ تیسرے شعر میں دریائے جیحوں کی تعریف کرتا ہے اور پھر چوتھے شعر میں بخارا کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "اے بخارا خوش ہو کہ شاہ تیری طرف آرہا ہے"۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ شاعر نے شاہ کو مخاطب نہیں کیا اس لئے کہ شاید تخاطب سے شاہ کا مزاج برہم ہوجائے۔ آخر کے دو اشعار میں شاعر نے انہیں تشبیہات کو قایم رکھا ہے۔ چنانچہ شاہ اس بات کا اندازہ نہ کرسکا۔ کہ رودکی اس امر کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ کہ شاہ کو وطن واپس لے آئے۔

اس مثال سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے۔ کہ کاربرآری کے لئے اگر شاعر کو ذریعہ ٹھہرایا جائے تو کام ضرور پورا ہوگا۔ اس قسم کی مثالیں ہر زبان اور ہر ملک میں مل سکتی ہیں۔ عرب کے قافلے جب سفر شروع کرتے تھے تو اُن میں سے ایک شخص اشعار گانے پر مامور رہتا تھا جس سے ان کے اونٹ اپنی معمولی رفتار سے زیادہ تیز چلنے لگتے تھے۔ جنگ کے موقعہ پر رجز خوانی سے لشکر میں ہمت۔ شجاعت اور قوت پیدا ہوجاتی تھی۔ انگریزی زبان میں بھی ایسی بہت سی نظمیں موجود ہیں جن کے اثر نے عالم کو تہ وبالا کردیا مثلاً بائرن کی نظم نے یونانیوں کو چند لمحوں میں شہر بدر کرا دیا اور لانگ فیلو کی نظم نے بردہ فروشی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

دور کیوں جائیے ہندوستان ہی میں ایسے شاعر اب تک حیات ہیں جنکی نظمیں اس قسم کے جذبات سے پُر ہیں۔ ہندوستان کی زیادہ تر آبادی غریب ہے۔ ایسی صورت میں کسی قومی کام کے لئے کسی کثیر رقم کا جمع کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی مجمع میں اقبال، عزیز یا صفی کی ایک نظم جو اسی عنوان پر لکھی گئی ہو پڑھی جائے تو سامعین اپنی عسرت کے باوجود اس سے متاثر ہوجاتے ہیں اور اپنی جیب خالی کئے بغیر نہیں رہتے۔ اور اگر کوئی شاعر مطلوبہ تاثرات پیدا نہیں کرسکتا تو یہ

اس کی عدم واقفیت اور ناقابلیت کی دلیل ہے۔ فن شاعری پر کوئی دھبّہ نہیں آتا۔

سائنس دانوں کو اس بات کا بھی غرّہ ہے کہ وہ مستقبل کے حالات پر صحیح پیشین گوئی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں لیکن کیا بہت سی پیشین گوئیاں غلط نہیں ثابت ہوئیں۔ کیا منجموں نے یہ پیشین گوئی نہیں کی تھی کہ کرۂ ارض اَب بہت جلد ٹکرا کر پاش پاش ہو جانے والا ہے کیا ماہر اقتصادیات نے پیشین گوئی نہیں کی تھی کہ دنیا کی آبادی کا تناسب اشیاء خوردنی سے اتنا زیادہ ہوتا جاتا ہے کہ عالم میں عنقریب ایک سخت قحط پڑے گا۔ مگر باوجود ان پیش گوئیوں کے بھی دنیا بدستور قائم ہے اور اس کی دلچسپیاں روز بروز ترقی کرتی چلی جاتی ہیں۔ کیا یہ پیش گوئیاں غلط ثابت نہیں ہوئیں لیکن شاعر کی پیش گوئی کبھی غلط نہیں ثابت ہوتی۔ شاعر کہتا ہے ؎

بجرم عشق توام می کشند غوغائیست

تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

کیا آپ کوئی عاشق صادق ایسا تبلا سکتے ہیں جو جرم عشق میں قتل کیا جائے اور اُس کی یہ خواہش نہ ہو کہ اس کا معشوق اس کے قتل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

انگلستان کے مشہور شاعر شیلی نے اپنی موت کے متعلق اس طرح پیشین گوئی کی تھی۔

پانی اور ہوا کے مانند ناامیدی بھی سرد پڑ گئی ہے۔ کاش میں ایک واماندہ بچے کی طرح لیٹ کر اپنے زندگی کے تفکرات* مجھ پر نیند کی طرح غالب آجاتی اور میرے رخسار سرد ہو جاتے اور سمندر اپنی لہروں کے ذریعہ سے میرے مردہ کانوں میں اپنا نغمہ کہتا۔

* کو چھوڑ کر [illegible]

چنانچہ ۱۸۸۲ء میں شیلی کا انتقال غرقابی سے ہوا اور اس کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ اہل روم شاعر کو پیغمبر کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ کوئی سائنس داں کسی شخص کے انتقال کے متعلق اسقدر صحیح پیشین گوئی نہ کر سکے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ تمام موجودات کا اظہار شاعری کے ذریعہ سے ہوا تو یہ کوئی عجیب کلیہ نہ ہوگا کیونکہ ہر شے جو اس وقت عالم وجود میں ہے پہلے حقیقت میں ایک غیر محسوس شکل میں تھی اور اب ظاہر ہو کر وجود میں آگئی اور یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ شاعری غیر محسوس اشیاء کو جو ذہن میں ہوں الفاظ کا جامہ پہنا کر ظاہر کر دیتی ہے اس طور سے یہ کلیہ درست ہو جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر سائنس داں درحقیقت ایک شاعر ٹھہرتا ہے کیونکہ سائنس داں بھی تخیلات کے زور سے اُس شے کو جو کبھی اس کے ذہن میں غیر محسوس تھی معلوم کرتا ہے اُس کے بعد جب

وہ الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہے اور کافی چھان بین ہو جاتی ہے تب وہ قوانین منضبط ہو کر ایک نظریہ ... (Theory) کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس طور پر بہ آسانی کہا جاسکتا ہے کہ علم سائینس شاعری کا نتیجہ مابعد ہے۔ مثال کے طور پر نیوٹن کے قانون کشش کو پیش کرتا ہوں اگر نیوٹن نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہوتا جو اس قانون کے سب سے پہلے اس کے ذہن میں آئے تھے تو وہ حقیقی معنوں میں شاعری ہوتی۔ جذبہ کشش سب سے پہلے شاعر کے ذہن میں آیا۔ کیونکہ ذہن انسانی میں یہ واسطہ سب سے پہلے عاشق و معشوق کے درمیان پیدا ہوا اور وہ شے جو عاشق کے دل میں معشوق کی یاد سے پیدا ہوئی۔ کشش ٹھہری۔ یہ کشش خفی یا باطنی تھی اس کے بعد شمع و پروانہ کی صورت میں ظاہر ہوئی جسے اہل دنیا روزانہ دیکھتے ہیں اب سائینس داں نے اس کشش کو مقناطیس سے تعبیر کیا اور رفتہ رفتہ قانون کے شکل میں منضبط کر دیا۔ چنانچہ یہ کلیہ پورے طور سے ثابت ہو گیا کہ شاعری بمنزلہ تخم ہے اور سائنس داں اس کشت زار سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔

مولانا روم کا قول صحیح ہے :-

"شاعری جزو لیست از پیغمبری"

بلکہ میں یہانتک کہوں گا کہ شاعری وہ شے ہے جو روز ازل لفظ "کن فیکون" میں پنہاں تھی۔

انگڑائی

(از حضرت بیتاب بریلوی)

آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا تھا تماشائی نے
خیر اچھا کیا پاس غم رسوائی نے

دیکھنا کیا کہیں گلشن میں بہار آئی ہے
پاؤں پھر دشت میں پھیلائے ہیں سودائی نے

خود نمائی بھی حسینوں کی ادا ہوتی ہے
آگ کچھ اور لگا دی میری رسوائی نے

ہجر کی رات قیامت سے سوا ہوتی ہے
پیچ کاکل کی طرح کھائے ہیں سودائی نے

آپ کا نام شب ہجر نکل ہی جاتا
رکھ لیا خیر سے پردہ مری رسوائی نے

حسن خود بین کبھی پردے میں چھپائے نہ چھپا
رکھ دیئے بند قبا توڑ کر کے انگڑائی نے

تم مجھے بھول جاؤگے

از جناب پنڈت انند نرائن ملا صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی،

(۱)

تم مجھے بھول جاؤگے

رہ نہ سکے گا عمر بھر، آج کا جوشِ اضطراب
آرزوؤں میں آئیگا کوئی ضرور انقلاب
پھر کوئی دوست ڈھونڈھ لے گی نگاہِ انتخاب
زیست ہے زیست، دل ہے دل، اور شباب پھر شباب
عہد وفا ہے ایک خواب
تم مجھے بھول جاؤگے

(۲)

تم مجھے بھول جاؤگے

جس کی تجلیوں سے تھی بزمِ امید حشر خیز
جس کے تبسّموں سے تھا، سازِ حیات نغمہ ریز
جس کے نفس نفس سے تھی محفلِ دوش مشک بیز
رکھ کے کہو جگر پہ ہاتھ، آج بھی ہے وہی عزیز
وقت ہے کچھ عجب چیز
تم مجھے بھول جاؤگے

(۳)

تم مجھے بھول جاؤگے

رسم جہاں ہے انقلاب، دور کا نام کائنات

دم کوئی لے سکے کہیں، اتنا سکوں بھی دے حیات
آرزوؤں کی دل میں ہے، ایک سجی ہوئی برات
ایک نگاہ، ایک امنگ، ایک امنگ، ایک رات
ہستیٔ عشق بے ثبات
تم مجھے بھول جاؤ گے

(۴)

تم مجھے بھول جاؤ گے

کوئی کسی کی یاد میں حشر تلک جیا نہیں
تیرِ نظر کی چوٹ سے کوئی کبھی مرا نہیں
نِکلے کھرنڈ کونسا داغِ جگر اُڑا نہیں
سنگِ لحد کو توڑ کر سبزہ کہاں اُگا نہیں
غم کوئی لا دوا نہیں
تم مجھے بھول جاؤ گے

(۵)

تم مجھے بھول جاؤ گے

پھر سے نگار خانۂ شوق کو تم سجاؤ گے
پھر کسی بت کے واسطے فرشِ نظر بچھاؤ گے
آج کی بات کو کبھی خواب میں بھی نہ لاؤ گے
نام مرا اگر کوئی لے گا، تو مُسکراؤ گے
تم مجھے بھول جاؤ گے
تم مجھے بھول جاؤ گے

علّامہ نیّر کاکوروی مرحوم

از مولوی شبیر احمد ناظر کاکوروی بی۔ اے

علم سے آج ہوگئی تفریق
نیّر علم وفضل ڈوب گیا

تخرجہ ۱۳۵۹ھ یعنی ۱۳۵۵ھ ناظر

سید نور الحسن علوی نیّر (ضیائے چشم حسن تاریخ ولادت) مولینا محسن کاکوروی کے خلفِ اکبر تھے۔ متعدد واسطوں سے انکا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ پر ختم ہوتا ہے۔ آپ حنفی المذہب اور قادری مشرب تھے۔ حضرت مولانا شاہ تقی علی قلندر سجادہ نشین آستانۂ کاظمیہ قلندریہ کاکوری سے بیعت تھی اپنے والد ماجد سے تعلیم وتربیت حاصل کی۔ انگریزی میں ۱۸۹۳ء میں بی۔ اے ہوئے اور ۱۸۹۷ء میں ایل ایل بی پاس کیا مین پوری میں وکالت کرتے رہے پھر ہردوئی چلے آئے۔ ۱۹۱۰ء میں خانہ کعبہ میں جبیں سائی کا شوق پیدا ہوا اور وکالت چھوڑ کر دیار حبیب کو چل کھڑے ہوئے واپسی کے بعد خانہ نشینی اختیار کرلی۔

ان کی موت قصبہ کاکوری ورکنار صوبہ کے ادبی قحط الرجال سے تعبیر کیجا سکتی ہے۔ افسوس پُرانے زمانے کے یادگار لوگ ایک ایک کرکے ہم سے جدا ہوتے جاتے ہیں اور علم وفضل اور قدیم تہذیب کے وہ نادر و بے نظیر نمونے جو صرف موجودہ بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی شمع ہدایت ہوسکتے ہیں رفتہ رفتہ اُٹھ رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دنیا کی بزم ادب بھی ختم نہ ہوگی لیکن حال کی بساط سے جو مہرے ہٹ گئے ہیں وہ پھر نہیں جم سکتے۔

مولوی نور الحسن کی ذات والاصفات بجائے خود ایک مستقل انجمن تھی جہاں بیٹھ جاتے تھے ناممکن تھا کہ ادبی ذوق پیدا نہ ہوجائے نہایت درجہ منکسر مزاج خوش اخلاق، بامروت و قابل قدر بزرگ تھے۔ ان کی زندگی قدیم تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ ان کی طبیعت مرنجاں مرنج تھی جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

انکی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ نور اللغات کی تدوین ہے۔ یوں تو اُردو کے بہت سے

لغات لکھے گئے اور لکھے جاویں گے لیکن جس محنت سے آپ نے اس اہم علمی خدمت کو انجام دیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا نیز آپ نے ۱۹۱۱ء کے بعد وکالت ترک کر کے نور اللغات کا دفتر قائم کیا اور بغیر کسی بیرونی امداد کے محض خدا کے بھروسہ پر اس کی اشاعت شروع کر دی۔ ملک نے خاطر خواہ قدر کی اور یوپی گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم نے کچھ رقم بطور انعام عطا کی اس قسم کی مالی امداد ڈاکٹر شمس العلما نذیر احمد کے بعد آپ کے سوا کسی دوسرے مصنف کو نہیں ملی[1] اور نور اللغات کی تالیف و ترتیب میں غیر معمولی انہماک کا اثر تھا کہ علامہ نیرؔ کی صحت روز بروز خراب ہونے لگی علاج معالجہ ہوا مگر کوئی نفع نہیں ہوا اور انجام وہی ہوا جو انسان فانی کا ہوتا ہے یعنی آج علامہ نیرؔ ہم سے دور کسی دوسری دنیا میں ہیں۔

مولانا کو قومی مذہبی معاملات میں ہمیشہ شغف رہتا تھا لیکن تعصب سے آپ کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ہندو سنیاسیوں سے ملنے کا بہت شوق تھا۔چنانچہ اکثر سادھو سنیاسی ان کے پاس آیا کرتے تھے اور وہ ان کی بڑی آؤ بھگت کیا کرتے تھے یوں بھی فقرا کی خدمت میں اُن کو بہت خلوص تھا اور جب تک اُن کے قویٰ کام دیتے رہے تکیہ شریف کاظمیہ کی تقریبوں میں بھی غیر حاضر نہیں ہوئے۔

ہردوئی کی انجمن اسلامیہ میں علامہ نیرؔ ہی نے روح پھونکی اور عرصہ تک عیدین کی نماز خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔ پہلے مین پوری میں بھی عیدین کی نماز پڑھانے جاتے تھے۔ دراصل علوم دینی سے جسقدر آپکو واقفیت تھی بہت ہی کم گرگجوٹیوں کو ہوگی۔لکھنؤ کے زمانہ قیام میں آپ ایک خاص سیاہ رنگ کی عبا پہنکر روشن الدولہ کی مسجد میں ہر جمعہ کو امامت کرتے تھے۔شاید اسی وجہ سے وہ ہمیشہ اور ہر جگہ مولوی صاحب ہی کے نام سے مشہور رہے۔

حکام لکھنؤ کے اصرار سے عرصہ تک انھوں نے آنریری اسسٹنٹ کلکٹری کے فرائض بھی بحسن و خوبی انجام دیئے جس قابلیت سے آپ مقدمات فیصل کرتے تھے اس کا اعتراف حکام ضلع برابر کرتے رہتے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد خرابی صحت کی وجہ سے آپ نے اس اعزازی خدمت سے علیحدگی اختیار کی۔جب تک صحت اچھی رہی علمی و ادبی مجالس میں شوق سے شریک ہوتے تھے اور اپنے بیش بہا خیالات و تاثرات سے نوجوانان وطن کی رہنمائی فرماتے تھے آپ کا مذاق علمی بہت ستھرا تھا اور نظم و نثر دونوں میں یکساں ید طولیٰ حاصل تھا۔شاعری کا شوق اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد ہوا مگر اس میں بھی آپ نے جلد ہی اساتذہ کا درجہ حاصل کر لیا۔چنانچہ آپ کی نظم خورشید بدر بہت مقبول ہوئی۔

[1] یہ امداد درحقیقت سرولیم میرس گورنر صوبہ کی علم دوستی کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔مولانا نیرؔ کی اس اہم خدمت اور مالی امداد کی ضرورت پر ایڈیٹر زمانہ نے سر ممدوح کی توجہ مبذول کرائی تھی۔

لکھنؤ کے زمانہ قیام میں آپ نے ادیب اُردو نامی ایک اُردو رسالہ بھی جاری کیا جو عرصہ تک شائع ہوتا رہا لیکن بالآخر ملک کی ناقدری کی وجہ سے بند ہوگیا۔ علامہ نیرؔ نے اودھ پنچ کا بھی انتخاب کیا تھا وہ نشترؔ کے فرضی نام سے ادیب اردو میں شائع ہوتا رہا اور نفسۃ اللغات وتعلیلات منظوم بھی اسی دور کی کتابیں ہیں۔

آپ نے کاکوری میں ایک انجمن اخوان الصفا کے نام سے قائم کی تھی جس میں بھی شعر وسخن کے اجتماعات محض آپ ہی کی ذات اقدس سے متعلق تھے۔ ہردوئی وسندیلہ کے مشاعروں میں بھی علامہ نیرؔ ہی پیش پیش رہا کرتے تھے۔

دسمبر ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کیساتھ آل انڈیا اُردو کانفرنس بھی دہلی میں منعقد ہوئی تھی اس کی صدارت کے لئے مولانا نیرؔ ہی منتخب ہوئے تھے۔ آپ نے ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں جو خطبۂ صدارت تیار کر کے اسمیں ارشاد فرمایا تھا وہ سہیل میں طبع ہوکر بہت مشہور ہوا تھا اور دہلی وپنجاب کے اخبارات نے اس خطبہ کی بہت تعریف کی تھی۔

گورنمنٹ صوبہ متحدہ نے جو ہندوستانی اکیڈمی قائم کی اس کے اولین ممبروں میں مولانا نامزد ہوئے تھے انجمن اُردو۔ اُردو اکیڈیمی۔ مسلم اکیڈمی اور انجمن تنظیم اُردو وغیرہ لکھنؤ کی تمام ادبی انجمنوں سے مولانا کو یکساں تعلق تھا۔ انجمن ترقی اُردو دکن کے بھی آپ رکن تھے۔

علامہ نیرؔ ہمیشہ علی الصباح ساڑھے تین بجے بیدار ہوتے تھے۔ تہجد کی نماز کے بعد سے کلام پاک کی تلاوت شروع کردیتے تھے اور جسقدر اعمال واذکار پڑھنا ہوتے تھے سب صبح کی نماز کے قبل ہی ختم کردیتے تھے صبح کی نماز کے بعد چہل قدمی کے لئے نکل جاتے تھے اور اسی حالت میں حزب البحر وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ حزب البحر کے عامل تھے اور متعدد خانوادوں سے ان کو اس کی اجازت تھی۔

آپکو دواسازی کا بھی بہت شوق تھا۔ ہر سال مختلف قسم کی دوائیں تیار کر کے بے تکلف احباب میں تقسیم کردیا کرتے تھے۔ باغبانی کا بھی شوق رکھتے تھے چنانچہ آخر عمر میں آپ نے جو جدید مکان بنایا اسمیں ایک نفیس باغ لگایا جس کے پھل خصوصیت کیساتھ احباب واعزہ میں تقسیم کرتے تھے۔ انکی خدمت میں کچھ طلبا درس وتدریس کے لئے ہمیشہ موجود رہتے تھے چنانچہ یہ سب ان فوائد سے مستفید ہوا کرتے تھے۔ تعلیم کے وقت علامہ نیرؔ کو کبھی کبھی غصہ بھی آجاتا تھا لیکن وہ فوراً دور بھی ہوجاتا تھا۔ اور پھر طبیعت میں اس کا کوئی اثر باقی نہ رہتا تھا۔

علامہ نیرؔ کی ذات سے کبھی کسی شخص کو خواب و خیال میں بھی کوئی نقصان نہیں پہونچا۔

نواب صاحب مانگرول کو علامہ نیرؔ سے بہت خلوص تھا چنانچہ وہ ہر سال کوئی نہ کوئی تحفہ ان کو ضرور بھیجا کرتے تھے۔ نواب صاحب بڑے اصرار کیساتھ انھیں۔ مانگرول آنے کی دعوت بھی دیتے تھے لیکن مولانا وہاں تشریف نہ لیجا سکے۔ اب جب مولانا ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ اُمید ہے کہ نواب صاحب ممدوح ان کے پسماندہ اعزا و اقربا پر عنایت و توجہ قایم رکھیں گے اور کم از کم نور اللغات کے ضمیمہ کی اشاعت کا انتظام فرمائیں گے جسکو مولانا اپنی حیات کا آخری کارنامہ سمجھے تھے مگر جسے افسوس وہ تکمیل تک نہ پہنچا نہ سکے۔

علامہ نیرؔ کو اپنے وطن کاکوری کے نوجوانوں کی فلاح و بہبودی سے غیر معمولی دلچسپی تھی چنانچہ کاکوری میں جسقدر مدارس ہیں آپ تقریباً اُن سب کے یا تو صدر یا مجلس شوریٰ کے رکن خاص تھے۔ اُردو کے مشہور ادیب منشی امیر احمد صاحب علوی کی تعلیم و تربیت میں آپکو بہت بڑا دخل تھا۔ منشی صاحب انکی حقیقی بہن کے صاحبزادہ ہیں لیکن انکی ہمشیرہ نے بچپن ہی سے موصوف کو علامہ نیرؔ کے مبارک قدموں میں ڈال دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی انھیں اپنی اولاد سے زیادہ سمجھا دورِ حاضرہ کے اُردو نثر نگاروں میں جو امتیازی درجہ منشی صاحب موصوف کو حاصل ہے بلاشبہ وہ علامہ نیرؔ ہی کے فیض صحبت کی بدولت ہی۔

مولانا مرحوم خادمانِ ادب کی بڑی قدر کرتے تھے چنانچہ نگم صاحب کی بڑی قدر کرتے تھے اور بے چینی سے زمانہ کا انتظار کیا کرتے تھے۔ ان کا سب سے آخری مضمون ۱۹۳۵ء میں رسالہ نگار میں اُردو شاعری پر شائع ہوا یہ مضمون اُنھوں نے محض یادداشت سے لکھا یا تھا اُن کا حافظہ اس درجہ قوی تھا کہ وہ کتابوں کے حوالہ بے تکلف پیش کر دیتے تھے۔ اُن کے ذاتی کتبخانہ میں کم از کم دس ہزار کتابیں ہوں گی تقریباً ہر کتاب پر ان کے نشانات اور نوٹ موجود ہیں۔

دورِ آخر میں لکھنؤ میں نیا گاؤں میں قیام تھا چنانچہ یہیں آپ کے ادبی احباب کا مجمع رہتا تھا آسی صاحب نیاز صاحب امین صاحب وصل صاحب شوکت صاحب۔ واقف صاحب راقم الحروف اور متعدد دیگر حضرات اس منبع ادب سے فیضیاب ہوا کرتے تھے۔

وکالت کی وجہ سے آپ کو قانونی مسائل کے حل میں بھی خاص دخل ہو گیا تھا۔ لکھنؤ چیف کورٹ کی وکالت کے دوران میں آپ نے اودھ ڈائجسٹ شائع کیا وفات سے چند ہی دن قبل بھی اودھ کا ساٹھ سالہ ڈائجسٹ شائع کیا۔ البتہ غزلیات کا مجموعہ ابھی تک شائع نہیں

ہوسکا یہاں پر تذکرہ مشاہیر سے آپ کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

ہماری آہ کی لازم رسائی تھی دو عالم میں
کہیں ناقوس بن جاتی کہیں تکبیر ہو جاتی

بلا سے گر کمی کرتی ہیں آنکھیں رونے دھونے میں
تری موجوں سے کیا اے دل سمندر ہو نہیں سکتا

تسلی خاک ہو نیرؔ کو تصویر خیالی سے
شبیہ گل میں اندازِ گلِ تر ہو نہیں سکتا

ہم سے نہیں غیروں سے لڑاتے رہیں آنکھیں
تم تیر لگاتے ہو جہاں دل نہیں ہوتا

دنیا و دیں سے گزرے تو پہونچے ہیں تیرے پاس
کرنا پڑی ہے راہ میں منزل جگہ جگہ

نیرؔ سے کیوں کرے کوئی قسمت کی بات چیت
ملتے ہیں مفت ٹوٹے ہوئے دل جگہ جگہ

جس کی رگ رگ میں کھٹک ہو وہ بتائے کیونکر
درد دل ہے کہ نہیں درد جگر ہے کہ نہیں

ناتوانوں کی یہ صورت ترے کوچہ میں رہی
درد کی طرح اُٹھے گر پڑے شبنم ہو کر

پچھلے تین چار سال سے علالت کا سلسلہ برابر قایم رہا۔ حواس آخر وقت تک قایم رہا۔ نماز کسی وقت کی بھی قضا نہ ہوئی۔ انتقال سے دو دن قبل خواب سے بیدار ہوئے تو فرمایا کہ مجھکو جامع مسجد میں غسل دینا چاہیئے اور مولوی مصطفٰے احسن علوی ایم۔ اے استاد علوم شرقیہ لکھنؤ یونیورسٹی جنازہ کی نماز پڑھائیں اسی وقت سے اللہ ہو زبان پر جاری ہوگیا۔ سکرات کی تکلیف بالکل معلوم نہ ہوئی اور ساڑھے نو بجے طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ افسوس اُردو ادب کو نیرؔ کا بدل مشکل سے ملیگا۔

علامہ نیرؔ کی دو شادیاں ہوئی تھیں پہلی شادی اپنے مولوی محمد احسن نائب دیوان ریاست بھوپال کی صاحبزادی سے ۲۰ر اکتوبر ۱۸۸۲ء کو ہوئی تھی جس سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار ہیں۔ دوسرا نکاح ۱۹۰۲ء میں منشی محفوظ علی ڈپٹی کلکٹر کی بڑی صاحبزادی سے ہوا اس شادی سے بھی دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے ؞

تبرکاتِ نیرؔ

شب فرقت کی یوں قطعاً گرانجانی نہیں جاتی
فلک تک آہ اُٹھ اُٹھکر بآسانی نہیں جاتی

بھری برسات میں توبہ کریں پینے سے اے واعظ
یہ فرمایش تو حضرت آپکی مانی نہیں جاتی

مرقع میں مری تصویر پر اُس شوخ نے لکھا
اب اس بیمار کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

طبیعت ہچکچاتی ہے سنا ہے جب سے اے نیرؔ
کہ توبہ کر کے مدت تک پشیمانی نہیں جاتی

رازِ سربستہ

از حضرت برق دہلوی مرحوم

غرقِ حیرت کرنے والا از زندگی کا فلسفہ
فہمِ انساں سے ہے بالا زندگی کا فلسفہ

منکشف ہوتا نہیں کچھ عقدۂ رازِ حیات
خواب کا سا اِک تماشا ہے طلسمِ کائنات

کیا خبر؟ ہے باعثِ تخلیقِ موجودات کیا
فی الحقیقت چیز ہے مجموعۂ ذرّات کیا

کاروان در کارواں آتے ہیں مہمانِ وجود
قافلہ در قافلہ جاتے ہیں ہو کر بے نمود

کیا فنا کے بعد بھی ہے زندگانی کا سراغ؟
ہستیٔ فانی کا کیا بجھ بجھ کے جلتا ہے چراغ؟

کب سے یہ دَورِ تسلسل ہے حیات و مرگ کا؟
کب سے یہ رنگِ تبدّل ہے حیات و مرگ کا؟

مادّے اور روح میں کیونکر ہوا یہ ارتباط؟
کیوں وسیلہ ہے بقائے نسل کا ذوقِ نشاط؟

کون ہیں دنیا میں ہم؟ کیا ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟
کیا پیامِ زندگی کتمِ عدم سے لائے ہیں؟

خواب ہے؟ یا خوابِ بیداری حیاتِ مستعار
حاصلِ ہنگامۂ ہستی ہے کیا پایانِ کار؟

کچھ نہیں معلوم کیا مقصود ہے تخلیق سے
حل نہ اب تک ہو سکا یہ مسئلہ تحقیق سے

کتنا حیرت زا ہے یہ منظر حجاب اندر حجاب
رازِ سربستہ کی ہے روئے حقیقت پر نقاب

عرض و جوہر۔ شکل و صورت۔ رنگ و بو۔ ذات و صفات
کیا مرکب ہے انہیں اجزا سے سازِ کائنات؟

مادّی دنیا ہے ترتیبِ عناصر کا ظہور
یا پسِ پردہ ہے پنہاں کوئی ہستی ذی شعور؟

نیستی سے ہستیٔ فانی ہوئی ہے رونما
قادرِ مطلق کی قدرت پر ہے یا اس کی بنا

معجزہ نیچر کا یہ دنیائے محسوسات ہے
یا کسی صنّاع کی صنعت یہ موجودات ہے

کس حسیں کے جلوۂ دلکش کا گہوارہ ہے یہ؟
یا کرشمہ سازیٔ فطرت کا نظّارہ ہے یہ؟

پردۂ اسرار ہے پردہ جو ہے اس ساز میں
ابتدائے آفرینش ہے حجابِ راز میں

کسقدر طے ہو چکی ہیں ارتقا کی منزلیں؟
دستِ فطرت کو ابھی کتنی الٹنی ہیں صفیں؟

عالمِ امکاں کا اتنا مسئلہ باریک ہے
روشنی سائنس کی بھی اس جگہ تاریک ہے۔

فلسفہ کو بھی نہیں عقدہ کشائی کی مجال ۔۔۔ اسکی رفعت تک تخیّل کی رسائی ہے محال

رازِ فطرت قوّتِ ادراک پر کھلتا نہیں
یہ زرِ خالص کسی میزان میں تلتا نہیں

پیشِ پا افتادہ ہیں جتنے مناظر دلفریب ۔۔۔ کس کی نوکِ کلک کے ہیں یہ نقوش دیدہ زیب؟
یہ زمیں۔ یہ آسماں۔ یہ مہر۔ یہ ماہ مبیں، ۔۔۔ یہ شفق۔ یہ کہکشاں۔ یہ انجم روشن جبیں
زیبِ دامانِ فضا ہیں کس کے یہ اعجاز ہے؟ ۔۔۔ کون ہے ان کا محرّک دلنشیں انداز سے؟
محوِ گردش کونسی قوت سے ہیں دن رات یہ؟ ۔۔۔ کس کشش سے ہیں خلا میں لبستہ اوقات یہ؟
کس لئے ہوتے نہیں ٹکرا کے باہم پاش پاش؟ ۔۔۔ مادی اجسام ہیں پابندِ حکم دورباش!
انکے بے ترتیب ہونے میں بھی یکرنگی سی ہے ۔۔۔ منتشر ہونے میں بھی شانِ ہم آہنگی سی ہے،
کونسی طاقت کے ہو زیرِ نگیں سارا نظام؟ ۔۔۔ حکمِ ناطق سے ہو کس کے انضباط واہتمام؟
کون ہو روحِ رواں اس گلشنِ ایجاد کی؟ ۔۔۔ کس نے ڈالی ہے بنا مجموعۂ اضداد کی؟
جلوہ گاہ شش جہت کی علتِ غائی ہو کون؟ ۔۔۔ پردے پردے میں یہ وجہ کار فرمائی ہو کون؟
فلسفہ کہتا ہے نیچر کا ہو یہ سارا ظہور ۔۔۔ عقل کہتی ہے کہ خلاقِ دو عالم ہے ضرور

نقش بندِ بزمِ امکان ذاتِ برحق ہو کوئی
برتر از وہم و گماں ہستئ مطلق ہے کوئی

جذباتِ بیتاب

(حضرت بیتاب بریلوی بی اے ایل ایل۔ بی)

ٹوٹ کر شمشیرِ قاتل رہ گئی ہے دل کے پاس ۔۔۔ زندگی کا ہے سہارا اک یہی بسمل کے پاس
کھو گیا ہے جستجو میں مدعائے جستجو ۔۔۔ پھر گیا دیوانہ آکر بارہا منزل کے پاس
دلمیں گھر کرتی ہے تیغِ ناز کس انداز سے ۔۔۔ سر چلے آتے ہیں اُڑ کر خود بخود قاتل کے پاس
کیا عجب ناکامی تدبیر سے بن جائے کام ۔۔۔ موجِ طوفاں پھینک دے اُٹھا کر مجھے ساحل کے پاس

کیا بتاؤں میں دلِ بیتاب کس مشکل میں ہو
دل میں ہو شمشیر یا دل ابروئے قاتل کے پاس

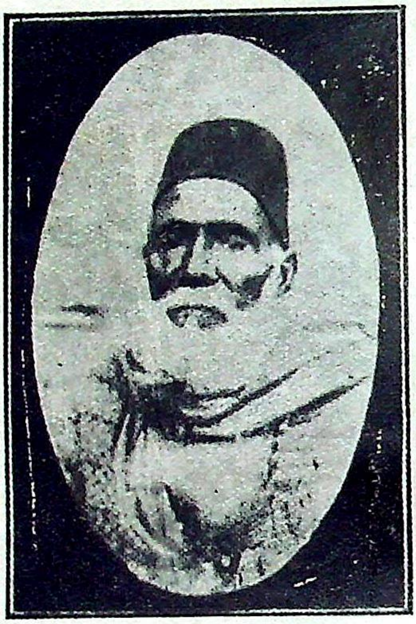
سینما کی تباہ کاریاں

از شیخ سعید الدین احمد محکمہ کوآپریشن پنجاب

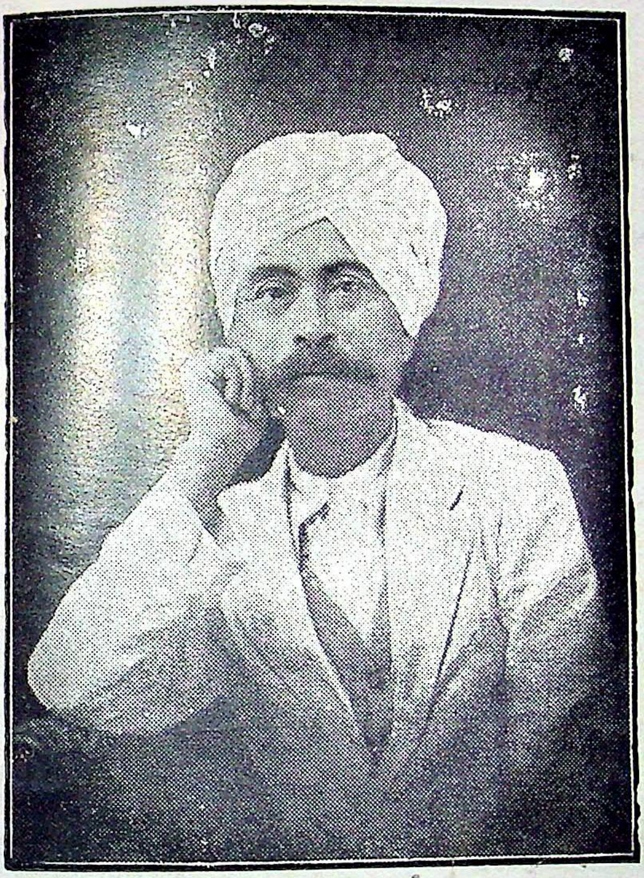
میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ بوڑھا جلد ساز جس کی بینائی میں فرق آچکا تھا کتابوں کی مرمت میں مشغول تھا۔ رعشہ کی وجہ سے وہ سوئی میں بڑی مشکل سے دھاگہ ڈال سکتا تھا۔ رجسٹروں اور کتابوں میں چھید نکالتے وقت بڑی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ قینچی لیکر اس کا ہاتھ بڑی مشکل سے چلتا تھا۔ جزبندی میں اوراق منتشر ہو جاتے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھا اس کی حالت کا اندازہ کر رہا تھا۔ اور رحم کے جذبات دل کی گہرائیوں میں پیدا ہو کر تاثرات میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ دنیا میں کما کر پیٹ پالنا کتنا مشکل ہے۔ بڑھاپا اور اس میں شفقت، نقاہت اور اسمیں محنت۔ یہ سب کیا ہے؟ دنیاوی عذاب وہ پیر مرد جو عصا کے بغیر دو قدم بھی نہ چل سکتا ہو اور اسے بنک کی بڑی بڑی کتابیں اٹھا کر شکنجے میں رکھنی پڑتی ہوں تو اُسے تکلیف کیونکر نہ ہو۔ وہ بوڑھا آدمی جسے طاقت جواب دے گئی ہو۔ آری سے موٹی موٹی کتابوں کو کس طرح ہموار کرے؟۔ بوڑھا انتہائی تکلیف کیساتھ یہ سب کام کر رہا تھا اور میں اسے دیکھ رہا تھا۔

میں بوڑھے سے اظہار ہمدردی کے لئے بیتاب اور ایک روحانی کشمکش میں مبتلا تھا۔ انسان اور اس کی مجبوری کا خیال میرے لئے سوہان روح تھا۔ سوچتا تھا کہ زندگی اور اس کا فلسفہ کیا ہے۔ بنی نوع انسان پر آلام و مصائب کے اسی لامتناہی سلسلہ کی کیا حقیقت ہے؟ کیا یہ وہی انسان ہیں جو باغ بہشت سے نکالا گیا تھا؟ کیا اسی انسان کو خدا کا خلیفہ کہا گیا ہے؟ میں غور و فکر میں منہمک تھا! اور انسانی زندگی کے زیادہ قریب ہو کر اس کے صحیح حالات کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ میں زندگی کے جام کو اس کی تمام شیرینیوں اور تلخیوں کیساتھ نوش کرنا چاہتا تھا۔ سوچتا تھا کہ ہماری دنیائے حیات پر تکالیف اور مشکلات، غربت اور افلاس، آلام اور مصائب کے بادل کیوں چھائے ہوئے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کا صحیح حل میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔

بوڑھا اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سوئی میں دھاگہ ڈالنے کے لئے وہ اپنے کرتہ کے دامن سے آنکھیں صاف کر رہا تھا۔ اس کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔



مولوی نورالحسن نیرؔ کاکوروی مرحوم



منشی دھنپت راے معروف بہ "پریم چند"

سنہ ۱۸۸۱ع — سنہ ۱۹۳۶ع

میں کرسی سے اُٹھا اور اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ بوڑھے نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور اس کے منہ سے آہ نکلی۔ جو گفتگو ہمارے درمیان ہوئی یہ تھی:-

میں۔ "بڑے میاں تمہارا کوئی لڑکا ہے"؟

وہ۔ "جی ہاں میرے دو لڑکے ہیں"۔

میں۔ "ان کی عمر کیا ہے"؟

وہ۔ "جناب ایک اٹھارہ دوسرا پندرہ سال کا ہے"۔

میں۔ "تو پھر وہ پڑھتے ہوں گے"؟

وہ۔ "جی نہیں۔ ایک نے نویں اور دوسرے نے چھٹی جماعت تک پڑھ کر چھوڑ دیا"۔

میں۔ "وہ کیوں"؟

وہ۔ "صاحب کیا بتاؤں، میری قسمت۔ اچھے بھلے دونوں پڑھتے تھے۔ میں خیال کرتا تھا تھوڑے دنوں تک میری سوئی ہوئی قسمت جاگ اُٹھے گی۔ بچے جوان ہوجائیں گے اور مجھے آرام حاصل ہوگا۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ دونوں لڑکوں کو سینما دیکھنے کی ایسی چاٹ پڑی کہ مدرسہ چھوڑ دیا۔ کتابیں بیچ کر ماں کا زیور چرا کر، میری جیب سے پیسے نکال کر اور قرض اُٹھا کر انہوں نے سینما دیکھنا شروع کر دیا۔ بعض دفعہ مجھے فاقہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ دونوں سینما میں ہیں۔ آخر اللہ کی مرضی۔ خدا اس سینما کو غارت کرے۔ اس نے مجھے تو تباہ کر دیا۔ گھر میں ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصاویر آویزاں ہیں وہ صبح شام انھیں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ رات دن وہی گانے گنگناتے ہیں جو وہاں سے سُن آتے ہیں۔ میں ایسی اولاد سے تنگ آگیا ہوں۔ میں اپنا پیٹ بھی نہیں پال سکتا۔ لیکن وہ سینما دیکھنے کے لئے پیسے ضرور طلب کرتے ہیں۔ دوں تو کہاں سے۔ غریب آدمی ہوں۔ کل رات میں نے بڑے کو آٹا لانے کو روپیہ دیا۔ وہ جب آٹا لایا تو اس کی ماں نے کہا کہ بیٹا آٹا تھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ بگڑ کر کہنے لگا کہ خود لے آئیں یا کسی اور سے منگوا لیا ہوتا، کام بھی کرتا ہوں، نام نہیں ہوتا۔ تھوڑا ہے خراب ہے۔ صاحب عورت ذات تھی چپ ہوگئی۔ اس نے مجھے بتایا۔ میں نے دوکاندار سے پوچھا۔ اس نے کہا کہ وہ تو بارہ آنہ کا آٹا لے گیا ہے۔ میں خاموش ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ وہ کل سینما میں ناچ دیکھنے گیا تھا۔ آٹے میں سے جو چونی رکھ لی تھی اسی کا ٹکٹ لیا ہوگا۔ چار آنے کا آٹا ہم دو وقت کھاتے۔ لیکن اس نابکار کو کیا پروا۔ خدا نے مجھے ایسی اولاد نہ دی ہوتی تو اچھا تھا"!

بوڑھا خاموش ہوگیا؛ لیکن اس کے پژمردہ چہرے سے اُداسی اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

میرے جذبات میں ایک عجیب قسم کا تلاطم پیدا ہوا۔ اور میں اپنی قلبی کیفیات سے متاثر ہو کر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ یہ ایک بالکل سچا واقعہ ہے۔ لہذا میں اپنا فرض خیال کرتا ہوں کہ برادران ملک کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کر کے یہ بات ان کے گوش گذار کروں کہ سینما ہمارے بچوں کے اخلاق پر کسقدر بُرا اثر ڈال رہا ہے۔ درحقیقت سینما انسانی طبیعت پر ایک عجیب اثر چھوڑتا ہے۔ جس قسم کا ڈرامہ ہو اسی قسم کے خیالات دل میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں ایک واقعہ عرض کئے دیتا ہوں جس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے۔ حتی الامکان وہی خیالات ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو راوی نے بیان کئے ہیں۔

میرے ایک دوست اپنی بیوی کو سینما دکھانے کے لئے لے گئے۔ ان کی بیوی غیر تعلیم یافتہ لیکن سلجھی ہوئی عورت ہیں جب وہ اپنے بکس میں بیٹھے ڈرامہ دیکھ رہے تھے تو بیوی کے جذبات میں یکلخت ہیجان پیدا ہوا اور وہ ان سے لپٹ کر کہنے لگیں کہ میاں میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی تم سے اسیطرح محبّت کروں جسطرح وہ عورت اپنے دوست سے کر رہی ہے۔ معاف کیجئے۔ مجبوری کی حالت میں ان الفاظ کا اعادہ کرنا پڑا۔ اب آپ خیال فرمائیں کہ جب ایک نیک نہاد بیاہی ہوئی عورت کے دل میں اس قسم کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں تو جوان لڑکوں اور نوجوان لڑکیوں کے دلوں میں سینما دیکھ کر فاسد خیالات کیونکر پیدا نہ ہوں گے۔ ہم اور ہمارے نوجوان بچے شادی اور غیر شادی شدہ مرد اور عورتیں جس وقت موجودہ ڈرامے دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں نہایت برے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ جو ان کی معاشرتی اخلاقی اور روحانی حالتوں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوتے ہیں۔

رہنمایان اور برادران ملک کو چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے نوجوان بچوں کو سینما نہ دیکھنے دیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلباء اب صرف ڈراموں پر تنقید کرنا ہی اپنی قابلیت خیال کرتے ہیں۔ بڑے بڑے عمامہ بند شریعت اور جبہ پوش طریقت بڑے بڑے پنڈت اور گرنتھی سینما کے گانے گنگناتے سنائی دیتے ہیں۔ بڑے بڑے کنجوس ساہوکار سینما دیکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی بھوکا روٹی مانگے تو اُسے پیسہ تک دینا گوارا نہیں کرتے۔ میرے پاس ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے میں ثابت کر سکتا ہوں کہ پانچ آنہ یومیہ مزدوری حاصل کرنے والے شام کو چار آنہ کا ٹکٹ لیکر سینما میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ اور گھر میں بوڑھی ماں یا جوان بیوی اندھیرے میں بیٹھی ان کی راہ تکتی ہے۔ ہر آہٹ پر چونک اُٹھتی ہے۔ گھر میں چراغ کے لئے تیل لانے کو پیسہ پاس نہیں۔ بعض حالات میں اہلِ خانہ کے ضروری اخراجات کے لئے

پیسہ نہیں ہوتا۔ لیکن گھر کا مالک سینما میں بیٹھا مس کجّن کے گانے اور سلوچنا کے رقص دیکھنے میں مصروف ہوتا ہے۔

اگر وہی چار آنہ جن کا ٹکٹ لیا گیا تھا بیوی بچوں پر صرف کئے جاتے تو بہت کچھ مصیبت دور ہو جاتی۔ اگر وہی چار آنے کسی غریب کو خیرات کے طور پر دے دئے جاتے۔ تو اس کے دل سے ہزاروں دعائیں نکلتیں اور اگر وہی چار آنے بچائے جاتے تو کسی ضرورت کے وقت کام آتے۔ بیماری کی حالت میں دوا آتی۔ تندرستی کی حالت میں کسی اور مفید مطلب پر صرف ہوتے۔ سینما والوں کو کیا خبر کہ ملک میں انکی جان کو کہاں کہاں رویا جا رہا ہے۔ ایکٹروں ایکٹریسوں کو کیا علم کہ ان کے حُسن و جمال کو کہاں کہاں بد دعائیں دی جا رہی ہیں۔ قلم کی روانی اور تخیل کی جولانی نہیں بلکہ یہ مصیبت زدہ ہندوستان کی داستانِ غم ہے۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ سچّی کہانی ہے۔ یہ وہ مناظر ہیں جن کے پسِ پردہ ہندوستان اور اسکی معاشرت کا بھیانک بلکہ خونخوار چہرہ ہے جو تمام ایکٹروں اور ایکٹریسوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے آمادہ نظر آتا ہے۔ انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی بد دعائیں دے رہا ہے جنھوں نے اُسے اس نوبت تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن بھارت ماتا کے بیشتر سپوتوں کا رجحان طبع پردۂ سیمیں کی طرف دیکھا جاتا ہے اور وہ اداکاروں کے مصنوعی تزئین و جمال اور حُسن و آرائش پر لٹو نظر آتے ہیں تو سارے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ اور سینما کے خلاف انفرادی کوشش کامیاب بھی نہیں ہو سکتی۔ خدا کرے کہ اس طلسم سامری کو توڑنے کے لئے کوئی موسیٰؑ پیدا ہو۔ درحقیقت ہماری کوشش اسوقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ سینما کے شوقینوں کے دل میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہو۔

قوم اور ملک کا اعتماد معاشیاتی استحکام پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن جب ملک کی آمدنی کا ایک حصّہ سینما کی نذر ہوتا ہو تو ملک کسطرح خوشحال ہو سکتا ہے۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور شہر کی شاید پندرہ سینماؤں کی روزانہ آمدنی بیس اور تیس ہزار کے درمیان ہے۔ خیال فرمائیے کہ جس شہر کا اتنا روپیہ فضول ضائع جاتا ہو اسکی اقتصادی حالت کسطرح مستحکم ہو سکتی ہے۔ اسکا افلاس کسطرح دور ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک کے ڈراموں میں سے چند چھوڑ کر باقی سب پر کسی خوف و خطرہ کے بغیر یہ فتویٰ عائد ہو سکتا ہے کہ وہ اخلاقی معیار سے گرے ہوئے ہیں۔ لہذا ہمارا فرض ہے کہ یا تو ایسے ڈراموں کیخلاف جہاد کریں اور جس طرح ہو سکے کوشش کریں کہ ہمارے نوجوان انہیں نہ دیکھیں۔ بعض ممالک میں حکومت نے اس قسم کے احکام جاری کئے ہیں جن کے ماتحت بیس سال کی عمر کے بچّوں کو سینما دیکھنا قانوناً منع ہے۔ لہذا میں اربابِ حل و عقد کی خدمت میں مؤدبانہ ملتمس ہوں کہ وہ اس بات کی پوری کوشش کریں۔ کہ اس قسم کا مفید

قانون ہمارے ملک میں بھی جاری کیا جائے۔ تاکہ ہم اس پستی کی طرف نہ جاسکیں جو روز بروز ہمیں نکبت و ادبار کی طرف لئے جارہی ہے۔ مجالس وضع قوانین کے معزز ممبران اگر ذرا کوشش کریں تو اس قسم کا قانون پاس ہوسکتا ہے۔

ایکٹروں اور ایکٹریسوں کے سوانح حیات پر سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی یہ بات روز روشن کیطرح نظر آتی ہے کہ اس طبقہ میں غالب تعداد ان لوگوں کی ہے۔ جنھوں نے بیحیائی اور عصمت فروشی کو اپنا شیوہ بنالیا ہے۔ کئی ایکٹرسیں اس بات کا رونا روتی ہیں کہ کس طرح اس دنیاوی جہنم میں داخل ہوکر انہوں نے مجبوراً اپنی شرافت کو خیرباد کہہ دیا۔ اہل بصیرت ان واقعات کو بہ نظر رکھ کر آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ سینما بقول حضرت علامہ اقبال فی الحقیقت "دوزخ کی مٹی" ہے جس آدم زاد کی اس پر نظر پڑیگی اس کے دامن نگاہ کو غبار آلود کرتی ہوئی لوح دل کو جاکر مکدر کردیگی۔ عصر حاضر کے بےمثیل فلاسفر اور بےبدل شاعر علامہ ڈاکٹر اقبال سینما کے متعلق یوں ارشاد فرماتے ہیں:۔

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے ۔ سینما ہی یا صنعت آذری ہے ۔ وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا ۔ یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے

وہ مذہب تھا اقوام عہد کہن کا ۔ یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے ۔ وہ دنیا کی مٹی یہ دوزخ کی مٹی ۔ وہ بتخانہ خاکی یہ خاکستری ہے

مندرجہ بالا اشعار کا ایک ایک لفظ اس حقیقت کی نقاب کشائی کر رہا ہے کہ سینما ہمارے لئے ایک لعنت ہے۔ لہذا یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جس طرح ہو سکے ہم اس سے چھٹکارا حاصل کریں۔ سینما فی الحقیقت ہمارے مذہب اور ایمان کو خراب کرنیوالی چیز ہے۔ لیکن وائے نادانی ہم کرشن سدامان اور "الہلال" اور اس قسم کی فلموں کو دیکھ کر تحسین و آفریں میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ کیا یہ بات ہمارے لئے قابل شرم نہیں ہے کہ ایک معمولی حیثیت اور مشکوک اخلاق کا انسان کرشن جی کی تمثیل بنکر پردہ سیمیں پر رقص کرتے بنسری بجائے۔ یا عورتوں کی محفل میں ان سے چھیڑ خانی کرے۔ افسوس اور صد ہزار افسوس! میں نہیں سمجھا ہماری ذہنیت اسقدر کیوں خراب ہوگئی ہے۔ خدا کا پیارا کرشن۔ بھگوان کا اوتار کرشن دنیا کی متبرک ہستیوں میں سے ایک متبرک ہستی جسکی اوصاف حمیدہ اور صفات ستودہ ہمارے لئے شمع ہدایت ہونا چاہیئے۔ لیکن سینما میں وہ اسطریقہ سے دکھائے جائیں۔ خدا کا نبی۔ اللہ کا پیغمبر دنیا کا مصلح مگر پردۂ سیمیں پر اسکی یہ حالت۔ اے ہندوستان کے رہنے والو! اور مسجد و مندر پر لڑنیوالو! تمھارے لئے یہ مقام افسوس ہے۔ کہ تمھارے مذہب کے بانیان کرام کے نام پر سینما میں وہ لوگ کام کریں جن کا مذہب کے ساتھ نام تک کا بھی تعلق نہیں۔ مذہبی روایات کو وہ لوگ اسٹیج پر پیش کریں جن میں تمام دنیاوی عیوب اور اخلاقی نقائص پائے جاتے ہوں۔

آشوبِ ملّت

از جناب مقبول حسین صاحب احمد پوری

دل لگا کر نہیں سنتا کوئی افلاس کا حال — یعنی غفلت نے کیا اور بھی سب کو کنگال
ہے عقائد سے دل اہلِ وطن مالا مال — اور عقائد ہی ہوئے قوم کے جی کا جنجال
یعنی ہر فرد کا ہے ایک نرالا مذہب — ایسا مذہب کہ ہوا جس سے محبّت کو زوال
ایک ادبارِ دماغی ہے یہ مذہب کا ڈھونگ — نہ تو پُوجا نہ نماز اور نہ اچھّے افعال
نام کو لوگ مسلمان بھی ہیں ہندو بھی — دل جو دیکھے کوئی اُن کے تو ہیں پتّھر کے مثال
جان دینے کو ہیں تیّار خذف ریزوں پر — نہ تو کچھ خوفِ خدا اور نہ غریبوں کا خیال
مفت ملجائے جو اِک بھائی کی پونجی ان کو — اس زمانے کی شریعت میں ہی وہ اکلِ حلال
جو امیں مشرب و ملّت کے تھے اب دُزد بنے — بات ہی بات میں وہ دیتے ہیں دھول آنکھ میں ڈال
آڑ میں مذہب و ملّت کے جو ہیں کھیلتے کھیل — جی میں آتا ہے کہیں اُن کو مسیح الدّجّال
اب تو ہر مشرب و ملّت پہ ہے چھایا ادبار — اپنی وقعت کو کیا آپ ہی سب نے پامال
میل ملّت کے لئے سعی کرے گر کوئی — اُس کے کہنے کو وہ ٹھکرائیں سمجھ کر فٹ بال
فتنہ پردازی میں ہیں شیخ و برہمن سب ایک — دل ہوا جاتا ہے تاریک نہیں کوئی ملال
آہ مذہب جسے کہتے ہیں وہ ہے ضد کا نام — روحِ مذہب کو کیا تیرہ دلی نے پامال
فیصدی بیسں مسلمان بھی نمازی نہ رہے — مسجدوں کے ہے تحفّظ پہ جدال اور قتال
لیکن اس خبط کو اب کون مٹائے آ کے — فرصت اتنی نہیں قانون کو دیکھے جو یہ حال
اور اگر ہمّت و جرأت سے کرے کچھ ترمیم — تو ابھی ملک میں برپا ہو فساد اور جدال
رہنما جو تھے بھٹک کر وہ ہوئے خود گمراہ — راہ پر لائے انھیں کاش خدائے متعال
عُلما کا ہے یہ عالم کہ لڑے مرتے ہیں — حال سے اپنے یہ حضرات ہوئے ہیں بے حال
قوم کو مذہب و اخلاق سکھانا کیسا — یہ سکھاتے ہیں لڑو اور نوچو جی کا وبال
ہیں وہ کاہل کو گھٹاتے کہ بڑے کہلائیں — علم کے زور پہ دیتے ہیں وہ ناقص کو کمال

شیرِ قالین ہیں دوزخ کے بیابانوں کے
شاخِ طوبیٰ کو اُڑے جاتے ہیں وہ بے پر و بال

پنڈتوں کا جو کہیں حال تو چھینک آتی ہے
دھرم کی آڑ میں ڈالے ہیں وہ مایا کا جال

پاپ اور پُن کا توازن نہیں قائم کوئی
ودّیا گیان کو اب دیتے ہیں باتوں میں ٹال

بندروں کو تو کھلاتے ہیں یہ پنڈت ”بھٹے“
بھوک کے مارے ہے بے باپ کا بالک بے حال

رُوح کا نور جو تھا دل میں ہوا وہ لُو کا
جب مریں گے یہی ہو جائے گا آگیا بیتال

پادری کا جو مشن ہے اُسے ”بوگس“ سمجھو
یعنی دنیا کی غرض اُس کے بھی ہے شاملِ حال

بات ہے صاف اگر کوئی کرے اِس پہ عمل
اپنے مذہب کی صداقت کا کرے دل سے خیال

دوسروں سے نہ مزاحم ہو عقائد کے لئے
یہ وہ مسلک ہے کہ جس میں نہ کہیں قیل نہ قال

اب تو اس عہد میں ہے عقل ہی سب کا مذہب
پیرو عقل ہے دنیا میں خوش اور فرخ فال

ہند نے نام نمایش کا رکھا ہے مذہب
یعنی وہ شے کہ جو ہے کھیل برائے اطفال

تھا کبھی پہلے صداقت کا دھنی ملک اپنا
اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اب نت نئے فتنے ہر سال

صاف جو بات تھی مقبول وہ ہم نے کہدی
اب کوئی اسکو نہ مانے تو یہ اس کے اعمال

ہم سے گر کوئی یہ پوچھے کہ تمہارا مذہب ؟
ہم کہیں پاک خیالات خجستہ افعال

اس طرح کرتے ہیں ہم ختم فسانہ دل کا
اور کچھ کہتے مگر ہم کو ہے خود اپنا خیال

فرضِ اوّل تو یہی ہے کہ سنواریں خود کو
قوم ہو جائیگی خود آپ ہی فرخندہ خصال

وہ خدا چاہے تو مٹ جائے جہالت کی وبا
اَبرِ رحمت سے جو برسائے کبھی آبِ زلال

ایک سوسائٹی ہو ایک ہی مذہب سب کا
اتحاد اور محبّت سے وطن ہو خوش حال

یہ دُعا ہے کہ رہے نام نہ خود غرضی کا
بلکہ ایثار سے دل قوم کا ہو مالا مال

وقت آنست کہ دل شعلۂ جولاں گردد
شمعِ روشن شود از عقل بہ فانوسِ خیال

تصحیح

زمانہ بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء میں نظم بعنوان ”تہذیب“ صفحہ ۱۸۰ میں یہ مصرع :-
پھونک دیتی ہے فضائے دہر پر تو کیا سکوں“۔ غلط چھپ گیا ہے ”سکوں“ کی جگہ ”فسوں“ ہونا چاہئیے
ناظرین براہ کرم تصحیح فرمالیں۔

(ایڈیٹر)

سلاطینِ اِسلام کا نظامِ عدالت

از مسٹر رفیع الدین رحمانی بی اے

جون ۱۹۳۶ء کے رسالہ "زمانہ" میں مسٹر جگیشور ناتھ در ما بیتاب بی اے۔ ایل ایل بی کا مندرجہ بالا عنوان پر ایک "تحقیقی" مضمون ہے جس میں فاضل مضمون نگار نے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ مسلم تاجدار ہندوستان کے واسطے ایک قہر آسمانی تھے جو باہر سے وبا کی صورت میں آئے اور دادِ شقاوت دیکر چلے گئے۔ مسلمان ہندوستان میں کسطرح آئے۔ انکی حکومت کن کن اصولوں پر قائم تھی۔ ان کا باشندگانِ ہند کیساتھ کیا برتاؤ تھا۔ ہندوستان کے باشندے ان کے دورِ حکومت میں خوش تھے یا ناراض؟ ان سب کا جواب اگر تاریخی کتابوں کی مدد سے دیا جائے تو شاید فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوگا۔ لیکن مسلمان بادشاہوں کو اسقدر سیاہ کیوں دکھایا جاتا ہے؟ اس کا جواب نہ بیتاب صاحب صحیح دے سکتے ہیں اور نہ کوئی اور صاحب۔ ہماری درسی کتابوں۔ ہماری تحریروں۔ ہماری تقریروں میں غرض ہر جگہ ہر وقت مسلمانوں کے مظالم گنائے جاتے ہیں۔ انکی عصبیت اور ان کی پست اخلاقی کا رونا رویا جاتا ہے۔ انکی سلطنت کا مقصد ہندوؤں پر مظالم کرنا۔ ان کے مندروں کو مسجدوں میں تبدیل کرنا اور خود ان کو بزورِ شمشیر مسلمان بنانا سمجھا جاتا ہے۔ اگر یہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرنا نہیں تو کیا ہے۔ ہندوستان ایک خاص دورِ حیات سے گذر رہا ہے۔ پھر اس قسم کے مضامین سے کیا فائدہ متصور ہے؟

میں مسلمانوں کے دورِ حکومت پر روشنی ڈالنے سے پیشتر بیتاب صاحب ہی کے مضمون سے کچھ اقتباسات پیش کرونگا تاکہ ناظرین سمجھ سکیں کہ ان اعتراضات کی بنیاد کسقدر سُست ہے۔

سندھ پر عربوں کی حکومت کے متعلق بیتاب صاحب فرماتے ہیں "شریعتِ اسلام کی پابندی سے غیر مسلم اقوام کیساتھ انصاف کے بجائے ظلم ہی ہوا"۔ "ریگستان عرب کے قوانین کی ہوا اہلِ ہند کو راس نہ آنا قدرتی بات تھی"۔ واقعی ایک ملک کے قوانین اور طور طریقے دوسرے ملک میں اجنبی ہی معلوم ہوتے ہیں۔ عربوں نے بھی جب سندھ فتح کیا تو انکی دانشمندی نے انکو سکھا دیا کہ سندھ پر حکومت سندھیوں کے اشتراک ہی سے ہوسکتی ہے۔ چنانچہ بیتاب صاحب کو بھی یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑی کہ "سندھ میں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں جور و اجات عام تھے۔ وہ ہر دو اقوام کے اتحاد و اشتراک

باہمی کی پیداوار تھے۔ یہ اختلاط و ارتباط ایسا گہرا تھا کہ اب قومی تفرقیات کا امتیاز کرنا بھی محال ہے۔ سر جادوناتھ سرکار مشہور مورّخ فرماتے ہیں۔" پُرانے اور نئے طریق معاشرت کچھ اس طرح مخلوط ہو گئے کہ عوام کی روزمرہ زندگی سے اجنبیت کا عنصر یک لخت خارج ہو گیا اور مقامی ضرورتیں بلا تردد و تکلف رفع ہوتی چلی گئیں۔ رفتہ رفتہ عدل و انصاف کے نظرئے کی اہم تبدیلی کے باعث حسب حال نئے قوانین بھی وضع ہونے لگے۔" ان جملوں سے صاف واضح ہے کہ مسلمان فاتحین اس باریکی کو بخوبی سمجھتے تھے کہ صرف شریعت اسلام ہندوستان کی حکومت کیواسطے کافی نہ تھی۔ بہرحال عدل و انصاف کے نظرئے میں جو اہم تبدیلی ضروری تھی وہ ہو کر رہی۔

لیکن ہمارے بیتاب صاحب کو بہرصورت یہ ثابت کرنا ہے کہ ہند کے مسلمان بادشاہ ہندوؤں کے حقوق کو ہمیشہ کچلتے رہے۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں :۔

" جب محمدؐ نے اسلام کی تلقین و اشاعت کی اور لوگوں کو دین اسلام پھیلانے کیلئے مشتعل کیا" تو محمد بن قاسم نے سندھ میں بزور شمشیر اسلام کی نشر و اشاعت کے خیال سے کشت و خون کا بازار گرم کیا اور غیر مسلم رعایا کو رسولؐ کے مجوزہ قوانین پر عامل ہونے کے لئے مجبور کرنے کی کوشش کی۔"

یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ بیتاب صاحب بار بار اپنے دعوؤں کو متضاد بیانات سے کیوں رد کر دیتے ہیں وہ خود فرماتے ہیں :۔

قاسم نے بقائے سلطنت کے لئے یہی قرینِ مصلحت سمجھا کہ ہندوؤں کا اعتماد و اتحاد حاصل کیا جائے۔ چنانچہ اس نے بہت سے برہمنوں کو بلا کسی ضمانت کے محصل لگان کے عہدے پر فائز کیا اور اس طرح خود پیشدستی کر کے ہندوؤں کی جانب صلح کا ہاتھ بڑھایا۔" حجاج نے بھی قاسم کے اقدام کو پسند کیا اور قاسم کو لکھا۔" ملکی قوانین کے احترام و پابندی کے ضمن میں تم نے عوام کی جو حوصلہ افزائی کی ہے وہ قابل ستایش ہے۔"

بیتاب صاحب نے عربوں کی دیانتداری اور انصاف پسندی کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن مغلوں کو عیاش۔ تنگدل اور ناخواندہ بتلایا ہے۔ محمد بن قاسم کا حملہ سندھ پر ۷۱۲ء میں ہوا اس کے بعد ہندوستان دو سو برس تک پھر اسی طوائف الملوکی میں پڑا رہا جس کا وہ کچھ عرصہ سے عادی ہو چلا تھا۔ محمود غزنوی کا پہلا حملہ ۱۰۰۱ء میں ہوا ہے۔ ہندو اب بھی محمود کو بُرا بھلا کہتے اور ہندو مذہب کا زبردست دشمن قرار دیتے ہیں اور جہل و بربریت کا نمونہ سمجھتے ہیں۔ لیکن غزنوی سے کسی ایسی بات کی اُمید کیوں رکھی جائے جو اس زمانہ میں مفقود تھی۔ اُن دنوں مذہبی عصبیت کا دور دورہ تھا۔

یورپ بھی جو اب ہم کو درس تہذیب دیتا ہے اس وقت پورے جوش و خروش سے قتل و غارت میں مشغول تھا۔ مگر کیا واقعی محمود غزنوی ہندوکش تھا اور اس کا مذہب صرف مندروں کو مسمار کرنا تھا۔ اس کی معدلت گستری کے تو بیتاب صاحب بھی قائل ہیں۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد اپنی کتاب "ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان" میں فرماتے ہیں:۔

"خدا نے سلطان کو فطرتاً لوگوں پر سرداری کرنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ وہ نہایت بہادر تھا اور سپاہیانہ جوہر اس میں بہ درجہ کمال ودیعت کئے گئے تھے۔ وہ عدل گستر اور علم دوست تھا۔ اور اس قابل تھا کہ دنیا کی عظیم ترین شخصیتوں میں اس کا شمار کیا جائے۔"

بہر حال محمود غزنوی نے تو ہندوستان میں کبھی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کی خواہش نہیں کی۔ مسلم سلطنت کے سنگِ بنیاد رکھنے کا سہرا محمد غوری کے سر ہے۔ اسوقت مسلمان ہندوستان میں نئے نئے آ رہے تھے اور ان کا ہر وقت ہندوؤں سے مقابلہ تھا۔ محمد غوری ایک مرتبہ ہندو فوج سے ہار کر اپنی جان بھی تقریباً کھو چکا تھا۔ ایسے وقت اگر وہ یا اس کے نایب ہندوؤں پر صرف ان کے غیر مذہب ہونیکی وجہ سے ظلم وستم روا رکھتے تو خلاف فطرت نہ ہوتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ مسلمانوں نے ہندوؤں سے کوئی مذہبی جنگ نہیں کی بلکہ وہ صرف ملک گیری کے لئے لڑ رہے تھے اور جب انہوں نے ملک پر قبضہ کر لیا تو وہ قصہ ہی ختم ہوگیا۔ در اصل نہ محمود غزنوی اور نہ محمد غوری کوئی بھی ہندو مذہب کے خلاف نہ تھا اور ان کے دربار حتیٰ کہ انکی فوج کے اعلیٰ مراتب بھی ہندوؤں کے واسطے اسی طرح کھلے تھے جس طرح مسلمانوں کے لئے۔ سر ولزلے ہیگ Sir Woolsey Haig اپنی کتاب Cambridge History Of India میں صفحہ ۹۰ پر فرماتے ہیں:۔

"بت شکن محمود کی فوج میں ہندو سواروں کا ایک بڑا دستہ تھا۔ اس کے لڑکے مسعود نے اپنے مسلمان افسروں کو ہندوؤں کے مذہبی جذبات مجروح کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے ہندو سردار تلک کو مسلمان احمد نیالتگین کی بغاوت فرو کرنے کے واسطے مقرر کیا۔ تلک سے مسلمانوں پر ظلم کرنے پر باز پرس نہ کی بلکہ اس کو اپنے مسلمان اُمرا کے برابر مرتبہ دیا۔"

بہر نوع ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد شریعتِ اسلام پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ ایرانی اصول جہانبانی پر۔ مسلمان بادشاہوں کی پبلک اور خانگی زندگی میں بین فرق تھا۔ انہوں نے جہانتک ملکی قوانین کا تعلق ہے شریعت سے سرتابی کی اور ہمیشہ سلطان المسلمین ہونے کے بجائے سلطان ہند ہونے پر فخر کیا۔ بلبن۔ علاؤالدین۔ محمد تغلق اور دوسرے سلاطین نے شریعت سے کھلم کھلا بغاوت کی۔ وہ سمجھ چکے تھے

کہ ہندوؤں پر حکومت کرنے کی شرط اوّل ان سے اشتراکِ عمل ہے۔ اُنہوں نے ہمیشہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات ان کے قومی اور ملکی رواجات۔ انکی طرز معاشرت کا احترام کیا۔ محمد تغلق جسکو دنیا پاگل اور ظالم قرار دیتی ہے اس کا جرم صرف اسقدر تھا کہ اس نے سلمان علماء کے خلاف قدم اُٹھایا اور انکو بھی ان کے جُرم کی اتنی ہی سخت سزا دی جتنی کہ دوسروں کو۔ چنانچہ عہد تغلقیہ کا بہترین مُورخ ضیاء الدین برنی محمد کا سخت دشمن تھا۔ اور اُس نے سُلطان کو ہمیشہ ظالم اور جابر کے رنگ میں پیش کیا۔

لیکن محمد تغلق ایک اعلیٰ تعلیمیافتہ اور عالم بادشاہ تھا۔ علاؤالدین خلجی لیسے اُمّی محض نے بھی موقعہ کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے ہندوؤں کیساتھ برابری کا برتاؤ کیا۔ اسکی فوج کے میمنہ کا سردار ہندو ملک نایک تھا۔ چتوڑ کا رانا پانچ ہزار سواروں کیساتھ اس کے ہمراہ رہتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ علاؤالدین نے دکن میں کافور کو بھیجکر ہزاروں ہندوؤں کو قتل کروا دیا۔ سیکڑوں مندروں کو تباہ کیا۔ لیکن دکن کے حملہ سے بھی علاؤالدین کا مقصد اور اس کے سیاسی اعتقادات ظاہر ہوجاتے ہیں۔ کافور کے حملوں کی بنا مذہبی عناد نہ تھی سلطان نے اپنے جنرل کو جو ہدایتیں کیں ان سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا بلکہ وہ اپنی سلطنت کو ترقی دینا چاہتا تھا چنانچہ کافور کو ہدایت کردی گئی تھی کہ اگر تلنگانہ کا راجہ اطاعت قبول کر کے خراج ادا کردے تو اس سے کچھ تعرض نہ کیا جائے۔ راجہ دیوگیری بھی سمجھ چکا تھا کہ کافور ترقی سلطنت کے واسطے کوشش کر رہا ہے۔ اسلام کی نشر و اشاعت اس کا مشن نہیں۔ اسی واسطے وہ بھی کافور کو ہر طرح مدد دینے کے واسطے تیار تھا۔ علاؤالدین نے بھی محمود غزنوی کی طرح سیکڑوں مندر تباہ کئے لیکن نہ محمود غزنوی اور نہ علاؤالدین کا مقصد بُت شکنی تھا۔ ان کا اصلی مقصد سیم و زر حاصل کرنا تھا۔ اس زمانہ کے مندر جتنے زیادہ متبرک اتنے ہی زیادہ مالدار ہوتے تھے۔ سومنات پر حملہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ زیادہ مالدار تھا۔ ورنہ ہندوستان کے ایک گوشہ کا گمنام مندر اسلام کی ترقی میں کیسے سدّ راہ ہو سکتا تھا۔

علاؤالدین قاضی مغیث الدین سے سلطنت کے متعلق مشورہ لیتا ہے اور جب قاضی سلطان کو شریعت سے ہٹ جانے پر ملامت کرتا ہے تو وہ صاف کہہ دیتا ہے "میں نہیں جانتا کہ شریعت میں کیا جائز ہے اور کیا ناجائز جو کچھ میں سلطنت کی ترقی کے واسطے بہتر سمجھتا ہوں اس کا حکم دیتا ہوں اور اسکی مجھے پرواہ نہیں کہ حشر کے روز کیا ہوگا۔" علاؤالدین کا مقولہ۔ کہ "مذہب کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں مذہب فرد کے واسطے ہے اور فرد ہی تک رہنا چاہیئے۔" صاف ظاہر کر دیتا ہے کہ علاؤالدین کے یہاں ہندو مسلم کا سوال ہی نہ تھا۔ اگر اس کے دوران حکومت میں ہندوؤں پر ظلم ہوئے تو اسکی وجہ مذہب سے نہیں بلکہ سیاست سے دریافت کرنا چاہیئے۔

سلاطین اسلام نے کبھی ہندوؤں کیساتھ مذہبی بغض نہیں رکھا اور نہ وہ رکھ سکتے تھے۔ ہندوستان میں گنتی کے مسلمان تھے کل رعایا ہندو تھی ایسی صورت میں یہ ناممکن تھا کہ کل رعایا کو سلطنت کا دشمن بنا یا جائے۔ ہندوؤں پر اکثر ظلم ضرور ہو گیا۔ انکو تہ تیغ ضرور کیا گیا لیکن وُلزلے ہیگ کے الفاظ میں: "بغاوت اور کھلم کھلا سرکشی مذہبی جنگ کی وجہ تھی لیکن جُرم بغاوت تھا نہ کہ مذہبی تعصّب۔ اور یہ گمان کرنیکی کوئی وجہ نہیں کہ ہندو کاشتکار ہندو زمیندار کی بہ نسبت مُسلمان زمیندار کے زمانہ میں زیادہ خراب حالت میں تھے۔"

یہی نہیں کہ سلاطین اسلام سیاسی وجوہ سے ہندوؤں سے اشتراکِ عمل پر مجبور تھے بلکہ زمانہ کی رفتار کیساتھ فلسفۂ مذہب بھی تبدیل ہو رہا تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاؒ اپنی خانقاہ کی چھت پر سے کچھ ہندوؤں کو مورتی پوجا کرتے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ہر شخص کا علیحدہ راستہ ہے علیحدہ مذہب ہے اور علیحدہ عبودگاہ اور وہ حق رکھتا ہے کہ جس طرح چاہے اپنے خدا سے ملے۔" یہی سلطنت اسلامیہ کا بنیادی اصول تھا۔

اس کے علاوہ اس زمانہ کی سوشل اور ادبی تاریخ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہندو اپنے مسلم سرداروں کو شک یا حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ وہ ان سے گھل مل کر رہتے تھے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ مُسلمان صرف لوٹ مار کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ اُنہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ ایک مُسلمان جُلاہے کالڑکا ہندو مہاتمارامانند کے سامنے زانوئے ادب تہ کرکے کبیر بنتا ہے اور دنیا کو مساوات و برادری کا سبق سناتا ہے طوطی ہند امیر خسرو قصیدہ اور غزل لکھکر صرف سلطان اور اُمراہی کو خوش نہیں کرتے بلکہ دوہے اور کبت لکھکر ہندو عوام کو بھی چنگ و رباب کی دعوت دیتے ہیں۔ نظام الدین اولیاؒ بابا فرید شکر گنج۔ گیسو دراز صرف مسلمانوں ہی کو درسِ توحید نہیں دیتے بلکہ ہندو امیر و غریب بھی ان سے فیض حاصل کرتے ہیں" (ایشوری پرشاد) میل و محبّت نے آخر بڑھتے بڑھتے بنگال کے متبرک دیوتا "ست پیر" کی شکل اختیار کرلی ہے جسکو ہندو مسلمان دونوں پوجنے لگے۔ ہندو مذہب کے ریفارمر نانک۔ رامانج نامدیو۔ چیتنیہ۔ اسلام کی تعلیم وحدت اور صوفیوں کی تعلیم ہمہ اوست سے متاثر ہو کر اس گندگی کو جو رفتار زمانہ کیساتھ مذہب میں خدا معلوم کیسے داخل ہو گئی تھی دور کرنے کھڑے ہو گئے۔ اگر اسلام اور مسلمانوں کی موجودگی کا اثر نہ لیا جاتا تو بھگتی کی تعلیم یقیناً تین سو برس کیواسطے رُک جاتی۔

ہندو اور اسلامی تہذیب کے اتحاد کے متعلق مارشل (Marshal) کہتا ہے کہ "تاریخ عالم کا یہ عجیب ترین واقعہ ہے کہ دو بالکل مختلف لیکن مکمل قوانین سوسائٹی یعنی اسلامی اور ہندو تہذیب اس طرح شیر و شکر ہو گئے کہ کچھ عرصہ کے بعد ان میں امتیاز ناممکن ہو گیا۔"

مغل ہندوستان میں سولھویں صدی عیسوی میں آئے اس وقت تک زمانہ کئی کروٹیں

لے چکا تھا مسلمان ہندوستان میں اپنا گھر بنا چکے تھے۔ انکی کمزور سلطنت کی بنیاد اب کافی مضبوط ہو چکی تھی۔ سلطنت مغلیہ کا بانی ظہیر الدین بابر اگرچہ تمام عمر سرحدی قبائل سے بقاء حیات کے واسطے لڑتا رہا لیکن وہ مدبّر تھا اور اسکو زمانہ دانشمندی سکھا چکا تھا۔ اس نے ہندوستان آکر فوراً سمجھ لیا کہ ہندوؤں کی اکثریت ہونیکی صورت میں ان پر زیادہ عرصہ تک ظلم وستم قایم نہیں رہ سکتا۔

مغل جن کو بیتاب صاحب ناخواندہ اور تنگ دل کہتے ہیں واقعی نہ ناخواندہ تھے اور نہ تنگدل۔ وہ ہندوستان کے شمال و مغرب سے آئے تھے اور ایران کی تہذیب کے حامل تھے۔ بیتاب صاحب فرماتے ہیں کہ "مغل شمال و مغرب کی جانب سے جو نظام اپنے ساتھ لائے وہ اتنا بلند و بالا نہ تھا جس کا مظاہرہ سندھ مین اس سے پیشتر ہو چکا تھا" لیکن اسی شمال و مغرب نے یورپ و ایشیا کو ہمیشہ درس تہذیب دیا ہے۔ یہ وہی خطہ ہے کہ جب ہندوستان اور یورپ قعر گمنامی میں پڑا تھا تو وہ تہذیب و تمدن کے جھولے جُھول رہا تھا۔ مغلوں نے ہندوستان میں جو کچھ پیش کیا وہ بیشتر ایران کا سکھایا ہوا تھا اور ایران کے متعلق مارشل (Marshal) لکھتا ہے " فارس اپنے بہترین موقعہ پر ہونیکی وجہ سے عجیب و غریب خصوصیات کا حامل ہے۔ اسی جگہ ترکستان چین سیریا۔ میسوپوٹامیہ اور سلطنت روما کی تہذیب نے ایک دوسرے سے ملکر ایک نئی شکل اختیار کی اور بعد چندے ایران کے درخشاں تمدّن نے تمام عالم کی نظروں کو خیرہ کر دیا" بابر نے بھی یہی درس لیا۔ وہ ہندوستان آتے ہی سمجھ گیا کہ ہندوؤں سے میل جول رکھنا ضروری ہے۔ اس کا وصیت نامہ جو اس نے ۱۵۲۹ء میں دھولپور کے باغ میں لکھا ہے روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ "ناخواندہ و تنگدل" ہونے کے بجائے وہ واقعی تدبر اور دانشمندی کا بادشاہ تھا۔ اس وصیت نامہ مخفی میں ہمایوں کو لکھتا ہے:۔

"اے فرزند۔ مملکت ہندوستان از مذاہب مختلفہ معمور است۔ بحمد اللہ کہ حق سبحانہ تعالیٰ بادشاہی آں بتو کرامت فرمود۔ باید کہ تعصب مذہبی را از لوح دل پاک نمودہ موافق طریق ہر ملّت معدلت کن خصوصاً از قربانی گاؤ بہ پرہیز کہ تسخیر قلوب اہل ہندوستان است در محبت ایں ولایت باحسانات بادشاہی وابستہ شو، و منادر و معبود گاہ ہر قومیکہ زیر فرمان بادشاہی است خراب مکن چناں عدل گستری اختیار کن کہ شاہ از رعیت و رعیت از شاہ آسودہ شود......"

کیا یہ وصیت نامہ پڑھنے کے بعد بھی کسی کو مغلوں کی ذکاوت اور معاملہ فہمی پر شبہ ہو سکتا ہے۔ زمانہ اس عرصہ میں دنیا کا نقشہ بدل چکا ہے لیکن ان لفظوں کی سچائی اب بھی اسیطرح قائم ہے۔ کنگ ظہیر الدین بابر کے متعلق تزک بابری صفحہ ۲۸ ہم پر لکھتا ہے "ظہیر الدین محمد بابر بے شک اپنے عہد کا بہترین مدبّر اور ایشیا

King

کے تخت کو مزین کرنیوالی عظیم ہستیوں میں سے تھا" دنیا میں ایک طاقتور اور بلند پایہ سلطنت قایم کرنے والے میں ہم ایک جنرل اور ایک مدبر کی خصوصیات کی توقع کرسکتے ہیں اور بابر میں یہ خصوصیات معراج کمال پر پہنچی ہوئی تھیں چنانچہ اگر ہم ایشیا کی تاریخ کو بہ نظر غور مطالعہ کریں تو ہم کو چند ہی بادشاہ ایسے ملیں گے جو ذہانت و ذکاوت اور کمالات ذاتی میں بابر کے ہم پلہ ہوں۔ فہم و ادراک قابلیت و تحمل علم دوستی۔ مردم شناسی۔ معاملہ فہمی اور سب سے زیادہ وقت ضرورت کے موافق عمل کرنے میں ہم کسی ایشیائی بادشاہ کو بابر کے برابر نہیں پاتے۔

بابر کے بعد ہندوستان کا فرمانروا ہمایوں ہوا۔ لیکن اس کو ایک لمحہ کے واسطے بھی چین نہیں ملا۔ جس شخص نے ہمایوں کو ہندوستان سے نکال کر تخت پر خود قبضہ کیا تھا وہ بھی کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ مورخوں میں ابھی تک اختلاف ہے کہ اکبر اعظم کی پالیسی کہانتک اس کی ذاتی تھی اور کسقدر شیر شاہ سے لی گئی تھی۔ شیر شاہ کے متعلق ولیم کروک (William Crooke) رقم طراز ہے" وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے ہندوستان میں ہندوستانیوں کی اعانت سے سلطنت قائم کی۔ ہندو مذہب کو وہ حقارت سے نہ دیکھتا تھا بلکہ اس کی نظر میں اسکے تقدس کی جھلک نمایاں تھی۔ وہ ہندوؤں کو انتظام سلطنت میں پورا پورا حصہ دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی سراؤں کو بھی خالص اسلامی سرائے نہیں بنایا بلکہ ہندو جذبات اور احساسات کا خیال رکھ کر ان کے واسطے بھی اس میں انتظام رکھا۔ اس کے بندوقچی اور پیدل ہندو تھے۔ اور قابلیت کے مطابق فوج کے اعلی مراتب بھی ہندوؤں کے لئے کھلے تھے۔ اس کا بہترین جنرل برہم جیت گور تھا جو ہمیشہ ہمایوں کے تعاقب کے واسطے مقرر رہتا تھا" شیر شاہ کی عدالتوں میں ہندو قانون کا اسی قدر خیال کیا جاتا تھا جس قدر اسلامی شریعت کا۔ قانگو شیر شاہ کا مورخ لکھتا ہے۔ کہ" شیر شاہ کی تخت نشینی کیساتھ عدالت مساوات اور حریت کا دور شروع ہوا جو اکبر کے دوران حکومت میں بہار کی دھوپ کی طرح درخشاں ہوکر کل عالم کو حیات نو کا سبق سکھا گیا"

اکبر اعظم کی تخت نشینی پر مغلوں کی فہم و فراست کچھ اور ہی رنگ لائی۔ میں اکبر کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ وہ لوگ بھی جو دیگر مسلمان فرمانروایان ہند کو متعصب قرار دیتے ہیں اکبر کو اس سے بری سمجھتے ہیں۔ اکبر نے صرف رواداری ہی کو جائز نہیں رکھا بلکہ وہ ہندوؤں سے بالکل شیر و شکر ہوگیا۔ ہندوؤں سے رشتہ داری کرکے مذہبی تفریق کو بالکل ختم کردیا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اکبر اور جہانگیر وغیرہ نے راجپوت شاہزادیوں سے شادی کرکے کبھی ان کو دعوت اسلام نہیں دی بلکہ جہاں محل میں

مسلمان شاہزادیوں کے واسطے مسجدیں بنیں وہاں ہندو رانیوں کے واسطے مندر بنوائے گئے۔ یہ انھیں رانیوں اور راجپوت خواتین کا اثر تھا کہ اکبر صبح اٹھکر روزانہ سورج دیوتا کے درشن کرتا تھا۔

بہرکیف اکبر کے متعلق تو ہندو بھی حسن ظن رکھتے ہیں۔ رہا جہانگیر وہ نصف ہندو۔ باپ کا بیٹا۔ ہندو ماں کی آنکھ کا تارا جس کے ماموں خالو کل رشتہ دار ہندو تھے وہ کب گوارہ کرسکتا تھا کہ اس کے رشتہ داروں کو نقصان پہنچے۔ کل مورخوں کی رائے ہے کہ جہانگیر مذہبی رواداری کے معاملہ میں اکبر کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ شاہجہان اگرچہ اکبر کا پوتا تھا لیکن اسمیں نہ بابر کی سی ہمت تھی اور نہ اکبر کی سی بیدار مغزی۔ اکبر اور جہانگیر ایک لائحہ عمل بنا گئے تھے جس کی شاہجہاں کورانہ تقلید کرتا رہا۔ مگر ہندوؤں نے شاہجہاں کی سچائی کو بزدلی پر محمول کیا۔ اس زمانہ میں بھی آجکل کی طرح کچھ فرقہ وارانہ ذہنیت کے ہندو تھے۔ جب نہوں نے داراشکوہ کی پاسداری کا خیال کیا تو کھل کھیلے۔ متھرا میں مسجد گرا کر مندر بنالیا۔ شاہجہاں کو خبر ہوئی تو اُس نے پھر مسجد بنوادی لیکن مسجدیں گرا کر مندر بنانا جاری رہا۔ یہی نہیں بلکہ نادار مسلمان عورتوں کو زبردستی ہندوؤں کیساتھ رہنے پر مجبور کیا گیا۔ عبدالحمید لاہوری شاہجہاں نامہ میں لکھتا ہے:۔

"چوں رایات جلال بحوالی گجرات و پنجاب رسید جمعے از سادات و مشائخ آن نقیصہ استغاثہ نمودند کہ برخے از کفار نابکار حرائر و امائے مومنہ را در تصرف دارند و چندے از بنیان مساجد تعدی درعمارات خود آوردہ۔ بنابر آں شیخ محمود گجراتی کہ از رسم دانش بہرہ دراست، داروغگی مردم جدید اسلام بر دستور رخصت یافت تا بعد از ثبوت نساء مسلمہ را از تصرف کفار برآرد و مساجد و عمارات آں ملاعین جدا سازد۔ او مطابق حکم بہ عمل آوردہ ہفتاد و چہار مومنہ را از تصرف کفار برآورد و ہرجا کہ مسجد در زیر عمارات ہنود در آمدہ بود بعد از تحقیق آں را افراز نمود و زرے آں جا بطریق جرمانہ گرفتہ بدستور سابق مسجد ساخت۔ پس از آں کہ ایں ماجرا بسامع جلال رسید یرلیغ قضا نفاذ صادر شد کہ بدستور قدیم ہر کہ مسلمان شود مسلمہ را بہ عقد مجدد باز گذارند۔ پس از ورود فرمان جمع از سعادت یاوری بہ پایہ اسلام رسیدہ زنان مسلمہ را بہ نکاح جدید متصرف گشتند و حکم شد کہ در کل ممالک محروسہ ہر جا چنیں واقع شدہ باشد بدیں دستور عمل نمایند چنانچہ اناث بسیار از دست کفار برآمدہ در نکاح مسلمانان در آمدند"

ہندوؤں کے منادر و معبود گاہ کی بربادی کی اصلیت یہ ہے۔ شاہجہاں اپنے آخری ایام میں داراشکوہ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہوگیا تھا اور داراشکوہ علانیہ اپنے ہندو ہونے کا اظہار کرتا تھا چنانچہ پست ذہنیت کے کچھ ہندو اپنا رنگ لائے۔ اورنگ زیب کو اپنی تخت نشینی کے بعد ہی ہزاروں مشکلات سے دوچار

ہونا پڑا۔ اس طرح شاہجہاں جو اصلی مجرم ہے وہ صاف بری ہو گیا اور اورنگ زیب مجرم قرار پایا۔ غرض تاریخ سے بخوبی ثابت ہے۔ کہ اعلان جنگ ہندوں ہی نے کیا اور اورنگ زیب نے صرف مدافعت کی۔

اورنگ زیب پر ایک اور زبردست الزام یہ ہے کہ اس نے اکبر کے دستور العمل سے منحرف ہو کر ہندوؤں کو حکومت سے علیحدہ کر دیا۔ ان کے اشتراکِ عمل کو ٹھکرا دیا۔ چنانچہ خافی خاں کے یہ جملے بڑے شدومد سے پیش کئے جاتے ہیں۔ کہ

"صوبہ داران و تعلقہ داران و پیشکاران و دیوانیان ہنود را برطرف نمودہ مسلمان مقرر نمایند و کروری محالات خالصہ مسلمانان می نمودہ باشند"

لیکن خافی خاں ہی فوراً یہ بھی کہتا ہے۔ کہ

"بعدہ چناں قرار یافت کہ از جملہ پیشکاران دفتر یونانی و بخشیان سرکار یک پیشکار مسلمان و یک ہندو مقرر می نمودہ باشند"

ظاہر ہے کہ ایک مرتبہ کل ملازمین کو نکال کر دوبارہ پھر انھیں جگھوں پر رکھ لینا مذہبی تعصب نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ کچھ اور ہو گی۔ واقعہ یہ تھا کہ ان تمام جگھوں میں کالستھ مقرر تھے اور رشوت کا بازار گرم تھا جس کے انسداد کی صرف یہی صورت ہو سکتی تھی کہ موجودہ عمال کی نگاہ اشت کے لئے کچھ اور لوگ مقرر کئے جائیں۔ اورنگ زیب لاکھ برا سہی لیکن وہ یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ حکومت کے اتنے زبردست حصہ کو بلکلم علیحدہ کر کے ہمیشہ کے واسطے متعصب مشہور ہو جائے۔ یہ اس کی تقدیر ہے کہ اسکی نیک نیتی کو بھی تعصب شمار کیا جاتا ہے۔

نیچے طبقے کے ملازمین سے قطع نظر اورنگ زیب کا دربار ہمیشہ ہندوؤں کے واسطے اسیطرح کھلا رہا جس طرح اکبر و جہانگیر کا۔ تخت کے واسطے سب سے پہلی لڑائی اورنگ زیب اور راجہ جسونت سنگھ میں ہوئی۔ اورنگ زیب لاکھ لاکھ کہتا رہا کہ مجھے تخت سے کچھ سروکار نہیں ہیں تو جہاں پناہ کی زیارت کو جا رہا ہوں لیکن راجہ نہ مانا چنانچہ جنگ ہوئی اور راجہ نے شکست کھائی۔ لیکن جب اس نے معافی مانگی تو اورنگ زیب نے اسے معاف کر دیا۔ یہ اورنگ زیب ہی کی ہمت تھی کہ اس نے ایسے غدار کو اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا چنانچہ جسونت سنگھ تمام عمر سپہ سالار رہا۔ اس کے علاوہ نیچے لکھے ہوئے ناموں سے معلوم ہو جائے گا کہ اورنگ زیب نے کہاں تک ہندوؤں سے بگاڑ کیا تھا یا ہندو اورنگ زیب کو کس حد تک دشمن مذہب و قوم خیال کرتے تھے۔

راجہ بھیم سنگھ۔ مہاراجہ اودے پور کا بیٹا اور مہاراجہ جے سنگھ کا بھائی ۳۸ء جلوس عالمگیری

میں سات برس سے پنج ہزاری عہدہ پر فائز تھا۔ اندر سنگھ اور بہادر سنگھ دونوں مہارانا اودے پور کے بیٹے دو ہزاری اور سہ ہزاری منصب بردار تھے۔ راجہ روپ سنگھ کالڑ کا راجہ مان سنگھ تاحیات ماندل اور بدھنپور کا فوجدار رہا۔ شیواجی کو جو اورنگ زیب کا زبردست دشمن تھا حقیقی داماد اچلاجی کو پانچہزار کا منصب معہ نقارہ اور علم دیا گیا تھا۔ کانہوجی سرکیہ مرہٹہ فوج کے سردار کو مغلیہ حکومت کا شش ہزاری منصب عطا ہوا تھا۔ شولاپور ایسے اہم قلعہ کا قلعدار کشور داس تھا اور اورنگ زیب اس سے بالکل مطمئن تھا۔

ان واقعات کی موجودگی میں کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اورنگ زیب نے ہندوؤں سے بگاڑ کر کے اپنی سلطنت کی بیخ کنی کی؟

غرض مغلوں نے ہندوستان میں رہ کر ہندوستانیوں سے ملکر حکومت کی۔ اگر اس زمانہ کے ہندو اس کا خیال بھی کرتے کہ مسلمانوں کی حکومت جبر و تشدد پر مبنی ہے تو تاریخ کی شکل فوراً بدل جاتی۔ بکالے لکھتا ہے "ہم نہیں سمجھ سکتے کہ سولھویں اور سترھویں صدی میں شاہی افواج اور باغیوں کے گروہ میں کسقدر کم فرق تھا۔ جو کچھ سلطنت مہیا کر سکتی تھی وہی سامان حرب باغی افواج کے پاس بھی موجود تھا۔" اس صورت میں یہ ناممکن تھا کہ مغل حکومت باشندگان ہند سے جنگ کر کے ایک لمحہ کے لئے بھی قائم رہ سکتی۔ ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب اپنی کتاب "جہانگیر" میں صفحہ ۸۷ پر لکھتے ہیں کہ "مغل حکومت نہ تشدد پر قائم تھی اور نہ شریعت کے اُصولوں پر۔ اکبر نے عالموں کی رہی سہی عزت کو بھی ختم کر دیا تھا۔ .... یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت فریڈرک دوئم، پوپ انوسینٹ سوئم سے جنگ کر رہا تھا اُسی وقت علاؤالدین اسلام کے علماء سے مصروف پیکار تھا۔ .... سولھویں صدی تک ہندوستان کی حکومت عالموں کے اثر سے باہر ہو چکی تھی۔ اکبر نے اس جنگ کو کامیابی سے ختم کر دیا ورنہ ہندوستان میں عالموں کا فرقہ لاکھوں ہندوؤں کو بدظن کر کے حکومت کی بنیادوں کو گھن لگا دیتا۔" بقول ڈاکٹر صاحب "یہ صحیح ہے کہ مغل سلطنت میں نہ منتخب کردہ اسمبلیاں تھیں اور نہ سیاسی حقوق لیکن اس میں اتنی جمہوریت ضرور تھی کہ اس کی پالیسی عوام کے جذبات اور خواہشات کے مطابق تھی۔" مسٹر این۔ سی مہتا آئی سی ایس فرماتے ہیں: "مغل حکومت کا شان و شکوہ صُلح کل اور بلا امتیاز مذہب رعیت کیساتھ رواداری پر قائم تھا۔"

مغلوں پر بتیاب صاحب کا یہ اعتراض ہے کہ وہ عیاش تھے۔ مگر عیاشی سے ملک فتح نہیں ہوتے۔ بابر یا اکبر اگر سلطنت کے علاوہ کچھ اور بھی کرتے تو آج کوئی شخص انکا نام بھی جانتا۔ سرکار اپنی کتاب د (Studies In Mughal India) میں صاف صاف لکھتے ہیں کہ مغل شہنشاہ اور شاہزادوں کا ایک ایک لمحہ سلطنت کی فکر میں گذرتا تھا اور شاہی تخت اس زمانہ میں بھی پھولوں کی سیج نہ تھا بادشا

کے فرائض تھے جسے وہ بخوبی محسوس کرتا تھا۔ مغل بادشاہوں کی زندگی محنت اور تکالیف کی زندگی تھی اسی وجہ سے وہ ملک کو عیش و آرام دے سکے۔" شاہجہاں کے متعلق ایک ہندو شاعر کا شعر ہے:۔

خلق سبک دل زگراں باری اش

فتنہ گراں خواب زبیداری اش

تحقیق سے یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ مسلمان بادشاہ ہندوستان میں صرف قرآن کے احکام کی فرمانبرداری نہیں کرتے تھے اور نہ وہ صرف مسلمانوں ہی کے بادشاہ تھے بلکہ اُنہوں نے ہندوؤں سے بھی اشتراک عمل کیا، انکو اعلیٰ عہدے دیئے اور ان پر کبھی مذہبی حیثیت سے ظلم نہیں کیا۔ مسلمان عدالتوں میں بھی صرف شریعتِ اسلام ہی پر عملدرآمد نہیں ہوتا تھا کیونکہ گو سلطنت اسلامی تھی لیکن سرزمین ہندو تھی اس لئے ہندو رواج، ہندو عقائد اور ہندو رسموں کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری تھا۔

مسلمان بادشاہ بخوبی سمجھتے تھے کہ شریعت اسلامی کی پابندی صرف انہیں ملکوں میں آسانی اور کامیابی سے ہو سکتی ہے جہاں کل آبادی شریعت پر ایمان رکھتی ہو۔ ہندوستان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور ہندو تہذیب بھی اعلیٰ پیمانہ پر صدیوں سے قائم تھی اس صورت میں یہ ناممکن تھا کہ صرف شریعت پر عمل کرکے حکومت کو مضبوط بنایا جا سکتا۔ وہ جانتے تھے کہ شریعت کی پابندی ہندوؤں پر ظلم ہونے کے مرادف ہوگی۔ اس لئے اُنہوں نے ہندو رواجات کو ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا۔

سولہویں اور سترھویں صدی میں سیاست کا ایک خاص رنگ تھا۔ بادشاہ مطلق العنان ہوتے تھے اور ان کو انتظام سلطنت سے زیادہ آرائش سلطنت کی خواہش تھی۔ مسلمان بادشاہ جب ہندوستان آئے تو وہ بھی یہاں ہندو تہذیب اور ہندو نظام حکومت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہندوستان زراعتی ملک ہے اس کی آبادی اسوقت بھی عموماً گاؤں میں رہتی تھی اور گاؤں کی سادہ زندگی کے واسطے برادرانہ پنچائت کافی تھی۔ چنانچہ پروفیسر ایشوری پرشاد لکھتے ہیں۔ کہ "شہروں کی عدالتیں شاذ و نادر نظر آتی تھیں۔ گاؤں میں پنچائت اپنے پرانے اصولوں کے مطابق مقدمات فیصل کر دیتی تھی"۔ ڈاکٹر بینی پرشاد اپنی کتاب جہانگیر میں صفحہ ۱۰۱ پر لکھتے ہیں۔ کہ" عدالتی معاملات کے واسطے گاؤں میں پنچائت تھی"۔ چونکہ پنچایت کا فیصلہ خدائی فیصلہ سمجھا جاتا تھا اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انصاف کے معاملے میں کسی ہندو کو کوئی اعتراض کرنے کا موقع نہ تھا۔

شہروں میں سلطنت کی طرف سے قاضی مقرر تھے جو مقدمات کو شریعت اسلامی، شہنشاہی فرمان، مُسلم اعتقادات اور ہندوستانی رواجات کے مطابق فیصل کرتے تھے۔ شروع شروع میں یہ قاضی

نہایت متعصب قسم کے ملا ہوتے تھے اور ممکن ہے کہ اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑتے وقت ہندوؤں کیساتھ ظلم ہوا ہو۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد غیر متعصب بادشاہوں کا اثر غالب ہوگیا۔ علاؤالدین اور محمد تغلق نے عمر بھر ان ملاؤں سے جنگ کی اور انکی طاقت کو زبردست نقصان پہنچایا۔

مسلمان بادشاہ عموماً انصاف پسند تھے۔ انھیں اپنی حکومت کو مضبوط بنانا تھا! اس لئے ان کے نزدیک ہندو اور مسلمان برابر تھے۔ ہندو بھی برابر انصاف پاتے تھے اور ان کو کبھی اس کا خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ اسلامی حکومت کے قاضی کی عدالت میں ایک مسلمان کے خلاف مستغیث ہیں۔

چنانچہ (Woolsey Haig) اپنی کتاب (Cambridge History VIII) میں رقم طراز ہے۔ کہ:-

"یقیناً ہندو مسلمانوں کے خلاف انصاف حاصل کر سکتے تھے کیونکہ برنی کے بیان کے مطابق دہلی کے ساہوکار اور ملتانی سیٹھ بلبن کے دربار کے امراء کی فضول خرچیوں اور اسراف کی بدولت امیر ہوگئے تھے۔ یہ امراء صرف خود ہی قرض نہ لیتے تھے بلکہ ان کے لواحقین انکے نام سے قرض لیکر ان کو دھوکا دیتے تھے۔ دربار کے افضل ترین امراء بھی ہندوؤں کو دھوکا دیکر ان کے جائز حق سے محروم نہ کر سکتے تھے"

بلبن کی عدل گستری کی یہ حالت تھی کہ بقول (Woolsey Haig) اس نے بڑے سے بڑے امیر کو کوڑوں سے صرف اس واسطے پٹوا کر قتل کرا دیا تھا۔ کہ اس نے اپنے ایک ہندو مشلچی کو بغیر کسی جرم کے قتل کروا دیا تھا۔

محمد تغلق بھی اگرچہ بدنام عالم ہے لیکن بے انتہا انصاف پسند تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ قاضی راشی ہو چلے ہیں تو یک قلم ان کو برطرف کر دیا اور انکی جگہوں پر ایسے آدمی مقرر کئے جو فقہ و حدیث سے زیادہ عدل و انصاف پر ایمان رکھتے تھے۔ انکو ہدایت کی گئی کہ ہندوستانی رسم و رواجات کا پورا خیال رکھا کریں۔

محمد تغلق کے متعلق ایک واقعہ اسکی انصاف پسندی کو ظاہر کرتا ہے۔ کسی شخص نے عدالت میں جا کر سلطان کے خلاف استغاثہ دائر کیا۔ سلطان طلب کیا گیا اور وہ مجرم کی حیثیت سے حاضر ہوا۔ قاضی نے اس کے خلاف فیصلہ کیا اور سلطان نے قاضی کے فیصلہ کے مطابق کوڑوں کے واسطے اپنی پیٹھ پیش کر دی۔ صرف یہ واقعہ ظاہر کر دیتا ہے۔ کہ اس زمانہ کا مطلق العنان شہنشاہ کسقدر منصف مزاج تھا۔ اس قسم کے حاکم کے متعلق ہم یہ کب گمان کر سکتے ہیں وہ ملک کی اکثریت کے حقوق کو پامال کرتا

ہو گا۔ ابن بطوطہ اپنے ملک میں پہنچکر کہتا ہے: "تمام انسانوں سے زیادہ (محمد تغلق) منکسر المزاج اور انصاف پسند ہے"

مغلیہ عہد حکومت میں میر عدل اور قاضی متفقہ طور پر مقدمات فیصل کرتے تھے۔ قاضی فرد جرم لگاتا تھا۔ اور میر عدل فیصلہ سناتا تھا۔ ہر اہم مقدمے کی اپیل صوبہ کی عدالت میں ہو سکتی تھی۔ شہنشاہ خود آخری عدالت تھا اور بہت ہی اہم مقدمات کو خود فیصل کرتا تھا۔

قاضی کی عدالت فوجداری اور دیوانی دونوں مقدمات کو فیصل کرتی تھی۔ فوجداری مقدمات شاہی قانون و فرمان کے مطابق طے ہوتے تھے۔ یہ قانون ہندو مسلمان دونوں کے واسطے ایک تھا۔ دیوانی کے ایسے مقدمات میں جن میں ایک فریق ہندو ہوتا تھا قاضی ہندو قوم کے رواجات اور رسموں کا خیال رکھتا تھا۔ بقول ایشوری پرشاد "ہندو قوم کے رواجات کو سلطنت بہ نظر احسن دیکھتی تھی۔" ڈاکٹر ایشوری پرشاد دوبارہ فرماتے ہیں "دیوانی کے مقدمات میں جبکہ ایک یا دونوں فریق ہندو ہوتے تھے ان کے قوانین و رسوم کے مطابق مقدمہ کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ قاضی کے واسطے ضروری تھا کہ وہ ہندو قانون سے کما حقہٗ واقف ہو"۔ کچھ عرصہ کے بعد دیوانی میں ایک ہندو پیشکار بھی مقرر کیا گیا تاکہ وہ قاضی کو ہندو قانون وراثت وغیرہ سمجھا سکے۔ اورنگ زیب نے انہیں پیشکاروں کو ایک مرتبہ برطرف کیا تھا۔ لیکن فوراً اس خیال سے کہ انکی غیر موجودگی میں ہندو قانون پر پوری طرح سے عمل نہ ہو سکے گا وہ دوبارہ مقرر کر دئے گئے۔

یہ تو شہروں کی کیفیت تھی۔ دیہاتوں میں کوئی شخص شریعت اور اسلامی قوانین کا نام بھی نہ جانتا تھا۔

اسلامی سلطنت میں طریقۂ عدالت و انصاف بھی آسان تھا۔ ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتے ہیں "عدالت کی کارروائی نہایت آسان تھی۔ فریقین کو چوبیس گھنٹے سے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑتا تھا۔ حکم سنانے کے بعد اگر اپیل نہ کیجاتی تو حکم پر فوراً عمل کیا جاتا (Terry) ٹیری لکھتا ہے۔ کہ "مقدمات کے اسقدر جلد فیصل ہو جانے سے لوگ آرام و خاموشی کی زندگی بسر کرتے تھے"۔

مغلوں کا سب سے بڑا جوہر یہ تھا کہ انھیں انصاف و عدل سے عشق تھا۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں حتیٰ کہ اورنگ زیب تک نے اس عدل گستری کی بدولت دنیا سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔ اکبر کے متعلق (Monserrate) لکھتا ہے۔ "بادشاہ کی انصاف پسندی اور حفاظت حقوق عامہ قابل قدر ہے۔ وہ اپنے ملازمین کے جرم جو انہوں نے دوران ملازمت میں کئے ہوں کبھی معاف نہیں کرتا۔ وہ خلوص دل کیساتھ کوشش کرتا ہے کہ جرم کی سزا انتقام کے خیال سے نہیں بلکہ جرم کی نوعیت سے ملے۔ جلاد کو ایذا رسانی کے مختلف سامان دئے گئے ہیں۔ لیکن ان سے کسی کو سزا نہیں ملتی۔ شاید ان کا مقصد صرف مجرموں کو خوف زدہ کرنا ہے"۔

جہانگیر کے عدل و انصاف کے افسانے اب بھی زبان زد خلائق ہیں۔ اسکی طلائی زنجیر کہانی نہیں بلکہ واقعہ ہے۔

خاکِ پروانہ

از منشی گرسرن لال ادیب لکھنوی بی۔ اے

خاک پروانہ بظاہر خاک ہے — ہاں مگر یہ خاک خاکِ پاک ہے
سُرمہ ہے اہلِ نظر کے واسطے — درسِ عبرت ہر بشر کے واسطے
ہے یہ خاک اک داستانِ حُسن وعشق — ذرّہ ذرّہ ترجمانِ حُسن و عشق
ذرّہ ذرّہ اس کا پُر تاثیر ہے — دردِ دنیا کے لئے اکسیر ہے
اس کے ہر ذرّہ میں سوز و ساز ہے — اس کا ہر ذرّہ سراپا راز ہے
درسِ آموزِ وفا کہئے اسے — زندگی کا مدعا کہئے اسے
مردِ غافل گوشِ دل سے سُن ذرا — خاک پروانہ سے آتی ہے صدا
"دیکھ لے محو تماشائے حیات — مجھ پہ قربان ہے تمنّائے حیات
مجھ میں مضمر ہے بقائے زندگی — میں ہوں بیشک منتہائے زندگی
زندگی کیا گر نہ ہو جوش و خروش — ہو جب زینت نہیں شمعِ خموش
کوئی حسرت کوئی ارماں چاہیئے — اک جنونِ فتنہ ساماں چاہیئے"

جذباتِ جوش

شاعرِ اعظم حضرت جوش ملیح آبادی

دل کو آ محوِ جستجو کردے — مجھکو آوارہ کو بکو کردے
متبسّم ہو اور دنیا کو — محشرستانِ رنگ و بو کردے
پردہ عیبوں کا ڈھانکنے والے! — میرے دامن میں بھی رفو کردے
ہے وہی مرد جو دو عالم کو — غرق صہبائے مشک بو کردے
حُسن پہچانتا ہے عشق کے راز — تو ہی اب شرحِ آرزو کردے
یاد کرتا ہے بال بکھرائے — دل کا آئینہ روبرو کردے

جوش کو اے نگاہِ مے پرور
محرمِ رازِ رنگ و بو کردے

تنقید کتب

تمدّنِ عتیق

یہ بات ابھی تک پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچی ہے کہ تمدن انسانی کا گہوارہ ہندوستان ہے یا وسطی ایشیاء عراق ہے یا مصر۔ اس مسئلہ پر آئے دن نئی نئی کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جاتی ہیں۔ ہندوستان، عراق اور مصر کے آثار قدیمہ نے اس بات کو ضرور ظاہر کر دیا ہے کہ ان ممالک کا تمدن بہت قدیم ہے۔

ماہرین و محققین آثار قدیمہ کی مسلسل کوششوں سے اس کا بھی پتہ چل گیا ہے کہ کسی زمانہ میں عراق اور مغربی ہندوستان کا ایک تہذیب و تمدن تھا۔ عراق کی وادیِ دجلہ و فرات میں اور ہندوستان کی وادیِ دریائے سندھ میں عُور۔ بابل اور موہنجو دارو کے پُرانے کھنڈر کھودنے سے جو چیزیں برآمد ہوئی ہیں، وہ سب یکساں ہیں۔ اس کے علاوہ بعض طلائی مہریں بھی ہندوستان اور عراق میں یکساں برآمد ہوئی ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں ہندوستان اور عراق دونوں ایک بادشاہ کے زیر نگیں تھے۔ اور بعض فرمانرواؤں کے ناموں سے تو یہانتک گمان ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں بنگال سے لیکر قرطاجنہ (شمالی افریقہ) تک ایک ہی قوم آباد تھی۔ بنگال میں عرصہ تک "پال" خاندان کے راجاؤں کی حکومت رہی۔ وہاں ابتک ان کے نام لیوا موجود ہیں۔ اسی طرح عراق میں بھی سمیریوں کا ایک راجہ آشور بانی پال گذرا ہے۔ قرطاجنہ کا بہادر جنرل ہینی بال بھی پال خاندان کا رکن تھا۔ کیونکہ "بال" اور "پال" ایک ہی چیز ہیں۔ اسی طرح کسی وقت اجودھیا میں دشرت راجہ کا راج تھا۔ عراق میں بھی اسی نام کا ایک بادشاہ ہوا ہے۔ لیکن گردش ایام ان تمام قوموں اور سلطنتوں کو کھا گئی۔ اور ان کیساتھ ہی ان کے تمدنوں کے نشانات مٹ گئے۔ قدیم کھنڈروں میں سے کوئی چیز نکل آتی ہے تو پراچین زمانہ کی ان قوموں کے تہذیب و تمدن پر کچھ روشنی ڈالدیتی ہے۔ رفتہ رفتہ ان قوموں کے آثار قدیمہ کا اتنا زبردست خزانہ جمع ہو گیا ہے کہ اگر محنت اور دماغ سوزی سے کام لیا جائے تو آثار قدیمہ سے ان مٹی ہوئی قوموں کی مکمل تاریخ تیار ہو سکتی ہے۔ کتاب زیر نظر میں مسٹر عبدالواحد ایم۔ اے۔ اور محمد عطاء الرحمن بی۔ اے۔

لہ قیمت بے تصویر ایڈیشن دو روپیہ۔ باتصویر ایڈیشن تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب بکڈپو سٹی کالج، حیدرآباد دکن

پروفیسران سٹی کالج حیدرآباد دکن نے اسی بات کی متفقہ کوشش کی ہے۔

اس کتاب میں مصر، بابل، آشور اور فلسطین کے قدیم حالات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جو کسی زمانہ میں متمدن دنیا کی عظیم الشان سلطنتیں تھیں۔ اگرچہ ان زبردست قوموں کے حالات مختصراً بھی معمولی حجم کی ایک کتاب میں نہیں بیان کئے جا سکتے۔ لیکن فاضل مصنفین نے اپنی تصنیف کا دائرہ اسقدر وسیع کر دیا ہے کہ اسمیں (۱) آغاز گیتی (۲) کرشمۂ حیات (۳) نیانڈرٹالی انسان (۴) قدیم عصر الحجر (۵) جدید عصر الحجر (۶) ابتدائی تخیلات وعقائد (۷) تحریر کی ابتداء وغیرہ پر بھی مختصراً بحث کرنے کی ضرورت سمجھی گئی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نہ اس میں کامیابی ہوئی اور نہ اُس میں۔ اس کتاب کا ایک اور نقص اس کی ثقیل اور غیر مانوس اصطلاحات اور بے تکی ترکیبیں ہیں جنکی وجہ سے اسکی ادبی حیثیت قابل تقلید نہیں رہی۔ یہاں پر چند باتیں نمونتًا پیش کیجاتی ہیں۔

ثقیل اصطلاحات:۔

(۱) کمزور پا زحافہ یہ انگریزی لفظ Reptiles. کا ترجمہ ہے۔ جس کا سیدھا سادہ ترجمہ "پیٹ کے بل رینگنے والے جانور" بھی ہو سکتا تھا۔

(۲) پستانیان یہ انگریزی اصطلاح Mammals. کا ترجمہ ہے جنکو "دودھ پلانیوالے جانور" کہا جا سکتا ہے۔

(۳) استخوانی باقیات یہ غالبًا Skeletons. کا ترجمہ ہے۔ مگر اس کے لئے "پنجر" یا "ڈھانچہ" کا لفظ موجود ہے۔

(۴) خماؤ (لائنوں کا) Curvature. "خم" کافی ہے۔

(۵) فلزی زر Metallic Coins. کا ترجمہ ہے مگر اس کے لئے "دھات کے سکے"

(۶) طلاء البقرہ مصنفین نے تشریح کی ہے کہ وہ طلائی سکہ جو ایک گائے کی قیمت کے برابر ہوتا تھا۔ ہمارے نزدیک اگر ہندی سے نفرت نہ ہو تو اس کا بہترین ترجمہ "ایک گئومول" ہو سکتا ہے۔

(۷) عیقرہ، طیرہ وصیدان ان ناموں کو معترب کرنیکی فضول کوشش کی گئی۔ کیونکہ عربی میں ان شہروں کے نام پہلے ہی سے عکہ، طیر اور صیدا موجود ہیں۔

(۸) مخاطرے Adventures.

اکثر مقامات میں اس کتاب کی عبارت بھی اُلجھی ہوئی ہے۔ مثلاً:۔

(۱) عہد حجری کے انسانوں کی نسبت لکھا ہے۔ کہ "بے سروسامانہ زندگی پر ان کی گذران تھی"۔ "زندگی" پر کسی کی گذران نہیں ہوتی۔ غالباً فاضل مصنفین یہ لکھنا چاہتے تھے کہ "انکی زندگی بے سروسامانی سے بسر ہوتی تھی"۔

(۲) ہر شہر میں ایک یا متعدد معابد کا ہونا زندگی کا "ممتاز خاصہ" تھا۔ معلوم نہیں "ممتاز خاصہ" کے بجائے "نمایاں خصوصیت" کیوں نہ لکھا گیا۔

ایک جگہ پر فاضل مصنفین نے لکھا ہے۔ کہ

"نقاش تعین فاصلہ کے تعقّل سے بے بہرہ تھا"۔ شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ "نقاش خطوط میں مناسب فاصلہ دینا نہیں جانتا تھا"۔

جہاں تک محاسن ظاہری کا تعلق ہے۔ کتاب کی لکھائی، چھپائی، کاغذ، جلد بندی سب عمدہ ہے، حجم ۲۳۴ صفحات

نئی روشنی [۱]

یہ پانچ ایکٹ کا ایک دلچسپ ڈرامہ ہے۔ جسے مسٹر محمد فضل الرحمٰن صاحب حیدرآباد دکن نے تصنیف کرکے اُردو ڈراموں میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ڈرامہ کی دلچسپی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جس طرح اودھ کے مشہور ادیب پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے فسانۂ آزاد میں فنِ کردار نگاری کا خاتمہ "خوجی" پر کر دیا ہے۔ اسی طرح اس ڈرامہ کی جان "فصاحت بیگم" ایک دولتمند شوقین بیوہ ہے۔ جسے اپنی فصاحت اور بلاغت پر ضرورت سے زیادہ ناز ہے۔ وہ تقریر میں موٹے موٹے لفظ استعمال کرتی ہے۔ جن کے معنی سے خود بھی واقف نہیں۔ الفاظ کے غلط استعمال سے اسکی گفتگو نہایت مذاق آمیز ہو جاتی ہے۔ مثلاً اپنی بھانجی کو سمجھاتی ہوئی بیگم صاحبہ فرماتی ہیں۔

"دلربا! یہ دل گردہ کا بہانہ بیکار ہے۔ جس وقت تمہارے مرحوم خالو کیساتھ میری شادی ہوئی تو کیا میرا ان پر دل آیا تھا۔ یا میں نے انکی صورت دیکھی تھی، یا نام سُنا تھا؟ کبھی نہیں، فقط متوکل باللہ اباجان نے مرحوم کیساتھ میرا نکاح پڑھوا دیا، خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہ شادی کے بعد ہم دونوں میں کس درجہ محبت پیدا ہوگئی، مرحوم کس مہربانی اور شقاوت سے پیش آتے تھے اور میں ان کی کتنی دلگیری کرتی تھی"۔

ایک چھوٹا سا فقرہ اور ملاحظہ ہو:۔

---

[۱] ضخامت ۱۵۶ صفحات، تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

"نواب کامران دقیانوسی خیال کے آدمی ہیں۔ وہ تعلیم نسآن (نسوان) اور عورتوں مردوں کے اختلآج (اختلاط) کو پسند نہیں کرتے"

کپتان شیر خاں کا کریکٹر بھی بہت دلچسپ ہے۔ اس ڈرامہ کو حیدر آباد دکن کی انجمن ترقی ڈرامہ نے اگست ۱۹۳۳ء میں اسٹیج پر کھیلا بھی تھا۔ بہرحال یہ ڈرامہ ہر حیثیت سے دلکش و سبق آموز ہے۔ اسکی قیمت عہ البتہ کسیقدر زیادہ ہے۔

ظاہر و باطن[1]

یہ ڈرامہ بھی مولانا محمد فضل الرحمٰن صاحب حیدر آباد دکن کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اور اس میں بھی فصاحت بیگم کے جوڑ کی ایک حکمت بیگم ہیں۔ جنھیں در اصل "حماقت بیگم" کہنا چاہیئے۔ اور ایک خود رو شاعر اخگر اور ان کے چچا ابا کے کیرکٹر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اخگر کا کیرکٹر ان حشرات الارض شاعروں کے لئے خاص طور پر درس عبرت ہی جو ایسے ایسے شعر کہتے ہیں ؎

دنداں سپید ایسے کہ جوں نافۂ غزال　　اور اس پہ وہ چمکتے ہوئے کالے کالے بال

اور پھر اس پر خود کو داغ و امیر یا مومن و غالب سے کم نہیں سمجھتے۔

لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، تقطیع چھوٹی۔ حجم ۱۸۳ صفحات۔

ایکٹریسوں کی آپ بیتیاں[2]

یہ کتاب گیارہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں سے ہر کہانی کو اس طرح پیش کیا گیا ہے گویا ہندوستان کی کسی مشہور اور زندہ ایکٹریس نے اپنی آپ بیتی لکھ کر فاضل مؤلف مسٹر اویس احمد ادیب ایم۔ اے کو ارسال کی ہے۔ اور انھوں نے از راہ پردہ پوشی راقمۃ الحروف کا نام حذف کر کے تمام کہانیاں تقریباً ساڑھے چار جزکے ایک مجموعہ میں شامل کر کے شائع کر دی ہیں۔ ہر شخص کا مذاق جداگانہ ہوتا ہی۔ ممکن ہے کوئی صاحب ان کہانیوں سے لطف اندوز ہوں۔ ہمارے نزدیک تو اس کے شائع ہونے سے اس کا شائع نہ ہونا بہتر تھا۔ کیونکہ اس تصنیف سے لائق مصنف کی شہرت میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا طرز بیان بالکل عریاں اور بازاریت لئے ہوئے ہے۔

---

[1] قیمت ڈیڑھ روپیہ ملنے کا پتہ:- مکتبہ ابراہیمیہ لمیٹڈ حیدر آباد دکن [2] قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:- احمد بک ایجنسی مادھو گنج کٹرہ روڈ۔ الہ آباد

نوحہ

وفات حسرت آیات منشی پریم چند صاحب فسانہ نگار

از منشی کرشن سہائے صاحب ہتکاری متخلص بہ وحشیؔ وکیل کانپور

دیدۂ خونبار وقتِ خونفشانی آگیا — دیکھ دنیائے ادب پر وہ اندھیرا چھا گیا
گلشنِ اُردو و ہندی جس سے زینت پا گیا — وہ گلِ یکتائے گلزارِ ادب مُرجھا گیا

خونفشاں ہو خونفشاں اے دیدۂ خونابہ بار
اب نہ آئے گی گلستانِ ادب میں یہ بہار

وہ کہ افسانوں سے جس کے پریم کی گنگا بہی — وہ کہ جس کے دردِ دل سے دل کی دنیا جاگ اُٹھی
ڈال کر عالم پہ جس نے اک نگاہِ سرسری — فطرتِ انساں کی تصویرِ مکمل کھینچ دی

ہو رہا ہے آج وہ عالم کی نظروں سے نہاں
آرزوئے زندگی اب تو کہاں اور وہ کہاں

کیا بتائیں کیا تمنّائے دلِ ناکام ہے — بازگشتِ زندگی۔اک آرزوئے خام ہے
جانتے ہیں ہم سکوں ہر درد کا انجام ہے — صبر کہتے ہیں جسے مجبوریوں کا نام ہے

صبر پھر بھی اس دلِ مجبور میں آتا نہیں
دھو رہے ہیں اشک لیکن داغِ دل جاتا نہیں

اس جہانِ بیوفا سے یک بہ یک منھ موڑ کر — زندگی کی بندشوں اور بیڑیوں کو توڑ کر
رشتۂ اُلفت زمانہ بھر سے اپنا جوڑ کر — جا رہا ہے تو کہاں ہم سب کو تنہا چھوڑ کر

واسطہ اپنی محبّت کا تجھے۔کچھ مُنھ سے بول
مرنے والے اب دمِ آخر تو آنکھیں اپنی کھول

تجھ کو میرے رشتۂ اُلفت نے کھینچا بار ہا — تو نے فخرِ میزبانی مجھ کو بخشا بار ہا
دل کا نقشہ دردِ دل سے تو نے بدلا بار ہا — خود بھی رویا اور مجھ کو بھی رُلایا بار ہا

میری فطرت کو بھی نسبت تھی ترے جذبات سے
تیری ہر اک بات سے حرکات سے سکنات سے

میں ملا تھا تجھ سے جب یہ سن کے تو بیمار ہے
میں نہ سمجھا تھا یہ تیرا آخری دیدار ہے
میں نے دیکھا تو نحیف و ناتوان و زار ہے
پھر بھی گوہر بیز و گوہر ریز و گوہر بار ہے

یاد ہے تیری محبّت کی کہانی یاد ہے
وہ دم دیدار تیری گلفشانی یاد ہے

مدّتوں دہرائیں گے یہ پڑھ پڑھ کے افسانے ترے
تجھکو بھولیں گے قیامت تک نہ دیوانے ترے
حشر تک جاری رہیں گے یونہی پیمانے ترے
تیری صہبا سے نہ خالی ہونگے میخانے ترے

الوداع اے ساقیٔ خمخانۂ علم و ادب
الوداع اے زینت کاشانۂ علم و ادب

الہامی تاریخ وفات

مولانا حالی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ قرآن مجید کی آیات سے کسی کی تاریخ وفات کا مہیّا ہو جانا عجائبات سے کم نہیں۔ مگر ایک ہمارے مہربان اور پریم چند صاحب کے قدر دان دوست نے قرآن مجید سے پریم چند صاحب کی تاریخ وفات نکالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میں ایک دن قرآن کی تلاوت کر رہا تھا مجھے خیال آیا کہ اگر قرآن کی کسی آیۃ سے تاریخ وفات نکل آئے تو کیا خوب ہو۔ میں نے مختلف مقامات میں کوشش کی آخر ایک مقام پر نگاہ ٹھہر گئی میں نے دعا کی اور اُس کے بعد آیات کے عدد گنے تو ۱۹۳۶ء نکلے الحمد للہ کہ یہی خواہش تھی۔ چنانچہ آپ کی دلچسپی کے لئے لکھتا ہوں اگر مناسب خیال فرمائیں تو اسے زمانہ میں شائع کردیں۔ آیات یہ ہیں:۔

"اُدْخُلِی فِی عِبَادِی وَ ادْخُلِی جَنَّتِی ؕ"

۱۹۳۶ سنہ عیسوی

یہ سورۃ والفجر کی آخری دو آیتیں ہیں اور اِن کے معنی ہیں (خدا اپنے پیارے سے کہتا ہے) "میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا" از روئے جمل اُن کے اعداد ٹھیک ۱۹۳۶ نکلتے ہیں +

(ایڈیٹر زمانہ)

"پریم چند"

ابھی مشکل سے دو ڈھائی مہینے ہوئے ہونگے کہ ہم نے زمانہ میں پریم چند کی علالت کی تشویش انگیز خبر شائع کی تھی۔ آج ہم اس ہر دلعزیز ادیب کی ناوقت وفات پر ماتم کر رہے ہیں۔ تین سوا تین ماہ کی علالت میں کام تمام ہو گیا۔ کئی ماہرین کا علاج ہوا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اور آخر اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ع کو پریم چند صرف چھپن سال کی عمر میں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے!

ہم دھوکے میں تھے کہ ابھی اس مقبول زمانہ انشاپرداز کے فیض رسانی کا سلسلہ کچھ دنوں اور جاری رہیگا۔ اور اس کی آئندہ خدمات پہلے سے بھی زیادہ شاندار ہونگی۔ ہم نے یہ خیال باندھ رکھا تھا کہ اس کے کہنہ مشقی کے کارنامے پچھلے احسانات کو ماند کر دیں گے۔ زور قلم کیساتھ ساتھ خیالات میں جو پختگی پیدا ہو گئی ہے اُس سے نوجوانانِ وطن کے رہنمائی میں بڑی مدد ملیگی لیکن یہ سب خیالات خام نکلے۔ افسوس "من درچہ خیالیم فلک درچہ خیال"۔

اس بے ثبات دنیا میں ہماری پیش بندیاں کیسی بے بنیاد ثابت ہوتی ہیں!

آہ اُمید محبّت کی بر آئی نہ کبھی

پریم چند کی ابتدائی زندگی کشمکش میں بسر ہوئی تھی۔ اب البتہ کسیقدر آسانی کا وقت آیا تھا اور ملک میں اُنکی تصانیف کی قدر ہونے لگی تھی۔ اور عوام بھی اُنکی باتوں کو دھیان اور اُنکے افسانوں کو شوق سے سننے لگے تھے۔ مگر ہمارا بےنظیر داستان گو لوگوں کی قدر شناسی سے بے نیاز اور دوستوں کے اعتراف کمال سے بے پرواہ ہو کر زندگی کی داستان کہتے ہی کہتے سو گیا اور ایسی نیند سو گیا کہ حشر تک جاگنے کی قسم ہے۔

پریم چند کی وفات شمالی ہند کی ادبی دنیا کے لئے ایک سانحہ عظیم ہے جس کا ماتم ملک میں عرصہ دراز تک رہیگا۔ یہ رسمی الفاظ نہیں ہیں بلکہ امر واقعہ کا اظہار ہے کہ پریم چند کی ناوقت موت سے اُردو ہندی دونوں کے صفِ اوّل کے مصنفین میں ہمیشہ کے لئے ایک خلا ہو گیا ہے جو شاید کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔ پچھلے تیس سال کے اندر پریم چند نے ہندوستانی زبان کی ان دونوں شاخوں کی جو شاندار خدمت کی اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ دونوں زبانوں میں انھیں یکساں مہارت تھی اور دونوں میں اُن کو یکساں کامیابی حاصل ہوئی۔ دونوں کے ادبی سرمایہ میں اُنہوں نے گرانقدر اضافہ کیا جس کی بدولت ملک کا ادبی خزانہ مالامال ہو گیا ہے۔ اُس کا بار احسان اہل ملک کی گردن پر اُسوقت تک رہے گا

جب تک یہ دونوں زبانیں دنیا میں باقی ہیں۔

پریم چند کی اس شاندار خصوصیت پر جسقدر فخر کیا جائے کم ہے۔ کسی ہندوستانی ادیب کی اس سے زیادہ اور کیا عزت ہوسکتی ہے کہ جس طرح آج انھیں اُردو کے قدردان اپنے وقت کا بہترین ادیب تسلیم کر رہے ہیں اُسی طرح ہندی کے جوہر شناس بھی اُنھیں زمانۂ حال کا اعلیٰ ترین انشاپرداز مانتے ہیں۔

پریم چند کو ہندی ادیبوں نے "اپنیاس سمراٹ" یعنی "افسانہ نگاری کے بادشاہ" کا قابل رشک خطاب دیا ہے۔ اُردو خواں جماعت عملی حیثیت سے انکی کافی قدردانی نہ کرسکی ہو لیکن دل سے ان کے قلم کا لوہا سبھوں نے مانا ہے۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس بے نفس پرستارِ وطن اور خوش فکر خادمِ ملک نے اپنی تمام زندگی یکساں خلوص اور یکساں مستعدی کیساتھ دونوں زبانوں کی توسیع و ترقی کی کوشش میں ختم کردی۔ اُس نے جو ادبی خدمت کی وہ ستائش کی پرواہ یا صلہ کی تمنّا سے یعنی بلکہ فرض سمجھکر کی اُس نے کسی ادنیٰ غرض یا ذاتی مقصد سے نہیں بلکہ فطری جوش اور طبعی ذوق سے متاثر ہو مجبور ہوکر ہوش سنبھالتے ہی اور موقع پاتے ہی ہندوستانی ادب کو اس طرح فروغ دینا شروع کیا جس طرح اُفقِ مشرق سے آفتاب عالمتاب طلوع ہوکر کسی پر احسان جتلائے بغیر دنیا کو روزانہ منوّر کردیتا ہے۔

آج جب ادبی دنیا کا یہ آفتاب عالمتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا ہے تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا ہے۔ آج کل جب آئے دن اردو ہندی کی باہمی رقابت میں ترقی ہورہی ہے۔ جب ہمارے ادبی رہنما خواہ مخواہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہورہے ہیں۔ پریم چند کے بعد ہمکو کوئی انشاء پرداز ایسا دکھائی نہیں دیتا ہے جو دونوں کے درمیان سفیرِ صلح کی خدمت انجام دیسکے اور جس سے باہمی غلط فہمیاں رفع کرنے کی اُمید کی جاسکے۔ ملک میں لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ انشاپردازوں کا قحط نہیں۔ شاعروں کی بھی ہر طرف بہتات ہے لیکن ایسے لکھنے والے کہاں ہیں جنکو قدرت نے تخلیق کا مادہ بخشا ہو جنکو فطرت نے اتفاق و اتحاد کی تلقین کا حق عطا کیا ہو جو فروعی تکلّف سطحی اختلافات اور ظاہری تصنّع سے بالاتر ہوکر عوام کو زندگی کے حقایق کی طرف متوجہ کرسکیں اور جنکی بات دل پر نقش ہوکر بیٹھ جائے!

پریم چند کو قدرت نے یہ مادہ فیاضی کیساتھ عطاء کیا تھا۔ جس خلوص و مستقل مزاجی بلند نظری و اولوالعزمی کیساتھ اُنھوں نے اپنے خداداد زورِ قلم کو ملک اور قوم کی اعلیٰ ترین خدمت کے لئے وقف کردیا تھا

وہ موجودہ زمانہ کی ادبی تاریخ کا ایک زرین کارنامہ اور ہمارے ملکی ادب کی عظیم الشان داستان کا تمہیدی باب ہے جس پر آئندہ ہماری انشاپردازی کی قدروقیمت کا دارومدار ہوگا۔

پریم چند کے افسانے چاردانگ عالم میں ہمارے ملک اور ہمارے ادب کا نام روشن کریں گے۔

پریم چند نے اپنی تمام تصانیف میں ہمکو اپنے ملک پر فخر اور اہل ملک سے محبت کرنیکی عملی تعلیم دی ہے۔ اُنہوں نے پسماندہ سے پسماندہ طبقوں کی فطری شرافت کو نمایاں کرکے وطن پرستی کا حق ادا کیا ہے اُنہوں نے پست و پامال لوگوں میں بھی انسانیت کے اعلیٰ ترین جوہر ڈھونڈھ نکالے ہیں۔ اُن کے ناول ترجمان حقیقت ہیں۔ اُنکے قصے درس عبرت ہیں۔ اُن کی سیرت نگاری نے مردانہ محاسن اور زنانہ خوبیوں کی حدیں کھینچ دی ہیں۔ اُن کے ناولوں کے کیریکٹر خیالی دنیا کی مخلوق نہیں بلکہ روزمرہ زندگی کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ اُن کے مضامین رہنمائے حقیقت ہیں اُنکے ڈرامے انسانی فطرت کے دلنشین عکس ہیں۔

پریم چند کا دل درد آشنا اور اُن کا دماغ ہمہ گیر تھا۔ اُنکی نگاہ وسیع اور حقیقت بین تھی اُنکی طبیعت ہمدرد و فیاض اور اُنکی نیت بے لوث واقع ہوئی تھی۔ وہ دنیوی مصائب ومشکلات کے دشوار گذار مرحلوں سے گذر چکے تھے۔ وہ دیہات میں پیدا ہوئے تھے اور اوائل عمر میں دیہات کی آزاد بے تصنع و بے تکلف زندگی بسر کی تھی۔ وہ عوام کے روزمرہ رنج و راحت کے شریک حال تھے۔ دنیا کے نشیب و فراز سے دوچار ہو چکے تھے۔ اعلیٰ و ادنیٰ سیرتوں کا تجربہ کر چکے تھے اس لئے وہ ہر طبقے اور ہر جماعت کے نقطۂ خیال سمجھنے کی پوری اہلیت رکھتے تھے۔ اوسط طبقہ کی روزمرہ مشکلات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ شروع ہی سے اُن پر گرہستی کا بار پڑ چکا تھا اسلئے سادہ زندگی کے قدردان اور محنت وکفایت کے عادی ہوگئے تھے۔

قدرت نے ذوق سلیم کیساتھ اُنھیں خوش طبعی اور انتہائی زندہ دلی بھی عطا کی تھی۔ اس لئے جب گھر میں بہتات نہ تھی اور تن آسانی کا کوئی سامان میسر تھا اُس وقت بھی وہ ہر دم بشاش اور شگفتہ خاطر رہتے اور سارا وقت ہنستے ہنساتے گذار دیتے تھے کسی کی بیوفائی اور بدسلوکی پر بھی اُنکا مزاج برہم نہ ہوتا تھا۔

پریم چند کا دماغ بہت سلجھا ہوا تھا۔ اس لئے وہ آسانی سے زندگی کے اہم مسائل کی تہ تک پہونچ جاتے تھے۔ خلوص قلب کی بدولت وہ اپنے مخالفین اور منافقین کے جذبات سے بھی ہمدردی کرسکتے تھے۔ اُن کے دل میں پریم کا دریا موجزن تھا۔ اسلئے دوسروں کے منشاء اور نقطۂ خیال کو جلد ہی

سمجھ لیتے اور غیروں کے مشکلات کا بھی پورا اندازہ رکھتے تھے۔ انکی وسیع ہمدردی کا راز انکی حق شناسی اور معاملہ فہمی پر مبنی تھا۔ انکی ہردلعزیزی کا اصل سبب یہ تھا کہ انھیں عوام کے جذبات و خیالات سمجھنے میں کمال حاصل تھا۔ پریم چند کے قلم میں اسلئے زور تھا کہ انکا قلب بیحد حساس واقع ہوا تھا۔ اُن کے قصّے اسلئے دلکش ہیں کہ ان میں مختلف پیرائوں میں زندگی کی سچی واردا تیں بیان کی گئی ہیں۔ انکی داستانیں اسلئے مقبول خاص و عام ہیں کہ اُن میں انسانی ارادہ اور عمل کی جدّت طرازیاں قلمبند ہیں۔ انہوں نے سرشت انسانی کے صحیح خاکے پیش کئے اور کشمکش حیات کے سچے مرقع کھینچے ہیں۔ مغربی تہذیب اور مشرقی شائستگی کے تصادم کے دلچسپ نتیجے دیکھنا ہو تو پریم چند کے مختصر افسانے پڑھئے۔ یہ قصّے ایک طرف تہذیب قدیم کے رنگ برنگ مناظر دکھاتے ہیں تو دوسری جانب موجودہ ہندوستان کی معاشرتی کشمکش کے سچے فوٹو ہیں۔

اپنے قصّوں میں اس بےمثال ادیب نے انسانی جذبات کو بے نقاب کرکے سامنے رکھدیا ہے۔ جذبات کے وہ ماہر کامل تھے۔ مختلف طبائع کے گوناگوں خصوصیات اور طرح طرح کے مخالف و متضاد خیالات پر انھیں پورا عبور تھا۔ ہر طبقے کے جذبات اور ہر موقع کے تخیلات کے ہُوبہو ترجمانی کا انھیں وہی ملکہ حاصل تھا جو ایک چابکدست مصوّر کو لوگوں کے خط و خال نمایاں کرنے کا ہوتا ہے۔

پریم چند کی روحانی عظمت اور اُن کے شرافت نفس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ زندگی کی مسلسل جدوجہد میں انکی بلند حوصلہ طبیعت کبھی پستی کی جانب مائل نہیں ہوئی۔ دنیا کی بیقدری۔ عزیزوں کی سرد مہری۔ احباب کی بیوفائی غرض کوئی چیز اُنکے سرچشمۂ محبت کو خشک نہ کرسکی۔

ماں کی شفقت سے وہ بچپن ہی میں محروم ہوگئے تھے۔ والد کا سایہ بھی لڑکپن ہی میں اُٹھ گیا۔ جس سے ذاتی مصارف کے علاوہ سوتیلی ماں بھائی اور ننہال کے بعض افراد کا بار کفالت بھی اُن کے سر آپڑا۔ ابھی کھانے پینے۔ کھیلنے کودنے اور پڑھنے لکھنے کے دن تھے۔ تعلیم بھی تکمیل کو نہ پہونچنے پائی تھی۔ کہ انکو اپنا اور اپنے لواحقین کا پیٹ پالنے کی فکر دامنگیر ہوگئی۔ سب سے پہلے پانچ روپیہ ماہوار کی ٹیوشن ملی جس میں سے قریب نصف میں وہ خود اپنا گذر کرتے تھے اور بقیہ اپنے بے والی و سرپرست خاندان کی بسر اوقات کے لئے دیدیتے تھے۔ پہلی بیوی سے خوشی کے بجائے رنج ہی پہونچا۔ اور اس کے لیے انھیں اپنے اور پرایوں کی غلط فہمی کا بھی شکار ہونا پڑا۔ جب چار پیسے ہاتھ آئے تو گندم نما جو فروش احباب سے بھی سابقہ ہوا۔ بیسیوں حضرات نے دھوکے دئے اور معمولی معمولی رقمیں وصول کرکے روپوش ہوگئے۔ اُن عزیزوں نے جن سے لواحقین کو بڑی بڑی تمنائیں تھیں آرزوؤں کا خون کیا۔ مگر اس نیک مرد

کے چہرے پر شکن تک نہ پڑی۔ اور اسکی خوش خلقی وہمدردی میں کوئی فرق آیا۔ انسانی شرافت پر بھی اس کا اعتقاد کم نہ ہوا۔ اس کا ہنس مکھ چہرہ اس کے مزاج کی شگفتگی اور اس کے فلک شگاف قہقہے بدستور قائم رہے۔ اسکی وطن پرستی، دوست نوازی اور اولو العزمی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ بلکہ اس کے برعکس عزت وشہرت کی روز افزوں ترقی اور مالی ذرائع میں تھوڑی بہت وسعت کے ساتھ اس کا عزم بلند نقطۂ خیال وسیع اور اسکا دل کشادہ ہوتا گیا۔

چند ماہ کا واقعہ ہے کہ ایک چالاک نوکر گھر کا بہت کچھ اثاثہ لیکر چلدیا۔ بیوی کے زیور۔ کئی سو روپیہ نقد۔ کچھ سرکاری کیش سرٹیفکٹ وغیرہ ایک صندوق میں بند تھے۔ اور کارگذار ملازم اسی کو لیکر غائب ہو گیا۔ اس اندوختہ کی تلافی آسان نہ تھی لیکن پریم چند اس واقعہ کا ذکر بھی معمولی خندہ روئی کیساتھ کرتے تھے۔ انکی اہلیہ محترمہ نے بھی جو خود ایک قابل مصنفہ اور بڑی نیک سیرت و بلند ہمت خاتون ہیں اس کا چنداں خیال نہ کیا۔ پریم چند سے جب اس کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ زیور تو عرصہ سے بیکار ہی رکھا تھا۔ بیوی کو مدت ہوئی زیورات کا شوق ہی باقی نہیں رہا اور نقد کی بھی تھوڑی بہت تلافی ہو گئی۔ دو ہی چار روز کے اندر کسی کتب فروش نے دو سو روپیہ یکمشت بھیجدئے جس سے دونوں نے اپنے جی کو خوش کر لیا اور سمجھ لیا کہ قرض رہزن کا ایک حصہ تو مل ہی گیا۔ لقیہ کا ملال کرنا انہوں نے عبث سمجھا

غرض چاہے جس پہلو سے دیکھا جائے پریم چند جیسے آدمی صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے ہی شخصوں کی موت قحط الرجال کہلاتی ہے۔ آج صرف پریم چند کا خاندان اور اُنکے احباب خاص ہی انھیں نہیں رو رہے ہیں بلکہ تمام ملک میں اُنکا ماتم برپا ہے۔ واقعی پریم چند کو کسی خاص قوم یا ملت کا رکن خیال کرنا یا کسی ایک صوبے کا باشندہ سمجھنا یا کسی مختص زبان یا ادب کا مصنف قرار دینا صریحاً غلط ہے۔ وہ تمام ہندوستان کے سچے قایقام اور انسانی فطرت کے پکے جوہری تھے۔ اور بقول ٹیگور اُن کی ادبی شہرت وعظمت صوبجاتی حدود سے بالاتر تھی۔ اُن کی موت سے ملک واہل ملک دونوں کو نقصان عظیم پہونچا ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

منشی پریم چند اور زمانہ و آزاد

زمانہ و ایڈیٹر زمانہ کیساتھ پریم چند کا بہت پرانا تعلق تھا۔ زمانہ کا پہلا پرچہ مخدومی بابو شیو برت لال صاحب ورمن کے (جواب ایک رادھا سوامی سمپرداے کے گورو ہیں) ایڈیٹری میں فروری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ ورمن صاحب چند ہی ماہ بعد یعنی نومبر ۱۹۰۳ء میں زمانہ ایڈیٹری کا بار راقم الحروف پر ڈال کر اس سے کنارہ کش ہوگئے۔ سال بھر کے اندر ہی اندر پریم چند جی سے جن کا اصلی نام دھنپت رائے تھا خط وکتابت شروع ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۴ء کے آخر تک وہ بھی زمانہ کے قلمی معاونین میں شامل ہوگئے۔ جہانتک یاد پڑتا ہی آپ نے سب سے پہلے ایک تنقیدی مضمون جنوری ۱۹۰۵ء میں زمانہ میں شائع ہونیکے لئے اور ایک ناول کا مسودہ بغرض مشورہ بھیجا تھا ناول کیلئے پبلشر کی تلاش تھی۔ چنانچہ اسمیں ذرا دیر ہوئی تو آپ نے ایک شکایت نامہ لکھا تھا[1]۔ اسوقت آپکا ایک کارڈ مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۰۵ء اور ایک خط مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۵ء ہمارے پیش نظر ہی۔ الہ آباد آپ ٹریننگ کالج کے ماتحت ماڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوکر گئے تھے[2]۔ دونوں تحریروں سے معلوم ہوتا ہی کہ شروع ہی سے آپ کے دل میں تصنیف وتالیف کی امنگ موجود تھی بہرحال چند ہی خطوط کے تبادلہ کے بعد راقم الحروف سے آپکے برادرانہ تعلقات قایم ہوگئے جن میں موت کے سوا اور کوئی قوت رخنہ انداز نہ ہوسکی۔

دو ہی سال بعد آپکا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں ہوگیا۔ پھر کیا تھا۔ شبانہ روز کا ساتھ ہوگیا۔ عرصہ تک ایسی یکجائی رہی کہ رہنا سہنا۔ کھانا پینا سبھی ایک ساتھ تھا۔ غرض اس طرح آپکو بے ضابطہ حیثیت سے زمانہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹری کی پوزیشن حاصل ہوگئی۔ ان دنوں شاید ہی کوئی کام ایک دوسرے کی رائے اور مشورہ بغیر ہوتا ہو۔ کام کے ساتھ ہنسنے ہنسانے کا شغل بھی ہردم جاری رہتا تھا۔ دراصل پریم چند نے ایسی شگفتہ طبیعت پائی تھی کہ ہر وقت اور ہر بات میں ہنسی کا پہلو نکال کر خوب زور سے قہقہہ لگایا کرتے۔ انکی زندہ دلی دیکھکر پژمردہ لوگ بھی بشاش ہوجاتے تھے چنانچہ یاران بے تکلف انھیں بمبوق کہا کرتے تھے اور وہ ہر وقت اسم بامسمی ہونیکی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ مگر اس شگفتگی کیساتھ وہ سنجیدہ کام اور کتب بینی کے بھی بڑے شایق تھے ہر صورت ہر وقت کی لطف صحبت میں انھیں زمانہ و ایڈیٹر زمانہ کیساتھ ایک خاص محبت ہوگئی۔

---

[1] حسن اتفاق سے یہ خط ابھی تک محفوظ رہ گیا ہی۔ [2] دوسرا خط وہیں سے بھیجا تھا۔

شروع میں وہ نواب رائے کے نام سے مضامین لکھتے تھے ایڈیٹوریل نوٹ اور تنقید لکھنے کی خدمت بھی کبھی کبھی اُنکے سر پڑ جاتی تھی مضامین کی نظر ثانی میں بھی وہ ایڈیٹر کا ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔ اس طرح عرصہ تک زمانہ کی خدمت ہم دونوں کا مشترکہ فرض رہا۔

بعدہٗ ۱۹۱۲ء میں جب اخبار آزاد جاری کیا گیا تب بھی عرصہ تک آپ مستقل حیثیت سے اس کے لئے مضامین اور نوٹ لکھتے رہے۔ غرض زمانہ و آزاد دونوں آپ کے زور قلم کے رہین منت ہیں دونوں پر آپ کے احسانات ہیں جن کے بارے یہ دونوں پرچے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے سے پہلے اور بعد کئی دفعہ آپ زمانہ و آزاد کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں باضابطہ شریک ہونے کے خواہشمند ہوئے۔ کئی مرتبہ حصہ دار کی حیثیت سے کام کرنیکی تجویز پر غور رہا لیکن راقم کو انھیں مالی پریشانیوں میں مبتلا کرنا گوارا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری ملازمت ترک کرنیکی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی اور جب وہ ترک موالات کے سلسلہ میں وہ ملازمت سے مستعفی ہو گئے تو زمانہ اور آزاد دونوں کے قلمی اعانت کا بار ان پر قصداً ہلکا کر دیا گیا۔ کیونکہ اب انھیں اپنے معاش کیلئے کام کرنے کی ضرورت تھی اور زمانہ ہماری خاطر خواہ خدمت نہ کر سکتا تھا لیکن تصنیف و تالیف پر بسر اوقات منحصر ہونے پر بھی وہ اپنے پرانے رفیق اور ناچیز زمانہ کو کبھی نہیں بھولے بلکہ حسب موقعہ اسکے لئے کچھ نہ کچھ بھیجتے رہے۔ چنانچہ کربلا کا ڈرامہ آپنے زمانہ ہی کو عنایت فرمایا۔ اور بعض بہترین قصے بھی زمانہ میں شایع ہوئے ہیں۔ خاص خاص ترجموں کے اشاعت کی عزت بھی ہمیشہ زمانہ ہی کو ملی۔ جب کبھی کسی خاص موقع پر کسی خاص مضمون یا افسانہ لکھنے کی تکلیف دیگئی تو انھوں نے حتی المقدور اسکی تعمیل کی اور جب کبھی خود اُنکو کسی خاص مبحث پر کچھ لکھنا ہوتا تو وہ ہمیشہ زمانہ ہی میں اپنے خیالات شائع کرانا پسند کرتے تھے چنانچہ ہندو مسلم اختلافات کے متعلق انھوں نے اپنا معرکۃ الارا مضمون زمانہ میں لکھا اور اُردو ہندی کا مباحثہ بھی زمانہ ہی میں شروع کیا۔ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا صدارتی ایڈریس آپنے زمانہ ہی کو اشاعت کے لئے عطا فرمایا تھا۔

غرض جہاں آپ کے ناوقت موت سے اُردو ہندی کی بزم ادب سُونی ہو گئی ہے وہاں زمانہ کو بھی ناقابل تلافی صدمہ پہونچا ہے۔ شروع ہی سے پریم چند نے زمانہ کو اپنا خاص پرچہ اور اس کے ایڈیٹر کو اپنا بھائی سمجھا اور آخر دم تک وہ ہمارے معین و معاون اور مشیر و ہمدرد رہے۔ ہر تجویز میں وہ ہمارا ہاتھ بٹانا اپنا فرض سمجھتے تھے اور ہماری تکلیف اُنکی تکلیف اور ہماری خوشی انکی خوشی تھی۔ آہ! اب ایسا خلوص۔ ایسی ہمدردی ایسی محبت اور ایسی یگانگت کہاں دیکھنے میں آئے گی۔ اگر کبھی غلط فہمی کا موقع بھی پیش

آیا تو ہمیشہ دو ہی خطوط میں دلوں کی صفائی ہو کر پہلے سے بھی زیادہ محبت ہو گئی۔ سچ ہے کہ پریم چند کو راقم کے ساتھ برادرانہ محبت تھی اور وہ اس رشتے کو آخر وقت نباہ گئے۔

افسوس اب یہ باتیں فسانہ ہو گئیں۔ اب دلی محبت کے وہ تمام مظاہرے خواب و خیال ہو گئے۔ مگر انکی یاد زندگی کا ایک خواب شیریں ہے اور ان کا خیال دم آخر تک قلب مضطر کے لئے اطمینان و مسرت کا باعث ہو گا۔

پریم چند کی ذات اُنس و محبت۔ اخلاص و ہمدردی کا سرچشمہ تھی افسوس یہ سرچشمہ جو ہمکو اتھاہ نظر آرہا تھا اتنی جلد خشک ہو گیا۔ اُن کے ادبی فتوحات کو ہم نامتناہی سمجھتے تھے۔ مگر ان کا سلسلہ اس قدر قبل از وقت منقطع ہو گیا۔ یہ ایک سانحۂ عظیم ہے۔ جس کا غم تمام عمر رہے گا۔ ملک کی بدنصیبی کہیئے یا اُردو ہندی اَدب کی بدقسمتی سمجھئے اس وقت انکی جگہ لینے والا کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ انکی موت سے جو نقصان عظیم پہنچا ہے اسکے تلافی کی واقعی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہاں خود پریم چند کیلئے یہ ضرور اطمینان کی بات ہو کہ وہ صدہا دلوں میں اپنی محبت و نیک نفسی کا دائمی نقش چھوڑ گئے ہیں۔ زمانہ حال کے ادب پر انکا نام نیک ہمیشہ کیلئے زریں حروف میں ثبت ہو گیا ہے اس سے زیادہ بس باقی ہوس؟

پریم چند کا معیار ادب

ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو۔ یا افسانوں کی یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہئے۔

ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ اس کی فضیلت کا موجودہ معیار جذبات کی وہ شدت ہے جس سے وہ ہمارے خیالات میں حرکت پیدا کرتا ہے۔

اخلاقات اور ادبیات کی منزل مقصود ایک ہے۔ صرف انکے طرز خطاب میں فرق ہے۔ اخلاقیات دلیلوں اور نصیحتوں سے عقل اور ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ادب نے اپنے لئے کیفیات و جذبات کا دائرہ چن لیا ہے۔ شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدت احساس ہوتی ہے اُتنا ہی اس کا کلام دل کش اور بلند ہوتا ہے۔

جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو۔ روحانی اور ذہنی تسکین نہ ہو۔ ہم میں قوت و حرکت پیدا نہ ہو۔ ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لئے سچا استقلال پیدا نہ کرے وہ ہمارے لئے بے کار ہے۔ اور اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

ادب کا آلۂ کار ذوق حُسن ہے وہ انسان میں اسی ذوق حُسن کو جگانے کی کوشش کرتا ہے اور ایسا کوئی انسان نہیں جسمیں حُسن کا احساس نہ ہو۔ ادیب میں یہ ذوق جتنا ہی بیدار اور پُرعمل ہو گا۔ اس کے کلام بھی اتنی ہی تاثیر ہو گی۔

اقتباس از زمانہ اپریل ۱۹۳۶ء ——— پریم چند

علمی خبریں اور نوٹ

مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو کی تحریک پر ۲۴ و ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اُردو کی توسیع و ترقی کے لئے ایک اہم کانفرنس[1] منعقد ہوئی جس میں آنریبل سر شاہ محمد سلیمان صاحب چیف جسٹس صوبہ متحدہ۔ سر راس مسعود صاحب۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام حیدرآباد، ڈاکٹر سید محمود صاحب، مسٹر عبداللہ یوسف علی، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب، مولوی سید سلیمان صاحب ندوی، نواب صدر یار جنگ صاحب، پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی وغیرہ وغیرہ بہت سے معززین ملک شریک تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے شرکائے کانفرنس کا خیر مقدم کیا۔ اور سر سید مرحوم کی سائنٹفک سوسائٹی کی تاریخ بیان کر کے فرمایا کہ اس سوسائٹی کو جو اُردو کو ترقی دینے کے لئے قایم کی گئی تھی۔ راجہ جے کشن داس صاحب مرحوم اور بعض دیگر ہندو رؤسا سے بڑی مدد ملی تھی، آپ نے اس کانفرنس کو فرقہ وارانہ تحریکوں سے افضل و برتر قرار دیا اور ہندو مسلمان دونوں سے اُردو زبان کی ترقی کے لئے مشترکہ کوشش کرنیکی اپیل کی۔

راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی صدارتی تقریر میں اس بات پر اظہار مسرت کیا کہ اس جلسے میں ہر مذہب و ملت کے اصحاب دوش بدوش موجود ہیں اور فرمایا کہ اُردو ادب ہندوستان کی مختلف قوموں کی متحدہ کوشش کا ثمرہ ہے۔ آپنے اُردو کی کس مپرسی پر اظہار افسوس کیا اور کہا کہ ہمارے یہاں یہ حالت ہے کہ میر و سودا کی تصانیف تک غلط اور بُری چھپی ہیں۔

اسی سلسلہ میں آپ نے سر سید احمد خاں کی خدمات کا ذکر کر کے انجمن ترقی اُردو اور اُس کے قابل سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انجمن نے مولوی صاحب کی رہنمائی میں پُرانی کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر حاصل کیں اور چھاپیں۔ آپ نے پنجاب کا ذکر کیا۔ کہ وہ اُردو زبان کی کسقدر خدمت کر رہا ہے۔ حیدرآباد کے جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کے شاندار خدمات کا حوالہ دے کر اُردو کی سرپرستی کے لئے اعلیحضرت نظام دکن کا شکریہ ادا کیا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اُردو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں رائج ہے اور اسے کروڑوں ہندوستانی بولتے ہیں۔ مگر اسے اور زیادہ وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے زبان کی سلاست پر زور دیکر فرمایا کہ اس بات کی بڑی

---

[1] راجہ صاحب محمود آباد کے صدارت میں

ضرورت ہے کہ سہل اُردو کے نمونے شائع کیے جائیں۔ اور خوش خط ٹائپ کو رواج دیا جائے۔

صدارتی تقریر کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن اُردو کی کارگزاری کے متعلق ایک مختصر سی رپورٹ پڑھی جس سے معلوم ہوا کہ انجمن اب تک ۹۵ مفید و نایاب کتابیں شائع کر چکی ہے۔ اور آج کل اُردو انگریزی لغت کی تدوین کا کام کر رہی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت عام معلومات کی کتابیں کثرت سے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ اور زبان کی مزید اشاعت کا مسئلہ بھی توجہ طلب ہے۔ اس سلسلے میں آپنے فرمایا کہ ہم کسی سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتے ہیں نیز انجمن ترقی اُردو کسی خاص فرقہ کی انجمن نہیں ہے مسلمان ہندو۔ عیسائی سب اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ آپنے یہ بھی فرمایا کہ ہر صوبے کی زبان کو ترقی کا حق حاصل ہے لیکن کسی کو یہ حق نہیں کہ دوسری زبان کو مضرت پہونچانے کی کوشش کرے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا جو اُسے بولتا ہے اسی کی زبان ہے۔ اور اُردو یا ہندوستانی کا خمیر صُلح کل کے ضامن سے بنا ہے۔

اس کے بعد باہر سے آئے ہوئے پیغامات ہمدردی وغیرہ سنائے گئے اور جلسہ دوسرے دن کے لئے ملتوی ہوا۔ مگر کھلے اجلاس کے پہلے ۲۶ ر اکتوبر کو صبح ۹ بجے ایک جلسہ شوریٰ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کے زیر صدارت ہوا۔ جس میں اُردو کی توسیع و ترقی کے لئے تین کمیٹیاں بنائی گئیں:۔

(۱) اصلاح زبان کی کمیٹی (۲) ادبی کمیٹی (۳) اشاعت خانہ قایم کرنیکی کمیٹی

اصلاحی کمیٹی زبان کے اختلافی مسائل کے متعلق ملک کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی رائیں حاصل کرکے فیصلہ کریگی۔ نیز رسم الخط سے تعلق رکھنے والے مسائل اور اُردو کے طریقہ طباعت پر بھی غور کرکے رسم الخط کی اصلاح اور طباعت کی سہولت کے وسائل بہم پہنچائے گی۔ اسمیں گیارہ اصحاب ممبر مقرر ہوئے[۱]

ادبی کمیٹی کے حسب ذیل مقاصد قرار دیئے گئے:۔

(۱) علمی، ادبی نادر و نایاب کتابوں اور رسالوں کا شائع کرنا

(۲) قابل ترجمہ کتابوں کے ترجمے اور مناسب کتابوں کی تصنیف و تالیف کے لئے مترجموں و مصنفوں کا انتخاب کرنا۔

اس کمیٹی میں پچیس[۲] ممبر تجویز ہوئے جنھیں دس ناموں کے اضافے کا حق دیا گیا۔

اشاعت خانہ کی کمیٹی عارضی ہوگی اور اسکے لئے نو[۳] ممبر منتخب ہوئے۔ یہ کمیٹی اُردو اشاعت خانہ کے اسکیم کی تفصیلات طے کریگی۔ تاکہ انجمن اُردو کی کتابیں تجارتی اصول پر عمدہ طریقہ سے شائع ہو سکیں۔

کمیٹیوں کے انتخاب کے بعد مولوی عبدالحق صاحب کی تحریک پر یہ طے پایا کہ انجمن ترقی اُردو کا صدر مقام دہلی منتقل کر دیا جائے اور وہاں اُردو کا ایک وسیع کتب خانہ اور اشاعت خانہ قایم کیا جائے۔

---

[۱] اس کمیٹی کو چار جدید ممبر منتخب کرنے کا حق ہے۔

انجمن اُردو کی صوبہ واری کمیٹیاں قایم کرنا بھی طے ہوا اور بڑے بڑے صوبوں کے لئے متعدد حلقے بنائے گئے۔ اور یہ بھی طے پایا کہ دیسی ریاستوں میں بھی انجمن ترقی اُردو کی شاخیں قایم کیجائیں یہ شاخیں مرکزی انجمن کے مشورہ سے اُردو کی ترقی و اشاعت کے لئے مندرجہ ذیل کام کریں گی

(۱) بچوں کے لئے اُردو کے مکتب اور بالغوں اور پیشہ ور لوگوں کے لئے شبینہ اسکول قایم کرنا۔

(۲) اردو کی توسیع و اشاعت کے لئے دورے اور ادبی جلسے کرنا

(۳) اسکولوں اور عدالتوں میں اُردو کو رواج دینے کی کوشش کرنا۔

کانفرنس کا دوسرا اجلاس ۲۶ر اکتوبر کے سہ پہر کو نواب مہدی یار جنگ بہادر صاحب صدر المہام سیاسیات حیدر آباد دکن کے زیر صدارت منعقد ہوا۔

اس میں مجوزہ کمیٹیوں کے نام اور ان کے ممبروں کی تفصیل سنائی گئی اور یہ طے ہوا کہ سر راس مسعود مستقل صدر انجمن اور سکریٹری انجمن بہ حیثیت عہدہ ہر کمیٹی کے ممبر سمجھے جائیں اور۔ کمیٹیوں کے ممبروں کے لئے تین سال کی مدت طے ہوئی۔

اس کے بعد جناب صدر نے ایک مختصر تقریر کے ساتھ کانفرنس کے اختتام کا اعلان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جلسہ بہت کامیاب رہا اور جملہ تجویزیں باتفاق رائے سے پاس ہوئیں۔ اب ہمارے لئے انھیں صرف عملی جامہ پہنانا باقی رہ گیا ہے۔ آپ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ یہ علمی کام کرنے والوں کی جماعت ہے جس کو کسی دوسرے زبان سے رقابت نہیں ہے۔ سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اُردو میں دوسری زبان کے الفاظ بے ضرورت داخل نہ کئے جائیں۔ خواہ وہ عربی کے ہوں یا سنسکرت کے۔ اس سے اُردو کو نقصان پہونچے گا۔ کیونکہ یہ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے اور یہ دانشمندی کی بات نہ ہوگی کہ ہم اس کو کروڑوں باشندوں سے علحدہ کر کے مخصوص کر دیں۔ اتحاد و اتفاق باہمی کا بڑا عنصر اتحاد زبان ہے اس کو قایم رکھنا چاہیئے

رہا یہ سوال کہ یہ زبان کس خط میں لکھی جائے۔ اس کا جواب آپ نے یہ دیا کہ اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ جلد لکھا جائے اور جگہ تھوڑی گھیرے تو وہ فارسی رسم الخط میں لکھے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ زیادہ جگہ گھیرے اور جیسی آواز ہو ویسا ہی لکھے تو وہ ناگری حروف میں لکھے۔ آپ نے ایک غلط فہمی کے بارے میں فرمایا کہ یہ صحیح نہیں ہے کہ اُردو درباری زبان ہے یا مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ جن لوگوں نے اُردو کے نشو و نما کی تاریخ پڑھی ہے اور پرانی تحریروں کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اُردو کب پیدا ہوئی اور اس نے کس طرح ترقی کی۔

آپ نے فرمایا کہ اُردو میں ترقی کی حیرت انگیز استعداد ہے اور اس میں علمی زبان بننے کی پوری اہلیت ہے۔ چنانچہ حیدرآباد میں ریاضی اور کیمیا کی اعلیٰ ترین کتابیں اُردو میں ترجمہ ہوگئی ہیں اور ان ادق مضامین کو اُردو کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے۔ اُردو میں اب اس قدر وسعت پیدا ہوگئی ہے کہ کوئی خیال خواہ قصہ کیسا ہی شکل ہو بے تکلف ادا ہو سکتا ہے۔ یورپ کے اس خیال کو کہ ہندوستان کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس کے ذریعہ اعلیٰ علوم کی تعلیم دی جا سکے جامعہ عثمانیہ نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ حیدرآباد میں ثانوی تعلیم بھی اسی زبان میں دی جاتی ہے۔ اور جامعہ عثمانیہ کا میعار جہاں ہر قسم کی تعلیم اُردو میں دی جاتی ہے کسی دوسری یونیورسٹی سے کم نہیں ہے۔ بلکہ بعض سے زیادہ بلند ہے۔
اس تقریر کے بعد یہ کانفرنس شکریہ وغیرہ کے رزولیوشنوں کے بعد ختم ہوگئی۔

ہم کو اُمید ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کی رہنمائی میں اُردو کی توسیع و ترقی کا کام اب پہلے سے بھی زیادہ تیزی اور مستعدی سے جاری ہوگا۔ انجمن کے صدر مقام کی تبدیلی ہر حیثیت سے ضروری تھی۔ ہم خوش ہیں کہ دہلی آنے کے بعد انجمن اُردو کو واقعی مرکزی حیثیت حاصل ہوگی۔ مگر اس کے لئے ایک خاص عمارت کے علاوہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ انجمن کے مستعد و پُرجوش سکریٹری مستقل طور پر دہلی میں قیام فرمائیں۔

اس ماہ علی گڈھ کانفرنس سے پہلے پٹنہ میں صوبہ بہار کی اُردو کانفرنس مولوی عبدالحق صاحب کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں بھی کئی اہم مسئلوں پر غور ہوا۔ اور اُردو ہندی کے متعلق مندرجہ ذیل قابل ذکر رزولیوشن پاس ہوا۔

اس کانفرنس کی قطعی رائے ہے کہ اُردو ہندی دونوں بنیادی حیثیت سے بڑی حد تک ایک ہی زبان ہیں۔ اور ہندوستان کی قومی یگانگت کے لئے ضروری ہے کہ دونوں کی ادبی فرہنگ۔ اور قواعد ایک دوسرے کے قریب تر لانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اور جدائی کی تحریک کی ہر طریقے سے مخالفت کی جائے۔ کیونکہ اس کا مقصد مشترکہ قومی زبان کو سیاسی اور فرقہ وارانہ اسباب کے ماتحت ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔

رسم الخط کی بحث کا جو عملی حل اس کانفرنس نے تجویز کیا وہ یہ ہے:-

"اس کانفرنس کی رائے میں ہندوستانی زبان کی لکھائی کے مسئلہ کا خوشگوار اور قابل عمل حل یہ ہے کہ اسکولوں اور عدالتوں میں ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط تسلیم کر لئے جائیں اور مڈل۔ میٹریکولیشن اور انڈین سول سروس کے امتحانات پاس کرنے کے لئے ان دونوں کا جاننا ضروری قرار دیدیا جائے۔ تاکہ اُردو داں طالبعلم

ہندی کتابیں اور کاغذات اور ہندی خوان طالبعلم اُردو تصانیف اور کاغذات پڑھ سکیں؟

اس کانفرنس کا ایک مفید نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ بانکی پور (پٹنہ) میں مستقل حیثیت سے ایک انجمن اُردو قایم ہوگئی ہے۔ جس کے صدر قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر ہیں۔ ان کی سرپرستی میں ایک ادبی رسالہ "معیار" بھی جاری کیا گیا ہے جس میں بلند پایہ مضامین کے علاوہ تنقید و تبصرہ کا خاص اہتمام ہے

میاں بشیر احمد صاحب اڈیٹر "ہمایوں" کی کوشش سے لاہور میں بھی انجمن اردو پنجاب کے نام سے ایک ادبی انجمن قایم ہوئی ہے جس کے اغراض و مقاصد یہ قرار دئے گئے ہیں:۔

(۱) اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کی حیثیت سے فروغ دینا۔

(۲) اُردو کی نشر و اشاعت کا جایزہ لیتے رہنا اور اخبارات رسائل۔ سینما۔ ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ اُردو کو ترقی دینے کی کوشش کرنا۔

(۳) مختلف مقامات میں باقاعدہ انجمنیں قایم کرنا اور جہاں اُردو کی ترقی کے لئے ایسی انجمنیں موجود ہوں ان کو دعوت الحاق دینا۔

ڈھاکہ میں بھی "انجمن اُردو مشرقی بنگال و آسام" کے نام سے ایک انجمن نواب صاحب ڈھاکہ کی سرپرستی میں قایم ہوئی ہے۔ جس کے صدر سر خواجہ ناظم الدین صاحب اور سکریٹری حکیم حبیب الرحمن خاں صاحب منتخب ہوئے ہیں۔

یہ کوششیں اُردو کی آیندہ ترقی کے لئے فال نیک ہیں۔ ہمکو اُمید ہے اور ہماری دعا ہے کہ یہ انجمنیں خلوص کیساتھ زبان و ادب کی ترقی کے لئے سرگرم کار رہوں۔

بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگپور کی بعض تجویزوں کے متعلق اب حامیان اُردو میں شکوک اور غلط فہمی ہوگئی ہے چنانچہ حال میں الہ آباد کے مشہور محب وطن پنڈت سندر لال جی نے مہاتما گاندھی کے نام اس کے متعلق ایک خط لکھا ہے، جسمیں انھوں نے اُردو کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ اُردو کبھی مسلمانوں کی خاص زبان نہیں رہی اور نہ اب ہے۔ نہ اسے مسلمانوں سے کوئی خاص تعلق ہے۔ بلکہ جن اضلاع میں یہ رایج ہے وہاں ہندو مسلمان سکھ عیسائی سبھی باشندے اس کو مشترکہ حیثیت سے بولتے اور استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی لکھا تھا کہ جو ہندو مسلمان اسمیں سنسکرت یا عربی الفاظ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہندوستانی زبان کی ترقی میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ آج کل مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ اور مولانا سلیمان ندوی صاحبان کی متفقہ کوششوں سے سلیس و سادہ زبان کے حق میں ایک زبردست جماعت پیدا ہوگئی ہے جس کے ماتحت اُردو کو ہر قسم کے دقیق الفاظ اور مشکل ترکیبوں سے پاک و صاف کرنے کی باضابطہ

کوشش جاری ہوچکی ہے۔ چنانچہ اگر ان کے مضامین کو ناگری خط میں شائع کیا جائے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ہندی نہیں ہے۔ رسم الخط کے متعلق پنڈت سندر لال نے یہ لکھا تھا کہ جبتک کوئی اور رسم الخط اتفاق رائے سے تجویز نہ ہو جائے ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط مروج رہنا چاہیئے۔

مہاتما گاندھی نے اس خط کا جو جواب دیا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں۔ کہ

"زبان کے سلسلے میں میں نے جو کچھ کیا ہے خلوص نیت کیساتھ کیا ہے۔ میری تمام کوشش ایک لفظ ہندستانی کے لئے وقف رہی ہے چنانچہ میں نے اُسے کانگرس سے منظور کرا لیا ہے۔ اس سے میرا مقصد یہی تھا کہ جس زبان کو ہندو مسلمان مشترکہ طور پر استعمال کرتے ہیں اُس کا نام بھی ایک ہی ہو۔

اس سلسلے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں انھیں بہر حال دور کر دینا چاہئے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ اُردو زبان کو ترک کیا جائے۔ میں اُردو کی بیحد قدر کرتا ہوں اور اُردو کی کوئی نہ کوئی تصنیف پڑھتا رہتا ہوں اور اپنے مسلمان بہنوں بھائیوں کو اُردو ہی میں خط لکھا کرتا ہوں۔

آخر میں مہاتما جی نے اُمید ظاہر کی ہے کہ ان کے خطوط سے تمام شکوک رفع ہوگئے ہوں گے۔ اگر کوئی شبہ باقی رہ گیا ہو تو پھر تبادلہ خیال کیا جا سکتا ہے۔

منشی پریم چند کے اُردو ادب پر جو احسانات ہیں اُنکے شکر گذاری میں بعض اُردو رسالے اپنے اپنے خاص نمبر شائع کر رہے ہیں مثلاً ہمعصر، ساقی دہلی نے منشی پریم چند صاحب مرحوم کی یادگار میں فروری ۱۹۳۷ء میں ایک خاص نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ فلمستان لاہور بھی ایک خاص نمبر شائع کر رہا ہے۔ زمانہ کا بھی عنقریب ہی پریم چند نمبر شائع ہوگا۔ منشی صاحب مرحوم کے قدردان احباب اور رسالہ کے قلمی معاونین سے استدعا ہے کہ اس نمبر کے لئے مضامین نظم و نثر جلد سے جلد ارسال فرماکر مرہون منت فرمائیں۔

کچھ عرصہ سے ہمارے خوش فکر دوست مسٹر محمود بریلوی "اُردو ادب" کی ایک جامع تاریخ مرتب کر رہے ہیں اس کا بڑا حصہ مکمل بھی ہوگیا ہے لیکن زمانہ حال کے شعراء اور مصنفین سخنگو و انشا پرداز خواتین کے حالات ابھی زیر ترتیب ہیں اس کے لئے تمام شاعروں، اور ادیبوں اور سخنگو خواتین سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنے حالات معہ نمونہ نظم و نثر صاحب موصوف کے پاس اس پتہ سے بھیجدیں:۔ مسٹر محمود بریلوی

B.I.T. Block 8/14,
Ebrahim Rahmatulla Road Bombay No. 3.

The ZAMANA, Nov. 1936.

جملہ حقوق محفوظ ہیں

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۱۱

زمانہ

مرتبہ۔ دیانرائن نگم۔ بی اے

جلد ۶۷	نومبر سنہ ۱۹۳۶ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

تصاویر:۔ شاہ جارج ششم۔ ملکہ الزبتھ اور شاہزادی الزبتھ۔ میرنفیس

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ پانچ روپیہ — ششماہی ۳ روپیہ — ممالک غیر سے ۶ روپیہ سالانہ — فی پرچہ ۸؍

زمانہ بک ایجنسی کی قابل خرید بے مثل کتابیں

مکمل عورت دو لڑکیوں کے تعلیمی و سوشل حالات کا مقابلہ ایک کو یورپ میں اسکول اور دوسری کو کینیا دو دیالہ میں داخل کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کینیا دو دیالہ کی لڑکی تعلیمی و سوشل حالات میں بہتر ہے　قیمت ۸ر

شری مد بھاگوت گیتا یعنی کرم یوگ شاستر المعروف غذائے روح بالتصویر مترجمہ پنڈت پربھو دیال مصر عاشق لکھنوی۔　قیمت عہ ر

اُردو مضمون نویسی مضمون لکھنے کے متعلق پروفیسر تانک پرشاد بی اے مرحوم کی نہایت عمدہ کتاب ہے، اس سے بہت جلد مضمون لکھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر مضمون کا موضوع نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ قیمت ۸ر

مثنوی سحر یعنی شکنتلا اردو شنیت کا اردو ترجمہ حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز دوسرا ایڈیشن جس کی مصنف نے نظر ثانی کی ہے۔　قیمت ۸ر

مرقع ادب حصہ اول و دوم مرتبہ جناب صفدر مرزا پوری اس میں ہندوستان کے مشہور انشا پرداز شعرا کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں۔ قیمت حصہ اول عہ　حصہ دوم ۱۲ر

حسن بن صباح ملک کے شہرۂ آفاق مصنف مولانا شرر مرحوم کی تصنیف ہے اسمیں حسن بن صباح جو فرقہ اسمٰعیلیہ کا ایک زبردست رکن تھا) کے دلچسپ حالات درج ہیں قیمت ۱۲

سیر گل (مختصر افسانوں کا مجموعہ) وہ کتاب جس نے مصنف کو دور حاضرہ کے اہل قلم کی صف اول میں جگہ دی ہے آج روسی کہانیوں کو عموماً اور چیخوف کی کہانیوں کو خصوصاً اردو ادب میں ایک عام شہرت حاصل ہے لیکن ان کے اولین پیش کرنیوالے کی تحریروں کا اعجاز دیکھنا ہو تو سیر گل دیکھئے۔ قیمت عہ

انتخاب حسرت مولانا حسرت موہانی کے دس دیوانوں کا انتخاب اور اسیر جلیل کے قلم کا لکھا ہوا ایک دلچسپ مقدمہ۔ قیمت عہ ر

بندگی امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب العبودیت کا اردو ترجمہ ہے اپنی وضع کی بہترین کتاب ہے۔ مترجمہ میر ولی اللہ صاحب وکیل ۱۲

اسرار رنگون مسٹر داؤد کا ایک نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے۔ ہر بات کو اصلی سطح پر لا کر پیش کیا گیا ہے۔ بڑی حد تک ناول سچے واقعات سے مرتب ہے حجم ۱۷۰ صفحات۔ قیمت عہ ر

بیوہ جیات ایک ہندو عورت کی زندگی کی دردناک کہانی۔ قیمت صرف ... ۵ر

سلومی آسکر وائلڈ کے مشہور ڈرامہ سالومی کا ترجمہ ہے جسکو جناب مجنوں نے نہایت محنت سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ۸ر

سرمایہ تسکین جناب محمد یسین صاحب تسکین سہارنپوری کے کلام کا دلکش مجموعہ ہے جو عام طور پر مقبول ہے۔ ۸ر

خیالات عزیز مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب جسکی باضابطہ رجسٹری کی گئی ہے۔ حجم ۲ سو صفحات ٹائٹل خوشنما رنگین ہے۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ مع تصویر مصنف۔ قیمت ۱۲

ہندو تیوہاروں کی اصلیت اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بستی نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور انکی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے اسکے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور تمدنی نظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے۔ اردو ایڈیشن ۹ر ہندی ایڈیشن کی قیمت جس میں اردو ایڈیشن کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل دی گئی ہے۔　قیمت ۱۲

نقش و نگار جلیل قدوائی صاحب کی دلآویز و پرلطف نظموں کا مجموعہ جو ملک کے بڑے بڑے سخن شناسوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں ــــ　قیمت ایک روپیہ

خادمات خلق عورتوں کی جانبازی اور ایثار کی سچی کہانیاں ۔ یہ کتاب خواتین اور بچوں کے لیے خاص طور پر نہایت ضروری ہے اسکے مطالعہ سے انکے اندر ہمت، ایثار، ہمدردی اور وطن پرستی کے جذبات پیدا ہونگے قیمت ۱۰ر

علمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتابیں ضرور منگائیں

نصائح چانکیہ یعنی نامور ہند چانکیہ کے مشہور و معروف ونیتی کا ترجمہ از پنڈت ہنمنت راؤ صاحب ناظم خزانہ سرکار عالی گورنمنٹ نظام ... ... قیمت ۶

حیات بیوہ جس میں مصنف نے بیوگان کی حالت کا سچا فوٹو کھینچا ہے اور اُن کی جانکاہ مصیبتوں کا دلگداز سین پیش کیا ہے۔ ... ... قیمت ۵

لسان الغیب جلد اول و دوم حضرت حافظ شیرازی کے دیوان کی بےمثل شرح ہے۔ جس کو نہایت صاف و سلیس زبان میں میر ولی اللہ نے مرتب کیا ہے۔ حافظ کے کلام کے شائقین کے واسطے عجیب تحفہ ہے۔ ... ... قیمت حصہ اول ؎ حصہ دوم ۶

بہار سخن یہ کتاب ہندوستان کے پانسو چھیاسٹھ ہندو شعرائے ماضی و حال کا نفیس تذکرہ ہے۔ جسمیں شعرا کے حالات انتخاب کلام بترتیب حروف تہجی درج کئے گئے ہیں۔ فاضل مؤلف نے اُردو زبان پر احسان عظیم کیا ہے۔ پہلے اسکی قیمت سے تھی مگر عام اشاعت کی غرض سے اب ۱۲ کر دی گئی ہے۔ پرائیویٹ کتب خانوں اور پبلک لائبریریوں میں رکھنے کی چیز ہے۔

طریق دولتمندی دولت کی چاہ سب کو ہے۔ لیکن دولت کمانیکے طریقوں سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں اس کتاب میں دولت حاصل کرنیکے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں ہر شخص کے قابل خرید کتاب ہو۔ قیمت ۸

فلسفہ جنگ ایک مشہور و معروف روسی تصنیف کے تحت میں فلسفہ جنگ پر عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے ... ۴

ترجمہ رامائن منظوم بال کانڈ کا اصلی دوہے اور چوپائیاں ہندی ترجمہ اُردو اشعار میں مترجمہ منشی سورج پرشاد تصوّر عہ

پریم بتیسی یعنی اُردو کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند بی۔ اے کے بہترین قصوں کا مجموعہ زبان کی لطافت اور بیان کی صفائی قابل دید ہے۔ ... ... حصہ دوم ۱۲

دنیائے راز ابوالفاضل راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ ہے۔ ہر نظم مجاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے۔ معہ تصویر مصنف ... ... قیمت ۱۰

اثرستان ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی کا دیوان جس کا ہر مصرعہ نیشتر و نشتر ہے ... ... قیمت عہ

بزم خیال اس میں اُردو اور فارسی شعراء کی مجالس کے لطائف و ظرائف اور برجستہ گوئی و حاضر جوابی کے نمونے جمع کئے گئے ہیں۔ جو خوش مذاق حضرات کی تفریح کا بہترین سامان ہے ... ... قیمت عہ

جہاں آرا بیگم شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا کی سوانحعمری ہے ملک کے مشہور اہل قلم ضیاء الدین احمد صاحب برنی نے مرتب کیا ہے۔ حجم ۸۸ صفحات سائز قدرے بڑا۔ ... ... قیمت ۸

روٹھی رانی ایک دلچسپ اور سبق آموز افسانہ جس میں راجپوت عورتوں کی جرأت کا مرقعہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنفہ منشی پریم چند مرحوم ... ... قیمت ۶

بزم احباب اخلاقی کہانیوں کا نایاب گنجینہ قیمت ۸

منیجر زمانہ بک ایجنسی کانپور

آغائی صاحب از مولانا نشتر مرحوم، لکھنؤ کے نامور رئیس کا نہایت دلآویز تذکرہ - حجم ۱۴۴ صفحات ... ۸/

رامائن مسدس (مصنفہ جناب منشی لوچی مل صاحب کپور سنبھلی) اس رامائن کی مخصوص خوبی یہ ہے کہ قابل مصنف نے شری رامچندر جی کے چرتر کو عجیب مرغوب انداز میں بیان کیا ہے۔ مصنف کی جدت طراز ذہن رسا نے نازک و نادر استعارات اس حسن و خوبی سے استعمال کئے ہیں جو روحانی و وجدانی لطافت سے مملو ہیں۔ ہر شعر چلتا ہوا جادو ہے۔ لطف محاکات و بلند پروازی تخیل قابل تحسین ہے۔ اشعار میں فصاحت و بلاغت کا دریا موجیں لے رہا ہے۔ رامائن کے اندر تصویریں رنگین نہایت فینسی ہیں۔ صفحات ۳۰۸ مجلد فینسی قیمت مجلد با تصویر ۱۲/ (مجلد بلا تصویر ۱۰/)

قیمت بلا جلد ۱۰/

(مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کی تازہ تصنیف)

بیوہ اس کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات لکھے گئے ہیں اور اُن کی ترغیبات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ بیواؤں کے لئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے۔

حجم ۱۵۰ صفحات قیمت ایک روپیہ

خیالات مہاتما گاندھی حصہ اوّل و دوم

یہ وہ لاجواب کتاب ہے جس میں مسٹر سی۔ الف اینڈریوز نے موجودہ دنیا کے انسان اعظم مہاتما گاندھی کے مذہبی۔ سماجی اور سیاسی خیالات شرح و بسط کے ساتھ درج کر کے دنیا پر احسان عظیم کیا ہے۔ یہ کتاب اُن لوگوں کے لیے خضر راہ کا کام دے گی جو ہندوستان کی موجودہ سیاست کا بخوبی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ کسی پبلک آدمی کو اس کتاب کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہیئے

قیمت حصہ اول ۱۴/ حصہ دوم ۱۴/

نوحۂ زندگی بیوہ کے نکاح ثانی کے متعلق علامہ راشد الخیری مرحوم کی معرکتہ الآرا تصنیف بے انتہا دلچسپ قصہ ہے

قیمت بارہ آنہ

جوہر قدامت دو عورتوں کی جگر خراش داستان جن میں سے ایک قدامت کی پرستار اور دوسری تہذیب جدید کی دلدادہ ہے۔ ضخامت دو سو صفحہ

قیمت ۸/

موؤدہ لڑکیوں کو ترکہ پدری سے محروم کردینے کے قبیح رواج کے انسداد کے لیے یہ کتاب نہایت ہی دلگداز پیرایہ میں لکھی گئی ہے

قیمت ۸/

بنت الوقت تہذیب جدید کی کورانہ تقلید کرنیوالی ایک ناعاقبت اندیش لڑکی کا عبرتناک انجام - قیمت ۸/

سراب مغرب نامناسب تربیت گاہوں میں لڑکیوں کو تعلیم دینے کا انجام ... ... قیمت ۸/

عروس کربلا کربلا کے دلدوز واقعات علامہ راشد مرحوم کے سحر طراز قلم سے ملاحظہ فرمایئے - طرز بیان اس قدر درد انگیز ہے کہ پڑھتے پڑھتے آپ کی ہچکیاں بندھ جائینگی۔ اس پر لطف یہ ہے کہ پاک محبت کا دلآویز افسانہ بھی ہے، بہت ہی مقبول اور ہر دلعزیز ہے۔

قیمت ۸/

مینجر زمانہ بک ایجنسی کانپور

ہاف ٹون عکسی تصویریں مشاہیر زمانہ ایک آنہ فی تصویر

مرزا غالب، مومن، انیس، آزاد، مولانا حالی، علامہ شبلی
سرشار، اقبال، چکبست، نظر لکھنوی، حضرت وصل بلگرامی
عزیز لکھنوی، شاد عظیم آبادی، رسوا، لالہ سری رام، سلیم پانی پتی
برق دہلوی، طباطبائی، اثر لکھنوی، ناشاد، محروم، تسکین
افسر، حسرت موہانی، راز چاندپوری، فرحت اللہ بیگ،
امیر مینائی، داغ، ذکاء اللہ، نازش بدایونی، ڈاکٹر نذیر احمد،
شرر لکھنوی، سر سید احمد خاں، سرور جہان آبادی، ریاض
خیر آبادی، اکبر الہ آبادی، مولانا صفی لکھنوی، عزیز، شوق
قدوائی، مہر دہلوی، جوش ملیح آبادی، روان مرحوم،
حفیظ جالندھری، جگر مراد آبادی، کیفی، اسد، رشن،
منشی بالمکند گپتا، منشی پریم چند مرحوم، محشر لکھنوی،

پنڈت آنند نرائن ملا ایم اے، جگر بریلوی۔ گروپ ہندوستانی
اکیڈیمی، رام بابو سکسینہ، راشد الخیری وغیرہ۔

نوٹ:۔ ان تصویروں کا البم ۱۲ میں ملیگا۔

رنگین آرٹ پیپر پر ۲ر فی تصویر

تاج محل کا تخیل، عمر خیام، خواب راحت، تار شکستہ۔ بسنت
رت، رفیق طفلی، در بوستاں، الموذ شام، صبح صادق۔ بندگا۔
پردہ نشین، نور جہاں کی حسن تدبیر، انتظار، روح اور گناہ،
پیام کرشن، الگل پنج روزہ۔ پیام محبت، شکنتلا کا نامہ شوق
موہنی، بلبل گرفتار وغیرہ۔

نوٹ:۔ ان تصویروں کا البم ۱۲ میں ملیگا۔

ضرورت ہے

دفتر آزاد زمانہ کیلئے ایک خوشنویس کاتب کی ضرورت ہے اجرت
بذریعہ خط و کتابت یا مینیجر صاحب زمانہ پریس سے ملکر طے ہو سکتی ہے۔
درخواست کے ہمراہ نمونہ کتابت بھی ہونا چاہئے۔

رسالہ زمانہ کا خاص نمبر

یادگار حالی

مشہور رسالہ زمانہ کا دسمبر ۱۹۳۵ء نمبر شمس العلماء مولانا حالی مرحوم کی صد سالہ سالگرہ کی یادگار میں خاص حالی نمبر کی حیثیت سے شایع کیا گیا ہے جسمیں مولانا مرحوم کے سوانحی حالات کے علاوہ انکی نثر اور نظم پر متعدد تنقیدی مضامین درج ہیں۔ موجودہ زمانہ کے کئی نامور شاعروں اور مشہور انشا پردازوں نے اس نمبر کیلئے خاص مضامین لکھے ہیں۔ جشن پانی پت کا بھی مفصل تذکرہ ہے۔ کئی عکسی تصاویر بھی زیب رسالہ ہیں۔ غرض ہر حیثیت سے یہ پرچہ قابل قدر یادگار حالی کہلانے کا مستحق ہے۔
حجم ایک سو چار صفحات قیمت بارہ آنہ علاوہ محصولڈاک
مینیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے۔

قیمت ۶ر علاوہ محصول

حضرت کیفی دہلوی مد ظلہ العالی کی نگاہ میں

نسیم عرفان

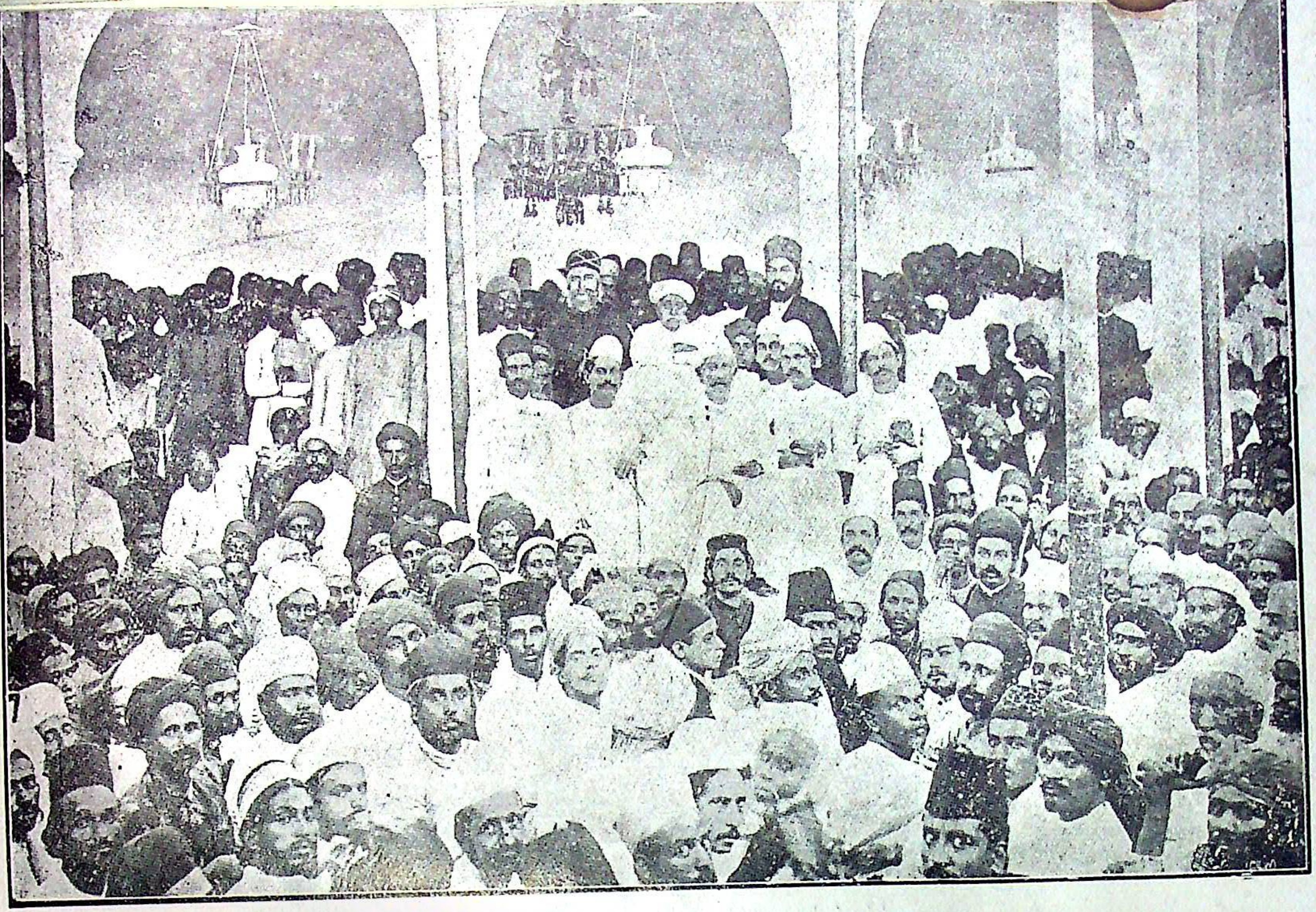
یعنے

مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں شہرۂ آفاق بھگوت گیتا کا منظوم اور بالتصویر ترجمہ جو جناب منور لکھنوی خلف الرشید لسان الشعراء حضرت افق کا تازہ ترین کارنامہ ہے

ایک ہیرا ایک کوہ نور ہے

جسکا پیش نامہ شہرۂ آفاق ادیب و فلاسفر جناب ڈاکٹر بھگوان داس ایم اے ایل ایل ڈی نے تحریر فرمایا ہے، فصاحت، سلاست روانی اور حسن بندش کے لحاظ سے یہ ترجمہ تمام ادبائے عصر سے شرف تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اگر آپ ذوق ادب کیساتھ روحانی مسرت کی تکمیل بھی کرنا چاہتے ہیں تو آپکو نسیم عرفان کا ضرور ملاحظہ کرنا چاہئے۔ کاغذ اعلیٰ، لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب ۲۷ے/۱۷ قیمت خریدار اور کتب فروشوں کو معقول کمیشن دیا جائیگا۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمائیے



حیدرآباد مین میر نفیس کی ایک مجلس
میر نفیس وسط مین ہین اور عارف انکے داہنے جانب ہین

زمانہ

جلد ۶۷ نومبر ۱۹۳۶ء نمبر ۵

میر نفیس

از مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی

اِن کا تاریخی نام میر خورشید علی اور تخلص نفیسؔ تھا۔ میر انیسؔ کے خلف اکبر اور مسلّم جانشین تھے ۱۲۳۰ھ میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ وہیں میر خلیقؔ اور میر انیسؔ کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کی۔ شاہی مدارس میں عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کی زبان اور فن میں مشق و مہارت پیدا کی۔ نسخ و نستعلیق، دونوں خطوں پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے، شباب کے عالم میں سارا قرآن شریف ایک قلم سے لکھا تھا، لیکن وہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں تلف ہو گیا۔ اب بھی ان کے چند مخطوطے اُن کے ذی علم و نامور پوتے جناب فائزؔ کے پاس لطور یادگار موجود ہیں۔

موصوف، اپنے بزرگوں کی طرح باوضع، خوددار، نیک خو، منکسر مزاج، مہذب اور سنجیدہ واقع ہوئے تھے۔ سانولا رنگ، کتابی چہرہ، منہ پر کہیں کہیں سیتلا کے داغ، شربتی آنکھیں، کشادہ سینہ کشیدہ قامت، آغاز شباب سے آخر عمر تک ورزش کے پابند رہے۔ اپنے والد بزرگوار کی طرح اوقات کی پابندی بھی فرض سمجھتے تھے۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی، گلے میں صرف اونچی چولی کا انگرکھا، ڈھیلا پائچہ بازوں پر کلیے اور مٹھے، ہاتھ کی انگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں، جریب اور بڑا رومال۔ ابتدا میں گھیتلا پہنا کرتے تھے لیکن آخر عمر میں چوڑی لونک کا مخملی جوتا پہننے لگے تھے۔

مزاج میں عجز و انکسار بہت تھا۔ سب سے جُھک کے ملنا اور خندہ پیشانی سے پیش آنا ان کی طبیعت ثانیہ تھی۔ باتوں میں حلاوت اتنی کہ پہروں سیری نہ ہوتی، اثنائے گفتگو میں سادگی کا خیال ملحوظ رہتا، کوئی کلمہ زبان سے ایسا نہ نکلتا جو گوشِ فصاحت کو گراں گزرے۔ اکثر انکسار کے طور پر فرمایا کرتے کہ: "مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا! یہ جو کچھ ہے صرف بزرگوں کی دعاؤں کا اثر ہے۔" اگر کوئی عقیدتمند، ارادت کے جوش میں عرض کر دیتا کہ: "حضور کے مرثیوں میں میر صاحب (انیس) کا رنگ جھلکتا ہے،" تو فرماتے: "یہ کیا کہا؟ کہاں وہ کہاں میں! چہ نسبت خاک را با عالم پاک! ہاں اُن کے چمنستانِ فصاحت و بلاغت کا ادنیٰ خوشہ چیں ہوں۔" صوم و صلوٰۃ کی پابندی ہمیشہ ملحوظ رہتی، مقدور بھر نماز قضا ہوئی اور نہ روزہ، اوراد و وظائف اور تلاوتِ قرآن مجید سے بھی غفلت نہ ہونے پاتی۔

امجد علی شاہ کے عہد حکومت میں میر خلیق نے فیض آباد کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ کو مستقر بنانا چاہا تو اہل و عیال کو لیکر سبھٹی یا شیدیوں کے احاطہ میں مقیم ہوئے۔ اُس وقت میر نفیس بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ یہ زمانہ مرثیہ نگاری اور غزل گوئی کا زرین عہد کہا جا سکتا ہے۔

ہر چند میر ضمیر کو ضعف پیری نے گوشہ گیر بنا دیا تھا، مگر اُن کے شاگرد رشید مرزا دبیر کی معجز بیانیاں زمین شعر کو فلک الافلاک پر پہنچا رہی تھیں۔ آتش و ناسخ اور اُن کے ہونہار شاگردوں کا طوطی بول رہا تھا۔ لکھنؤ شاعری کا معدن تھا اور دنیائے ادب اُس کے فیضان سے استفادہ کر رہی تھی۔ یہ ماحول تھا، اور یہ فضا تھی جس میں اس بُلبلِ بوستانِ مصطفوی نے شاعرانہ زندگی کے مدارج طے کیئے۔

یوں تو دنیائے ادب میں کون ایسا ہے جس نے انیس و خاندانِ انیس کے فضل و کمال کا اعتراف نہیں کیا مگر خصوصیت کے ساتھ ریاستِ عالیہ محمود آباد اس خاندان کی قدردانی میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ امیر الدولہ راجہ امیر حسن خاں مرحوم خود سخن فہم و سخنور واقع ہوئے تھے (اور سحر تخلص فرماتے تھے) اسلیئے نہایت دریا دلی سے شعرائے باکمال کی قدردانی اور کمال نوازی فرماتے تھے چنانچہ جب لکھنؤ کی بادشاہی کا ورق اُلٹا تو بعض شعرائے عصر نے، زمانے کے سخت گیر ہاتھوں سے تنگ ہو کر اسی سرکار فیض آثار کے ظلِ عافیت میں پناہ لی۔ راجہ صاحب مرحوم کو میر مونس سے خاص عقیدت تھی اور اپنے کلام کو اُن کے مشورے سے مزین فرماتے تھے، اُن کے بعد کسی کامل فن مشیر کی ضرورت محسوس ہوئی تو نگاہ انتخاب نے میر نفیس کو چُن لیا اور موصوف سے مشورہ سخن فرمانے لگے اور وقتاً فوقتاً مزاج پرسی اور ملاقات کو بنفس نفیس میر صاحب کے سخن کدے میں تشریف فرما ہوا کرتے تھے اور میر نفیس بھی اکثر قیصر باغ یا محمود آباد جا یا کرتے تھے۔ اتحاد و قدردانی کا یہ سلسلہ راجہ صاحب مرحوم کی زندگی تک قائم رہا، پھر اُن کے بعد

اُن کے نامور جانشین مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں ساحر و محب مغفور نے خاندانی روایات کو برقرار رکھا۔[۱] میر نفیس کے پڑھنے کی مجلسیں بکثرت تھیں لکھنؤ کی سالانہ اور وقتی مجلسوں کے علاوہ بیرُن جات میں اکثر مدعو ہوتے تھے اور قدر نوازانِ سخن ہاتھوں ہاتھ لے کر سر آنکھوں پر جگہ دیتے اور عزت و توقیر میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ میر انیس کے انتقال کے بعد کئی سال تک متواتر آپ حیدرآباد دکن میں نواب نظام یار جنگ بہادر۔ نواب بہرام الدولہ بہادر اور عسکر جنگ بہادر کی مجلسوں میں کمال کے جوہر پیش کرتے رہے۔ ہر چند مرتبہ دانانِ دکن نے قدر و منزلت میں قصور نہیں کیا، لیکن سخن شناسانِ لکھنؤ کی یاد کبھی محو نہ ہو سکی۔ دکن کے ماسوا ہندوستان کی کوئی شیعی ریاست اور بستی ایسی نہیں ہے جس زمین پر اس آفتاب سخن کی ضیا بار شعاعوں نے چھوٹ ڈال کر وہاں کے ذروں کو تابناک نہ کیا ہو۔ مگر اعتراف کمال کے اعتبار سے ریاست عالیہ محمود آباد کو امتیاز خصوصی حاصل ہے۔

مجلسیں پڑھنے کا انداز بہت پیارا تھا جب پڑھنا شروع کرتے تھے تو ایک مصرعہ دوسرے مصرعے سے بہتر ادا ہوتا تھا۔ آواز کے اُتار چڑھاؤ اور لہجے کی سختی و نرمی سے مشکل مشکل مطالب ایسی خوبصورتی سے ادا کر جاتے تھے کہ مفہوم سمجھنے میں کسی کو کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ جوانی تو جوانی، پیری میں یہ عالم تھا کہ جب منبر پر تشریف لیجاتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بپھرا ہوا شیر بیٹھا ہے۔ ہر سال ۲۵ رجب کو، دل آرام کی بارہ دری میں نو تصنیف مرثیہ پڑھتے تھے۔ شائقین سخن پروانوں کے مانند جمع ہوتے تھے۔ بانی مجلس میر اعظم علی

---

[۱] ریاست کے موجودہ جواں بخت و جواں سال والی خان بہادر راجہ محمد امیر احمد خاں بہادر بھی تمام اُن اوصاف امیرانہ سے متصف ہیں جو خدائے بزرگ و برتر نے اُن کے اسلاف میں ودیعت فرمائے تھے جب تک قانونی بلوغ حاصل نہ ہونے کی وجہ سے، ریاست کی عنان، نائب ریاست کے قبضے میں رہی، آپ کی طبعی سخاوت اور فطری حق شناسی کے جوہر چراغ زیر داماں کی طرح ضیا پاشی کرتے رہے۔ آپ نے اُن تمام قدیم نمک خواروں کو جو انتظامات کی تبدیلیوں کی بدولت اپنی اپنی خدمات سے سبکدوش کر دیئے گئے تھے کبھی فراموش نہیں کیا۔ ہمیشہ مخفی عنایات سے سرفراز فرماتے رہے اور اب جبکہ ریاست کے کل اختیارات حاصل ہو چکے ہیں، اُنھیں دوبارہ اُن کی خدمات پر بحال فرمانا شروع کر دیا ہے۔ خصوصاً شعر پروری اور ادب نوازی کی ایسی مثالیں قائم فرما رہے ہیں جو اس گیا بازاری کے دور میں کم ہیں۔ اپنے علم دوست و سخن نواز اسلاف کی طرح خود بھی لیلائے سخن کے مفتوں ہیں اور محبوب تخلص فرماتے ہیں۔ چنانچہ اکثر اساتذۂ وقت دامن دولت سے وابستہ ہیں اور شاید ہی کوئی ادیب ہو جس کے آپ قدرداں نہ ہوں۔

اختتامِ مجلس تک منبر کے پاس کھڑے نگس رانی کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ مجلس جمع تھی، میر اعظم علی حسب معمول اپنی خدمت پر حاضر تھے اور میر نفیس عرشۂ منبر سے کوثر و تسنیم کا مینھ برسا رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے دفعتاً نصف قد سے بلند ہو کر اور ایک طرف انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے یہ مصرعہ کچھ اس اسلوب سے پڑھا ؏

وہ گرد اُٹھی، وہ جگر بندِ بوتراب آیا

کہ حاضرین بے اختیار مڑ مڑ کے دیکھنے لگے، گویا کربلا کا خونیں میدان اُنکی آنکھوں کے سامنے تھا اور وہ عاشورۂ محرم کی قیامت خیز لڑائی دیکھ رہے تھے! چار ہزار شامیوں کا لشکر فرات کا گھاٹ روکے کھڑا تھا اور حسینی فوج کا بہادر علم بردار، یکہ و تنہا علم بردوش و نیزہ بکف، سوکھا ہوا مشکیزہ پانی سے بھرنے آرہا ہے! یہ تو پڑھنے کے انداز کی صرف ایک مثال ہے۔ اگر تحقیقات کو وسیع کیا جائے تو نہ معلوم کتنی مثالیں اس سے بہتر و برتر دستیاب ہوسکتی ہیں۔

کلام کا ذخیرہ مرثیہ، سلام، نوحہ، رباعی، مناقب، مناجات اور بعض علمی و ادبی حواشی پر مشتمل ہے۔ اُنھوں نے میر انیس کی متابعت میں غزل گوئی کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ ابتدائے مشقِ سخن میں کچھ کہا بھی تو ضائع کر دیا۔ یہی باعث ہے کہ اُن کے عاشقانہ کلام میں آنکھوں سے لگانے کو ایک شعر بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ اُنھوں نے دنیا کے زر و مال کو حقیر سمجھ کے اغنیا کے خزانوں پر کبھی نگاہ نہیں ڈالی۔ دولتمندوں کی مدح و ثنا اور امیروں کی دربار داری سے ہمیشہ اجتناب کیا بلکہ ہمیشہ اس خاندانی خیال کو ملحوظ رکھا کہ ؎

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی! اپنی ہوا کھوؤں، سلیماں ہو کر

ان کے کلام میں فصاحت و سلاست کے ساتھ ساتھ بلاغت و ندرت کی کمی نہیں۔ صفائی و روانی کا کیا پوچھنا؟ کوثر کی دُھلی ہوئی زبان اور اُس پر میر انیس کی صیقل۔ نورٌ علیٰ نور حُسنِ بیان، لطفِ زبان اور روزمرّہ کا بحرِ بے پایاں ہے کہ موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ کربلا کے واقعات کچھ ایسی صناعیوں اور نازک خیالیوں کے ساتھ برجستہ و برجستہ عنوان سے تشبیہوں اور استعاروں کی چاشنی ملا کر پیش کئے ہیں جو میر انیس جیسے وہبی شاعر کے جانشین کے شایانِ شان ہیں۔ مرثیوں میں، رزم و بزم، صبح و شام اور مختلف قدرتی مناظر کی کمی نہیں۔ جابجا انسانی فطرت کی تصویر کشی بھی کامل طور سے موجود ہے۔ متانتِ خیال اور سنجیدگیٔ بیان کے ماسوا مرثیہ کا تسلسل اور حفظِ مراتب کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ امام کا ارشاد، عزیزوں کی گفتگو، اہلِ حرم کی بات چیت، اصحاب و انصار کی عرض و معروض، ہیں علی قدرِ مراتب جو امتیاز و افتراق ہونا چاہیے، مرثیوں میں تمام و کمال پایا

جاتا ہے حتیٰ کہ یہ فرق تلواروں اور گھوڑوں میں بھی نظر آتا ہے۔ امام کے گھوڑے کی شان جدا، جوانان بنی ہاشم کے راہواروں کی آن بان علٰحدہ، یاوروں اور تاجروں کے مرکبوں کے ٹھاٹھ الگ۔ اگر اُنکی تمام خصوصیات سے قطع نظر کرکے صرف اسی ایک خصوصیت کو دیکھا جائے تو اُن کا وقارِ شاعری تسلیم کرنا پڑتا ہے چہ جائیکہ وہ تمام محاسن فضل وکمال جو قدرت نے اُن کی ذات میں جمع کر دیئے تھے اور جو ہمیشہ اُن کے نام کو زندہ رکھنے والے ہیں۔

آخر عمر میں ضعف پیری نے بالکل ہی مضمحل و افسردہ کر دیا تھا، بات بات میں احباب سے فرمایا کرتے تھے "بھئی، ہم تو چراغ سحری ہیں، معلوم نہیں کس وقت باد فنا کا جھونکا چل جائے"۔ کبھی کبھی نظم میں بھی اس خیال کا اعادہ فرماتے تھے جب ۲۵ رجب ۱۳۱۸ھ میں آخری مجلس پڑھی تو مرثیہ کے ایک بند کی ٹیپ میں اہلِ مجلس کو مخاطب کرکے فرمایا ؎

دعائے خیر سے روحِ حزیں کو شاد کریں
ہمارے بعد بھی احباب ہم کو یاد کریں

صاحبانِ کمال روشن ضمیر ہوا کرتے ہیں۔ اُن کے تخیّل کی موجیں واقعیت کے رنگ میں ڈوب کے اُبھرتی ہیں چنانچہ میر نفیس کی یہ پیشین گوئی بھی صحیح ثابت ہو کے رہی۔ اس مجلس کے چار مہینے بعد چند روز بستر علالت پر کروٹیں لے کر یہ بلبلِ بوستانِ مدحت ۱۳ ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۱ء ۳ بجے رات کو ریاض خلد کیطرف راہی ہو گیا۔ صبح کو دریا پر غسل دیا گیا اور میت کو نہایت احترام و اہتمام کے ساتھ حسینیۂ ممتاز العلما، سید تقی صاحب میں لائے۔ شہر کے وضیع و شریف، علما و صلحا، شعرا و ادبا کا ہجوم تھا۔ مجتہد العصر میر آغا صاحب نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ ہزارہا مومنین نے اُن کی اقتدا کی۔ پھر سہ پہر کے قریب، اپنے خاندانی مقبرے میں میر انیس کے برابر سپرد زمین ہوئے۔ شعرائے وقت نے سیکڑوں تاریخیں لکھی ہیں۔ اُن میں سے مولوی عبدالرحیم کلیم کی تاریخ درج ذیل ہے ؎

بجنت شد، قریب صبح، خورشید علی طالع — فزوں از نور او نورِ جہاں از چشم خازن شد
لبفن مرثیہ گوئی، امام مرثیہ گویاں — نجاتِ اہلِ عالم را، کلام پاک ضامن شد
کلیم! از بہر سالِ ہجرئی نوشش رقم کردم
انیس و مونس جنت نفیس پاک باطن شد

اب کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ جناب عون و محمد کے حال کا مرثیہ ہے۔ اسمیں اسلامی صبح کی منظر کشی کرتے ہوئے معجز نگار قلم کا زور دکھاتے ہیں ؎

بیاضِ صبح کا جب چرخ پر ظہور ہوا — جو دور، تیرگیٔ شب کا تھا وہ دور ہوا

رخِ سحر سے منجلی حسنِ روئے حور ہوا   محیطِ کون و مکاں آسماں کا نور ہوا
مطیعِ خالقِ لیل و نہار اُٹھنے لگے
پئے نماز عبادت گزار اُٹھنے لگے

کسی نے غسل کیا اور کیا کسی نے وضو   گل اذان کی لگی جانے تا فلک خوشبو
نسیم طاعتِ ربِّ علا چلی ہر سو   شگفتہ جوشِ عبادت سے ہو گئے گلرو
جہاں میں فصل صلوٰۃ و درود کی آئی
بہارِ تازہ قیام و قعود کی آئی

مُصلّیوں کے مُصلّے بچھے برائے نماز   فلک کے اوج پہ جانے لگی صدائے نماز
نمازیوں کے وہ نور اور وہ حُسن جائے نماز   ملک بھی وجد میں تھے دیکھ کر ادائے نماز
وہ کونسی تھی عبادت، جو سرفراز نہ تھی
نمازیوں کی وہ معراج تھی نماز نہ تھی

کربلا کے محشر خیز میدان میں صبح عاشور کی نمود اور امام حسینؓ کی بجماعت نماز کی تصویر اسطرح پیش کیجاتی ہے

فریضۂ سحری میں اُدھر تھے محوِ حسینؓ   حضورِ قلب تھا فرض ادائے فرض العین
سبھوں کے آگے رسولِ خدا کے دل کا چین   پسِ امام غلامانِ شاہِ بدر و حنین
اِدھر سے صورتِ حسن جب فلک پہ جاتی تھی
صدائے مدح و ثنا آسمان سے آتی تھی

علیؓ کا چاند تھا ایک اور قمر بہتّر تھے   خدا شناس تھے اور عارفِ پیمبرؐ تھے
حبیبِ سبطِ نبیؐ، عاشقانِ حیدرؓ تھے   اطاعت اور عبادت میں خم کئے سر تھے
رُخ اُن کے صورتِ خورشید کیوں نہ پُرضو ہوں
امام ایسا ہو آگے تو ایسے پیرو ہوں

دلوں میں اُن کے ولا شاہِ بےعدیل کی تھی   نگاہِ لطف ادھر خالقِ جلیل کی تھی
ہوس کثیر کی نے دولتِ قلیل کی تھی   خیال خلد کا تھا، چاہ سلسبیل کی تھی
خدائے پاک کا فاقوں میں شکر کرتے تھے
عطش میں، ساقیٔ کوثر کا دم وہ بھرتے تھے

صبح کی نماز ختم ہوئی، امام نے سلام پھیرا۔ عبادت گزاروں نے خدا کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلا کر مناجات شروع کی

پس درود و ثنائے رسولؐ و وصیٔ غدیر　یہ تھا لبوں پہ کہ اے قادرِ علیم و خبیر
غلام ہم ہیں علیؓ کے تو خادم شبیرؓ　مسافرت میں ہیں غم خوارِ سرورِ دلگیر
لہو میں آج بھریں سر سے تا قدم یارب!
ہمارے نام شہیدوں میں ہوں رقم یارب!

دمِ وغا مددِ شاہِ نامدار کریں　نبیؐ کے لال پہ جانوں کو ہم نثار کریں
ستمگروں کو تہِ تیغِ شعلہ بار کریں　جہاں میں نام ہو وہ آج کارزار کریں
ڈگیں نہ پاؤں، نہ لاکھوں سے کم رہیں یارب!
کٹیں جو سر بھی تو ثابت قدم رہیں یارب!

علیؓ کے گھر کی شجاعت دکھا دکھا کے مریں　عطش میں جرأت و ہمت دکھا دکھا کے مریں
دمِ جدال فتوت دکھا دکھا کے مریں　جو تو نے دی ہے وہ طاقت دکھا دکھا کے مریں
یہ جنگ آج کی سب کی نظر پہ چڑھ جائے
ہمارے بازوؤں کا زور آج بڑھ جائے

ادائے فرض کی خوشی میں مومنین مصافحہ و معانقہ کرتے ہیں۔ اس حالت کا مرقع ان لفظوں میں کھینچا گیا ہے ؎

یہ کہہ کے شکر کے سجدے نمازیوں نے کئے　رُخ اپنے اُن کی طرف سرفرازیوں نے کئے
مصافحے بخوشی اُٹھ کے غازیوں نے کئے　سلام کعبۂ دیں کو حجازیوں نے کئے
سپاہ کیں میں جو واں کوس جنگ بجنے لگے
حسینؓ گھر میں گئے۔ یہ سلاح سجنے لگے

ایک اور مرثیہ میں اُس حالت کو یوں بیان کرتے ہیں جب امام حسینؓ جاں نثاروں کے جھرمٹ میں خیمہ گاہ سے میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوتے ہیں ؎

جبریلؑ پیادہ ہیں، زہے شانِ سواری　مولا کی سواری ہے کہ اک قدرتِ باری
مٹی ہے چمن! گرد ہے یاں بادِ بہاری　اس خاک میں بوئے عنبر سارا کی ہے ساری
گلدستۂ جنت کو صبا لے کے چلی ہے
گھوڑے ہیں کہ پھولوں کو ہوا لے کے چلی ہے

ہاشمی جوان باری باری سے جاں نثاری کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ جناب مسلمؓ کے دو صاحبزادے شہادت کے جام نوش کر چکے جعفرؓ طیارؓ کی اولاد کو شہادت کا درجہ مل چکا۔ جناب زینبؓ کے صاحبزادے

جہاد کے شوق میں بے چین ہیں۔ دونوں بھائی مل کر امام کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور اذنِ جنگ طلب کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں ؎

کیا شان ہے تیغیں ہیں بے پیہ دکھائیں　　ہم بھی تو انھیں جوہر شمشیر دکھائیں
کچھ زور نمک خواریِ شبیرؑ دکھائیں　　کچھ والدہ کے دودھ کی تاثیر دکھائیں
فوجوں کی جو کثرت ہے تو معذور نہیں ہیں
وہ بھی تو یہ جانیں کہ غلام شہِ دیں ہیں

جناب عون و محمد رخصت کے لئے خیمہ میں آئے ہیں۔ بیبیاں جمع ہیں حضرت زینبؑ اس لئے برہم ہیں کہ صاحبزادوں نے اب سے پہلے اپنے ماموں پر جانیں کیوں نہیں نثار کیں، لیکن جناب علیؑ اکبر کو دیکھ کر گلے سے لگاتی ہیں۔ جناب شہربانوؓ بھی وہاں موجود ہیں وہ دونوں صاحبزادوں کی سفارش میں زبان کھولتی ہیں ؎

بانوؓ نے کہا، اِن کو بھی چھاتی سے لگاؤ　　مہماں ہیں، مسافر ہیں، نہ بچّوں کو رلاؤ
دونوں سے کہا، آؤ میں واری ادھر آؤ　　جاتے ہو تو مادر کے قدم چوم کے جاؤ
بیٹوں کو یہ دولت کسی عنواں نہیں ملتی
سب ملتے ہیں دنیا میں مگر ماں نہیں ملتی

ماں کا دل صاف ہو گیا۔ بیٹوں کو لڑائی کی اجازت مل گئی۔ صاحبزادے جہاد کے شوق اور ولولے میں در خیمہ کی طرف بڑھے۔ ماں کی آنکھوں میں بچّوں کا سپاہیانہ بانکپن کھینچنے لگا۔ اِس موقعہ پر قدرتاً جو جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اُن کی ترجمانی ملاحظہ ہو ؎

کچھ ہٹ کے جھکے وہ پئے تسلیم ادب سے　　دل سینوں میں بالیدہ ہوئے فرحِ طرب سے
تن کر جو چلے وہ تو کہا ماں نے یہ سب سے　　ملتی ہے بہت شان شہنشاہ عرب سے
ماموں پہ فدا ہوتے ہیں اقبال تو دیکھو
لوگو! مرے چھوٹے کی ذرا چال تو دیکھو

کیا مجکو بھلے لگتے ہیں اسوقت یہ دلدار　　جی چاہتا ہے چھاتی سے لپٹالوں پھر اک بار
اس عمر میں باندھے ہیں عجب حسن سے ہتھیار　　کس نے یہ سکھائی ہے علیؑ کی انھیں رفتار
زلفوں نے بھی بل کھائے ہیں سینے بھی تنے ہیں
کاہے کی یہ شادی ہے کہ دولھا سے بنے ہیں

پسرانِ جنابِ زینبؑ کا رجز سنئے ؎

نعرہ ہے کہ ہم وارثِ شمشیر علیؑ ہیں — کرار ہیں، صفدر ہیں، شجاعِ ازلی ہیں
اسرار خفی جو ہیں وہ سب ہم پہ جلی ہیں — کونین کے والی ہیں تو خالق کے ولی ہیں
ہے عرشِ خدائے دو جہاں طور ہمارا
پہلے جو ہوا خلق، وہ ہے نور ہمارا

پیاسے ہیں مگر چشمۂ کوثر سے ہیں بہتر — سدرہ سے جو برتر تو گلِ تر سے ہیں بہتر
پستی میں ہیں، پر عرشِ منوّر سے ہیں بہتر — اعلیٰ سے ہم اعلیٰ ہیں تو بہتر سے ہیں بہتر
گر قربِ نبیؐ عالم بالا کو نہ ملتا
یہ اوج کبھی عرشِ معلیٰ کو نہ ملتا

نیمچوں کی تعریف میں سیف زبانی ملاحظہ ہو ؎

وہ نیمچے تھے اک غضبِ حضرتِ قہار — اک مرگِ مفاجات تو اک صاعقہ کردار
یہ زہر وہ جاں سوز، یہ قتال وہ خوں خوار — یہ برق وہ شعلہ، یہ شرر خو وہ شرر بار
سر بر ہو یہ مقدور نہ تھا لشکرِ کیں کا
نصرت تھا کا آیہ، وہ ظفر کا تھا نتیجا

جنگ مغلوبہ کی شان دیکھئے۔ خانوادۂ رسولؐ کے کم سن بچے کیوں کر دادِ شجاعت دیتے ہیں؟ ؎

گھوڑوں کو دبا کر اِدھر آئے اُدھر آئے — نیزوں کو ہلا کر اِدھر آئے اُدھر آئے
ہر صف کو بچھا کر اِدھر آئے اِدھر آئے — فوجوں کو بھگا کر اِدھر آئے اُدھر آئے
پھرتی تھی نظر چار طرف آپ کہیں تھے
تلوار جدھر فوج میں چمکی یہ وہیں تھے

خاک اُڑنے لگی، بیچ میں جس غول کے آئے — اس صف کو بھگایا تو اُسے رول کے آئے
اُن چھوٹی سی تیغوں کو جدھر تول کے آئے — نیزے کی ہر اک سخت گرہ کھول کے آئے
غل تھا کہ یہ حملے یہ لڑائی نہیں دیکھی
اس طرح کسی صف کی صفائی نہیں دیکھی

خالی کہیں ترکش، تو کہیں تیر پڑے تھے — ٹکڑے کہیں چلّے کہیں زہ گیر پڑے تھے
ڈھالیں تھیں کہیں اور کہیں بے پیر پڑے تھے — منہ پھیرے ہوئے صاحبِ شمشیر پڑے تھے

نیزوں کی زبانیں تھیں قلم ہاتھ تبر کے
تلواروں کے پھل ٹوٹ گئے پھول سپر کے

اللہ رے پریشانیٔ افواجِ ستمگر — وہ غول ندارد، یہ پرا گم، وہ صف ابتر
نعلین کہیں، ہاتھ کہیں اور کہیں مغفر — یہ ڈھال، وہ تلوار، یہاں جسم، وہاں سر

بھاگڑ میں قدم رکھتے تھے ٹکڑوں پہ جگر کے
پہچانتا تھا باپ نہ لاشہ کو پسر کے

چاہئے تو یہ تھا کہ میر نفیس کے گلستانِ فصاحت سے ہر رنگ و بو کے پھول چن کر گلدستہ تیار کیا جاتا مگر اسے کیا کیا جائے کہ رسالے کے مختصر اوراق مفصل تبصرے کے متحمل نہیں محاسنِ کلام و فصاحت کے مقتضی اور جگہ کی قلت عنان گیر۔ اسی کشمکش میں یہ تذکرہ تمام ہوتا ہے۔ خدا نے چاہا تو پھر کسی موقعہ پر اس شہنشاہِ ملکِ سخن کی بارگاہ میں نذرِ ارادت پیش کرنے کا افتخار حاصل کروں گا۔

آ۔ بوستاں میں رقص نسیم بہار دیکھ

از حضرت جوش ملیح آبادی

ہاں اسطرف بھی عابدِ شب زندہ دار دیکھ — ایمان ڈھل نہ جائے گا۔ صرف ایک بار دیکھ
تاچند جست و خیز بہ آئینِ خانقاہ — آ بوستاں میں رقصِ نسیمِ بہار دیکھ
مستوریوں میں لطف و عطا کا گزر نہیں — مستوں میں جوشِ رحمتِ پروردگار دیکھ
دودِ چراغِ مسجد و محراب تا کجا؟ — آ اضطرابِ ابرِ سیہ کوہسار دیکھ
ظرفِ گلی میں آبِ وضو دیکھتا ہے کیا؟ — جامِ خنک میں رنگِ مئے خوشگوار دیکھ
تاچند اشتیاقِ نمودِ ہلالِ عید؟ — ابرو پہ ناز طرفِ کلاہِ نگار دیکھ
تاکے طلسمِ کاکلِ پیرانِ پارسا؟ — او نامراد! عربدۂ زلفِ یار دیکھ
تاچند فکرِ حور و تمنائے سلسبیل؟ — نازِ سہی قدانِ لبِ جوئبار دیکھ

کیا دیکھتا ہے عقل کی محفل میں رعبِ شیخ
بزمِ جنوں میں جوش کا عز و وقار دیکھ

کشورِ ہندوستاں اور حضرتِ جوشؔ

از شاعرِ اعظم حضرت جوشؔ ملیح آبادی

بالا ہیں جوشؔ دامِ زمان و مکاں سے ہم
تخئیل قید و بند کو لائیں کہاں سے ہم

کوثر کی آرزو میں رہیں گے نہ تشنہ کام
پیماں یہ کر چکے ہیں مئے ارغواں سے ہم

اے حُسنِ لازوال! قسم تیرے ناز کی
بیگانہ ہو چکے ہیں بہار و خزاں سے ہم

انمول بننے والے ہیں جس چیز سے کبھی
ارزاں ہیں آجکل اسی جنسِ گراں سے ہم

اب اے خدا! عنایتِ بے جا سے فائدہ
مانوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم

روز اک نئی زمیں سے گذرتے ہیں ہر نفس
ملتے ہوئے ہیں موجۂ آبِ رواں سے ہم

کیا کہہ رہے ہو دُور سے! اربابِ کیف و کم
باہر کھڑے ہیں حلقۂ سود و زیاں سے ہم

یہ طُرفہ بات ہے کہ بہ ایں فقر و بیکسی
ہیں بہرہ یاب دولتِ کون و مکاں سے ہم

جب چاہے حُسن عشق کے سانچے میں ڈھال لے
پگھلے ہوئے ہیں آتشِ رطلِ گراں سے ہم

شکر خدا کہ شعر کی اکسیر مل گئی
اے عمرِ جاوداں تجھے لائے کہاں سے ہم

پائندہ باش اے خمِ ابروئے دلنشیں
اب کھیلتے ہیں موت کی تیر و کماں سے ہم

آب و ہوائے عالمِ نور و نقوشِ نار
کتنے خجل ہیں سجدۂ کرّوبیاں سے ہم

ہر نقشِ پا پہ لوٹ رہی ہیں جوانیاں
یوں آ رہے ہیں خدمتِ پیرِ مغاں سے ہم

جنگل ہے۔ چاندنی ہے۔ شبِ ماہتاب ہے
ایسے میں آنکو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم

اہلِ زمیں۔ غریب ہیں ہم نکتہ چیں نہ ہو
آتے ہیں گاہ گاہ یہاں آسماں سے ہم

اُٹھنا تھا جن کو غیر زمینوں سے اُٹھ چکے
اب جوشؔ اُٹھے ہیں کشورِ ہندوستاں سے ہم

اشعارِ بالا سے ہمارے محترم دوست حضرت جوشؔ کے شاعرانہ مسلک کی بخوبی توضیح ہوتی ہے۔ یہ دوستانہ عطیہ ایک عرصے سے ہمارے پاس محفوظ تھا اور ہم اسے کسی وقت مناسب پر شائع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ناظرین کو ایک غیر معین مدت تک اس سے محروم رکھنا بھی گوارا نہیں اسلئے اسی پرچے میں اس کے اشاعت کی عزت حاصل کیجاتی ہے۔ حسنِ اتفاق سے اس موضوع پر ایک اور دلپذیر

نظم "شمع فروزاں" کے عنوان سے ہمعصر کلیم دھلی کے تازہ نمبر میں شائع ہوئی ہے جسمیں لطیف شاعرانہ تعلی کیساتھ ساتھ ہمارے دوست نے شاید کسی عالم وارفتگی میں اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں کو بھی آشکارا کر دیا ہے۔ چونکہ اس نظم میں جوش کی شاعری کی مزید توضیح و تشریح ہوتی ہے اس لئے ہم اسے بھی ذیل میں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ زمانہ میں عموماً اقتباسات اور شائع شدہ مضامین کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی لیکن ہمعصر کلیم سے خوشہ چینی میں ہم کو اسلئے اور بھی کوئی تکلف نہیں کہ حال ہی میں ہمارے محترم دوست نے ہمکو لکھا تھا کہ انکی نظم و نثر پر زمانہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو کلیم کو۔ اور زمانہ کاپی رائٹ وغیرہ کی پابندیوں سے اسیطرح مستثنیٰ ہے جسطرح کلیم۔ کیونکہ جوش صاحب کو زمانہ و کلیم دونوں یکساں عزیز ہیں اور وہ ان دونوں ادبی خادموں میں کوئی فرق نہیں کرنا چاہتے۔

ہماری اور ناظرین زمانہ کی خوش نصیبی ہے کہ جوش جیسا یگانۂ روزگار انسان پرست شاعر زمانہ کی بزم سخن کا بھی شمع فروزاں ہے۔

(ایڈیٹر)

شمعِ فروزاں

میں اے جوش اس دور میں ہوں وہ شاعر
حریفوں کے آگے مری شاعری ہے
اندھیرے میں جس طرح شمع فروزاں
کہ ہے پیشِ تورات و انجیل قرآں

مرا دل، وہ فیاض خرمن ہے، جس سے
دمِ فکر، دل میں مچاتی ہیں دھومیں
چمن ریز ہے دامنِ خوشہ چیناں
تمنائے بیدار ئی نوعِ انساں

مرا شعر، اس عصرِ بے رنگ و بو میں
مرا دل دھڑکتا ہے یوں زیر بم سے
لبِ تیرگی جلوۂ آبِ حیواں
جھلکتی ہے جس طرح، مژگانِ دوراں

مری طبع ہے تازہ اندیشیوں سے
مری سادگی میں بھی وہ دل فریبی
شگفتہ تراز خندۂ نازنیناں
شبِ ماہ میں جس طرح خوابِ طفلاں

شبِ تار میں، میری آشفتہ حالی
مرے ذہن پر رشحۂ ابرِ معنی
دمِ صبح، گویا خمِ زلفِ جاناں
جوانی کے ماتھے پہ جس طرح افشاں

مری بارشِ فکرِ رنگیں کی رَو میں
بساطِ ادب پر مری طبعِ رنگیں
منقش تنک رنگئ ہم نشیناں
سرِ شاخ جس طرح، مرغِ خوش الحاں

خراماں ہے دل میں مرے روحِ وحشت
مرے دل میں عہدِ تمنا کی راتیں
بہ اندازِ دوشیزگانِ بیاباں
گھنے باغ میں جس طرح برق و باراں

مری چشمِ تر میں تمنا کی ہلچل
مرا دل ہے اے جوش! داغوں کی ضو سے
سرِ آب جس طرح، موجِ چراغاں
برشتہ تراز حسنِ صحرا نشیناں

زندگی کا صحیح فلسفہ

از مسٹر رام نراین نگم۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا (چکبست)

ہمارا مادّی جسم کیا ہے۔ کن اجزاء سے بنا ہے۔ وہ کون سی طاقت ہے جو اس مشین کو چلاتی ہے۔ اسکی ساخت کی غرض کیا ہے۔ کس طرح یہ قائم رہتا اور کن وجوہ سے فنا ہوتا ہے۔ بیماری۔ بڑھاپا اور موت سے بچنے کی کوئی تدبیر بھی ہے؟ یہ وہ اہم مسائل ہیں جن کے حل وعقد میں انسانی دماغ ازل سے مصروف رہا ہے اور شاید ابد تک اسی فکر میں مبتلا رہے گا۔ لیکن اس سلسلہ میں دورِ جدید کے سائنس داں جس نتیجہ پر پہونچے ہیں اُس کا مختصر بیان اس مضمون میں کیا جاتا ہے۔ تمہید کے طور پر انسانی جسم کے قدرتی نظام پر ایک سرسری نظر ڈالنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

جسم کی ساخت انسانی جسم عظام۔ پٹّھوں۔ اعصاب۔ دماغ۔ احشاء (پھیپھڑے۔ دل۔ جگر۔ معدہ وغیرہ) غدود۔ خون۔ جلد وغیرہ پر مشتمل ہے جس کا حاکم دماغ ہے۔ دماغ کے دو حصّے ہیں اوّل Conscious mind. (باخبر دماغ) یعنی وہ حصّۂ دماغ جس کے فرائض میں سوچنا۔ بحث وتحیص۔ تمیز کرنا اور بیرونی دنیا سے سروکار رکھنا وغیرہ وغیرہ ہیں۔ جو اسِ خمسہ کے ذریعہ اسکو براہ راست خبر پہونچتی ہے۔ مگر جسم کے اندرونی افعال وعملیات کی انجام دہی میں جب یہ خود مصروف ہوتا ہے تو اسکو کوشش زیادہ کرنا پڑتی ہے اور نتیجہ خفیف حاصل ہوتا ہے۔ Voluntary nerves (ارادیہ) اعصاب اس کے ٹیلیگراف آفس ہیں۔ دوسرا حصّہ Sub-conscious mind (ماتحت دماغ) وہ اندرونی حصّۂ دماغ ہے جسکو حواسِ خمسہ کے ذریعہ براہ راست خبر نہیں پہونچتی بلکہ وہ روح اور باخبر دماغ سے ہدایت حاصل کرتا ہے۔ باخبر دماغ میں جیسے ہی کوئی خیال پیدا ہوا کہ فلاں کام اس طرح انجام ہونا چاہئے فوراً ہی ماتحت دماغ Sympathetic nerves (غیرارادیہ) اعصاب کے

جو خاص طور سے اس کے زیر اختیار ہیں اُن پٹھوں سے جنسے وہ کام انجام پاسکتا ہے اسکی تحریک کرتا ہے۔ تمام اندرونی افعال و عملیات جاری کرنا اس کے خاص فرائض میں سے ہے۔ یہی بچپن سے لیکر بلوغیت تک جسم کی تعمیر کا ذمہ دار ہے۔ غذا کا انہضام۔ غدود میں رطوبات لطیفہ کی فراہمی چلنا۔ پھرنا۔ کھیلنا۔ کودنا۔ سب کچھ اسی حصّہ دماغ کے حکم و ہدایت سے ہوتا ہے۔ بیماری کے مقابلہ میں زبردست لڑائیاں لڑنے کا بار بھی اسی بیچارے کی گردن پر ہے۔ جتنے کام ہم خود یا عادتاً کرتے ہیں وہ سب ماتحت دماغ ہی کی بدولت ہوتے ہیں جزئیات (مثلاً گھاس چھیلنا) اور اہم سے اہم کام (مثلاً انجن یا ہوائی جہاز چلانا) شروع میں نہایت دقت طلب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ابتداءمیں باخبر دماغ اُس طرف رجوع کرتا ہے جسمیں بڑی کوشش سے کمتر نتیجہ حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔ مگر رفتہ رفتہ مشکل سے مشکل کام میں بھی طاق ہوجاتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ماتحت دماغ جس میں تھوڑی کوشش سے بڑا نتیجہ حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اُس کام کو براہ راست اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ اسی حالت کا نام عادت ہے۔ اس حالت میں باخبر دماغ کو عادتاً انجام پانے والے کاموں سے سبکدوش ہوکر دوسرے ضروری مشاغل کی طرف متوجہ ہونیکا موقع ملتا ہے۔

علم النفس (Psychology) کے ماہرین کا قول ہے کہ بڑا آدمی وہ ہے جس نے صحیح عادات قائم کرلی ہیں۔ خیال و احساس کی عادت۔ کام کی عادت۔ اپنی ذات سے بہت کچھ اُمید رکھنے کی عادت ہر کام میں ہمہ تن مصروف ہونیکی عادت۔ اور ہر ایک نئے کام کو کامیابی کیساتھ سرانجام دینے کی عادت یہ سب عادتیں عموماً بڑے آدمیوں میں پائی جاتی ہیں۔ قوت ارادی بھی ایک عادت ہے جس کا خاصّہ ہر بات یا کام کو جو شروع کیا جائے ہمیشہ انجام تک پہونچا کر چھوڑتا ہے۔

غرض انسانی جسم کی مشین مکمل بنائی گئی ہے اور اسمیں ہر لحظہ سائنس کے تمام اصولوں پر عمل جاری رہتا ہے۔ انسان نے جب علم کیمیا میں فضیلت حاصل کی تو اُسکو اپنے جسم کی حیرت انگیز کیمیا سمجھ میں آئی اور اسے چار و ناچار کہنا پڑا کہ "اگر پارہ کو لے اکسیر گرمارا تو کیا مارا"

روشنی اور آواز کے قوانین معلوم ہونے کے بعد اسے تحقیق ہوا کہ ازل سے انسان کی آنکھیں اور کان ٹھیک اُنہیں اصولوں پر کام کرتے چلے آرہے ہیں۔ علی ہذا القیاس۔

جسم کیسے قائم رہتا ہے | جسم اپنا وجود قائم رکھنے کی غرض سے تمام دنیاوی اشیاء سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔ اسے قدرت سے اپنی صحت کی درستی و تجدید کے لئے نہایت وسیع طاقتیں عطاء ہوئی ہیں

جسم کے گھسے گھسلے ریشے نئے ریشوں سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یہانتک کہ سال کے آخر میں کوئی پرانا ریشہ باقی نہیں رہ جاتا۔ بعض بعض نازک ریشے ماہوار بدلتے رہتے ہیں اور گیارہ ماہ کے وقفہ سے عظام کی تجدید بھی ہوتی رہتی ہے۔

روح | مگر اس قدر مکمل ہونے کے باوجود جسمانی مشین ازخود نہیں چل سکتی ہے اور رُوح کی طرح محتاج ہے جس طرح کہ انسان کی بنائی ہوئی مشین دھواں اور برقی طاقت کی۔ رُوح جسم ودماغ دونوں سے مختلف ایک لامحدود۔ لافانی۔ لازوال ربانی طاقت ہے۔ وہ نظر سے پنہاں مگر ہمہ گیر ہے۔ بڑے سے بڑے جانور سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے حشرات الارض تک میں یکساں رُوح ہے دراصل رُوح کسی مادّی چیز کی محتاج نہیں ہے۔ اسے نہ ہوا کی ضرورت ہے اور نہ پانی کی۔ نہ غذا درکار ہے اور نہ دوا کی حاجت ہے۔ نہ اس پر کسی آفت غم صدمہ۔ بیماری یا بڑھاپے کا کوئی اثر ہوتا ہے۔ البتہ جس طرح روح کے بغیر مادّی جسم محض مٹی کا تودہ ہے اُسی طرح دنیا سے تعلقات پیدا کرنے کی غرض سے روح کو بھی لازمی طور پر کسی نہ کسی مادّی جسم کی ضرورت ہے" کیونکہ اسی مادّی جسم کے بدولت رُوح کو دنیا کے حالات کی خبر پہونچتی اور اس کی مرضی پوری ہوتی ہے۔

روح کا طرز حکومت | مادّی جسم پر روح کی حکومت دماغی ضوابط کے ذریعہ ہوتی ہے یعنی روح کے ایما پر دماغ میں خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ حسب ضرورت ایک مرقع تیار کرتا ہے جس کے مطابق مادّی کام کی تشکیل ہوتی ہے۔ مثلاً معمار پہلے اپنے دماغ میں عمارت کا مرقع تیار کرتا ہے اس کے بعد وہ عمارت بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا کی جو جو حیرت انگیز ایجادیں آج ہمارے پیش نظر ہیں ان سب کا مرقع پہلے پہل انسانی دماغ ہی میں مرتب ہوا تھا۔ ادھر دماغ میں خیال پیدا ہوا اُدھر مقصد مطلوبہ کی تشکیل وتکمیل کی غرض سے متعلقہ پٹھوں کی جانب Nerve energy. (عصبی قوت) روانہ کی گئی۔ جو روح کی مرضی پوری کرنیکا واحد ذریعہ ہے۔ پٹھوں کو رواں کرنے کے لئے قوتِ عصبی کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ موٹر کے لئے برقی طاقت' اور ہر ایک پٹھا اسی تناسب سے تیزی یا سستی کیساتھ حرکت کرتا ہے جسقدر زوردار قوت عصبی اُس کی جانب روانہ کیجاتی ہے۔ ہمارا ہر کام کسی نہ کسی تصوّر کا نتیجہ ہوتا ہے اور چونکہ ہر خیال اور ہر کام میں خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا قوت عصبی کا صرف ہوتا ہے لہذا قوت عصبی کا گنجینہ جو براہ راست روح کے زیر نگیں ہے خالی ہوتا رہتا ہے۔ تجربات ومشاہدات سے ثابت ہو چکا ہے کہ ابھی ہم اپنے نوّے ۹۰ فیصدی دماغی ضوابط

ط

Radio, Television and Talkies.

سے آگاہ نہیں ہیں۔ عصبی قوت کا نقصان وخسارہ آرام اور غذا وغیرہ کے ذریعہ پورا ہوتا ہے چنانچہ ماہرین سایکالوجی نے اس کو بطریق احسن پورا کرنے کے خاص خاص عمل بتلائے ہیں۔ انسان کا خاصہ تین قسم کا ہے اوّل جسمانی دوم دماغی سوم روحانی اور جبتک ان تینوں میں پورا تعاون نہ ہوگا۔ انسانیت کی تکمیل نہ ہوسکیگی۔ مثلاً عصبی قوت کی کمی بیشی پر نہ صرف ہر کام کی ناکامیابی اور کامیابی منحصر ہے بلکہ اسمیں ہماری فنا و بقا کا راز بھی مضمر ہے کیونکہ جب ہمارے عصبی قوت کا خزانہ بالکل خرچ ہوجاتا ہے اور جسم میں اسکی کمی پورا کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی تو روح اس قالب فانی کو ترک کردیتی ہے اور ہمکو اُس مہیب اور ناگزیر آفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جسکو موت کہتے ہیں۔

بیماری۔ بڑھاپا اور موت سے بچنے کی تدابیر

بیماری۔ بڑھاپا اور موت کے متعلق دورجدید کے ماہرین سائینس کا خیال ہے کہ یہ آفات خود ہماری "غلط کاری" کا ثمرہ ہیں اور اگر صحیح طریقوں پر زندگی بسر کی جائے تو ان سے یقینی طور پر نجات حاصل ہوسکتی ہے۔

"غلط کاری" کا مفہوم نہایت وسیع ہے۔ یہ دنیا سبب[1] اور نتیجہ کی جگہ ہے۔ قدرت کے قوانین پر عمل پیرا ہونے سے انسان سب کچھ حاصل کرسکتا ہے ورنہ ان قوانین سے انحراف یا خلاف ورزی کے مضر نتایج سے بچنا کسی حالت میں بھی ممکن نہیں ہے۔ "از دست تو ہیچ دست بالاتر نیست" کی ضرب المثل بالکل صحیح ہے۔ ہمکو ان قوتوں سے جو قدرت نے اپنی فیاضی سے ہماری فلاح وبہبود کی غرض سے عطا کی ہیں صحیح طریقہ پر پورا پورا کام لینا اور اُن کے غلط وبیجا استعمال سے ہمیشہ گریز کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ انسانی مشین کو حسن وخوبی سے چلانے کے لئے رُوح۔ دماغ اور مادّی جسم تینوں کا اشتراک عمل لازمی ہے۔ جسم کو بھی تجدید و درستی کی لامحدود طاقتیں ودلیعت ہوئی ہیں۔ دماغ کے بھورے حصّہ میں نوارب اور ایک کھرب تیس ارب کے درمیان (cells.) ذرّات جو صرف خوردبین سے دکھائی دیتے ہیں، پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں کام کرنے کی بیحد صلاحیت ہے بشرطیکہ ہم اُن کو کام کرنیکا موقع دیں یعنی ان کو استعمال کریں۔ قوت عصبی کا گنجینہ کبھی خالی نہیں ہوسکتا اگر اُس کے نقصانات پورے کرنیکے صحیح طریقے عمل میں لائے جائیں۔ سائینس نے اس بات کو پایہ ثبوت تک پہونچا دیا ہے کہ ہم میں سے بہت ہی کم افراد ایسے ہیں جو اپنی جسمانی دماغی اور روحانی قوتوں کے دسویں حصہ کا بھی صحیح استعمال کرسکتے ہیں۔ ایسی صورتمیں تعجب ہے کہ ہمکو آئے دن بیماری۔ بڑھاپا۔ موت۔ ناکامی۔ مفلسی وغیرہ کی مصائب کا سامنا رہتا ہے۔ درحقیقت ان تمام آفات کی پوری ذمہ داری خود انسان کی گردن پر ہے۔ عدم واقفیت کی بدولت ہمکو ہمیشہ سے

[1] Cause and effect.

یہ یقین کامل رہا ہے کہ یہ مادی جسم فانی ہے ضعف۔ بیماری۔ بڑھاپا۔ وغیرہ کا خوف انسان کی سرشت میں داخل ہوگیا ہے اور اس طرح ماتحت دماغ نے ان برباد کُن منفی خیالات کو اپنے اندر جذب کر رکھا ہے پس سبب اور نتیجہ کے قانون کی رُو سے ہمکو یہ سب آفات سزا کے طور پر بھگتنا پڑتی ہیں اکثر ہم اپنی قوتوں کے عدم استعمال کے بھی مرتکب ہوتے ہیں درحقیقت جب کبھی ناواقفیت۔ کاہلی یا سہو سے منفی خیالات ہمارے دماغ میں جاگزیں ہو جائیں تو ہم کو اُن کی تلافی تعمیری خیالات کے ذریعہ کرنا چاہیئے۔ مگر اس میں ہم قاصر رہتے ہیں۔ اور اُن لامحدود قوتوں کا استعمال نہیں کرتے جنکے بدولت یہ مٹی کا تودہ فرشتہ اور دیوتا بن سکتا ہے۔

استعمال سے کوئی قوت یا پٹھا گھس کر بیکار نہیں ہوسکتا بلکہ عدم استعمال اُن کے زوال و زیان کا باعث ہوتا ہے۔

بقا کی خواہش انسان کے دل میں ہمیشہ سے مضمر ہے مگر اس کے حصول کے لئے قوت ارادی کو اسقدر زوردار بنانا لازمی ہے کہ وہ ہر آفت پر غالب آسکے۔ بیماری کا خوف۔ بڑھاپا اور موت کا خیال حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔ اور ان کو اپنے پاس تک آنے نہ دیا جائے۔ تمام جسمانی فرایض و عمل پر قوت ارادی کی حکومت قایم کردی جائے۔ تندرستی کا پورا خیال کیا جائے۔ تندرستی ہی کی بات چیت کی جائے اور تندرستی ہی کے مطابق زندگی بسر کیجائے۔ اس قسم کے گمراہ کرنے والے اقوال کہ "ہنسی کیسا تھ یاں رونا ہے مثل قلقل مینا" "کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا" بگڑے ہوئے دماغ کی پیداوار ہیں۔ یہ فلسفہ صریحًا غلط۔ اور سراسر بیجا ہے۔ ہنسو اور خوب ہنسو۔ دن رات ہنسو جسقدر زیادہ ہنسو گے اُسی قدر دنیا تمہارے ساتھ جوابی قہقہہ لگانے میں سرگرم ہوگی۔ یہی زندگی اور زندہ دلی کی صحیح تعلیم ہے۔ قوتِ ارادی ایک بارود کی سی طاقت ہے۔ اس سے مسلح ہوکر تمام مخالف طاقتوں کو شکست دینے کا مصمّم ارادہ کرلیا جائے۔ یاد رہے کہ قوت ارادی ایک بارآور شاخ اور ترقی اس کا ثمر ہے۔ اگر ارادہ مصمّم ہے تو آپ ترقی کی گاڑی کو بالاتر اور زیر تر راستوں میں آگے آگے بڑھاتے چلے جائیں گے۔ بہرحال صحت و درازیٔ عمر کے لئے قوت ارادی اور قوت عصبی کی ترقی لازمی ہے جس کو معمولی آدمی بھی مناسب طریقوں سے حاصل کرسکتا ہے۔

جذباتِ آرزو

از حضرت آرزو لکھنوی

بھرم کو ٹھیس لگنے کا نہ دھچکا آجتک اُٹھا
جہاں ٹپ سے گرا آنسو کلیجا بھی دھڑک اُٹھا

یہ دو آنکھوں کا لڑ جانا بھی چاہت کا ڈھنڈھورا ہے
بھرا آکر کٹورے سے کٹورا اور کھنک اُٹھا

اُدھر نکلی بگولہ بن کے لمبی سانس اک منہ سے
اِدھر بجھتا ہوا چھاتی کا انگارا دہک اُٹھا

نہ کھلنے پائے جی کا بھید چاہت کا بھرم یہ ہے
دھواں بھی تو سلگنے کا نہ میرے آج تک اُٹھا

ذرا وہ ہنس دیئے اور سوکھے دھانوں پڑ گیا پانی
جو تھا برسوں کا سوکھا کھیت پل بھر میں لہک اُٹھا

یہ پانی آگ ہے یا آگ پانی ہو کے بہتی ہے
ذرا آنسو رُکے آنکھوں سے اور پھندا بھڑک اُٹھا

مجھے چپ دیکھ کر یوں ہنس کے ٹھنڈی سانس لی اُس نے
گلے سے کستی پھانسی کا جما پھندا سرک اُٹھا

بُرے بھی اچھے بن جاتے ہیں جب ہو میل جول اچھا
بسا جو آکے پھولوں میں وہ کانٹا بھی مہک اُٹھا

کلائی کی لچک میں بھی چھپی تھی دھار لوہے کی
کلیجا تو چھری چلنے سے پہلے ہی پھڑک اُٹھا

نہ جانے کونسا متوالا پن تھا اس پلانے میں
گلے سے گھونٹ اُترنے بھی نہ پایا اور میں چہک اُٹھا

سمجھ والے سمجھ ہوتے نہ اُلجھیں بے سمجھ بن کر
بڑی ہے آرزو تو منہ میں جو آیا وہ بک اُٹھا

جذباتِ بسمل

(جناب بسمل الہ آبادی)

کہتے ہیں انجمن میں وہ کتنا کرشمہ ساز ہوں
حُسن جو ہوں تو ناز ہوں عشق ہوں تو نیاز ہوں

نور کے ساتھ ناز ہوں سوز کیساتھ ساز ہوں
جو نہ سمجھ میں آسکے میں وہ عجیب راز ہوں

راہِ طلب میں کیا بنوں اُس کا حقیقت آشنا
روزِ ازل سے آج تک محوِ رہِ مجاز ہوں

میری خودی خودی نہیں ہیں یہ بیخودی کا رنگ
کیا ہوں حقیقت آشنا مستِ مئے مجاز ہوں

دیر و حرم میں رات دن گونجتی ہو صدائے حق
کیوں نہ سنو کہ میں بھی تو بسمل پاک باز ہوں

فراق

از مولوی محمد یحییٰ تنہا بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

حکیم ثناء اللہ خاں نام، فراق تخلص تھا۔ ہدایت اللہ خاں ہدایت کے بھتیجے تھے۔ لودہی پٹھان تھے اور ان کے جد امجد ایک سیدانی صحیح النسب کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ فنِ شاعری میں میر درد اور ہدایت سے تلمذ رکھتے تھے اور بعض غزلوں میں مرزا سودا سے بھی اصلاح لی تھی۔ فنِ طب میں کافی شہرت رکھتے تھے۔ مجموعۂ نغز میں آپ کے عادات و اخلاق کے متعلق حسب ذیل الفاظ مرقوم ہیں:-

"جوانے فتوت شعار، مروت شعار، مودت گزیں، محبت آئیں، سراسر حیا، سر بسر وفا، یکسر مہربانی جملہ قدر دانی، شیریں زباں، ملاحت بیاں، فصاحت قرین، بلاغت آگیں، معنیٔ ورع و تقویٰ، مضمون پارسائی و اتقا، جادو طراز، سحر پرداز، صاحب انداز شریف، مالکِ طرزِ لطیف، دوست یکرنگ، سراپا دانش و فرہنگ، حسیم محبت راجاں حکیم ثناء اللہ خاں سلمہ الرحمٰن۔"

قیاس سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ اندازاً ۱۱۷۴ھ میں پیدا ہوئے اور تقریباً ۱۲۴۶ھ میں فوت ہوئے اور بہتّر سال کی عمر پائی۔ آپ میر درد کے شاگرد اور مرید تھے۔ درد نے ۱۱۹۹ھ میں وفات پائی ہے اس لئے اُس وقت آپکی عمر کم از کم پچیس سال ہوگی۔ حکیم قدرت اللہ قاسم آپکو جوان لکھتے ہیں اور ۱۲۲۱ھ میں آپکی عمر تقریباً سینتالیس سال ہوتی ہے۔ اُدھر گلشن بیخار کی تصنیف کے وقت آپ وفات پا چکے تھے جسکو ۱۲۵۰ھ کے قریب شیفتہ نے لکھا ہے۔ اس لئے ہمارا قیاس غلط ہو یا صحیح حکیم فراق کی زندگی کا زمانہ یقیناً یہی ہے خواہ دو چار سال کی اِدھر اُدھر کمی بیشی ہو۔ جب تذکرہ نویس ان اُمور کی نسبت خاموشی اختیار کریں تو ہم مجبور ہیں کہ اپنے قیاس سے کام لیں اور اپنے ناظرین کے سامنے کم از کم اُس زمانہ کا ایک خاکہ پیش کر دیں جب کہ ہمارا ہیرو اپنی حیاتِ مُستعار کے دن گذار رہا تھا۔

جب سید انشا وارد دہلی ہوئے اور مرزا عظیم بیگ سے اُن کے معرکے ہوئے تو دہلی کے اُن چند شعراء میں جو عظیم کے ہمچشم تھے آپ بھی شامل تھے۔ غنیمت ہے کہ آخر کار میر مشاعرہ نے آپس میں صلح کرا دی ورنہ سید انشا کی خدا جانے کیا گت بنتی۔ کیونکہ بقا نے میر صاحب کے متعلق جو لکھا ہے کچھ تعجب نہیں کہ انشا کے بارہ میں صحیح ہو جاتا۔

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر۔ اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

لکھنؤ نہ باشد جہاں انشاء کو اپنی طرّاری اور براتی سے یہ موقع مل گیا کہ غریب مصحفی کو پریشان اور بے آبرو کر دیا۔

کلام پر تبصرہ آپکو حکیم قدرت اللہ قاسم نے صاحبِ اندازِ شریف اور مالکِ طرزِ لطیف لکھا ہے۔ اگر اُنکی یہ رائے آپ کے اخلاق اور پاسِ وضع کے متعلق ہے تو ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور اگر حکیم صاحب مرحوم کا مطلب یہ ہے کہ وہ شاعری میں طرزِ خاص کے مالک تھے تو ہم کو اُن سے اختلاف ہے۔ ہم ہرگز آپ کے اشعار سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ آپ صاحبِ طرز ہیں کیونکہ آپ کا اندازِ بیان وہی ہے جو آپ کے ہمعصر شعراء کا ہے۔ آپ میں کوئی وجہِ امتیاز نہیں پائی جاتی۔ یہ صحیح ہے کہ ہم کو آپ کا دیوان دستیاب نہیں ہوا لیکن قاسم نے دوسو بہتّر (۲۷۲) اشعار اپنے تذکرہ میں انتخاب کے بعد تحریر کئے ہیں۔ اُن سے اِس امر پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ آپ کس درجہ کے شاعر تھے۔ ہماری رائے میں آپ دوسرے درجہ کے شعراء میں شمار کئے جا سکتے ہیں اور اِس درجہ میں بھی آپ کو کوئی ممتاز جگہ نہیں دی جا سکتی۔ البتہ آپ کے بیان میں ایک بانکپن ہے جو قابلِ تعریف ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ آپ کے کلام میں سلاست اور روانی ضرور پائی جاتی ہے اور بعض اشعار بہت خوب ہیں۔ شیفتہ نے آپ کے کلام کی نسبت یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "فکرش شستہ و صاف، طبعش خالی از اعوجاج و اعتساف"۔ آپ کے بعض اشعار سے تلاشِ مضمون کا بھی پتا چلتا ہے لیکن آپ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جب شاعری کا دور دورہ تھا اور کاملینِ فن موجود تھے۔ اس لئے آپ بڑے درختوں کے سایہ میں زیادہ نشوونما نہ پا سکے اور آپ کی شہرت کا ستارہ آسمانِ شاعری پر آفتاب و ماہتاب کی روشنی میں جلوہ گر نہ ہو سکا۔

بعض فارسی تراکیب آپ نے خوب استعمال کی ہیں۔ مثلاً:-

صنعت گرِ قضا، دستِ خیال، واشد، منزل بہ منزل، حضورِ شمع، کابوسِ خیال، ہمہ تن چشم، طائرِ رنگ پریدہ، دوشِ ہوا، بارنگاہ، دلِ آہن وغیرہ وغیرہ۔

بعض محاورات بھی خوب باندھے ہیں۔ مثلاً:-

رہے گی پردۂ مینا میں کب تک دخترِ رز تو — مثل مشہور ہے جب ناچنے نکلی تو کیا گھونگٹ

نہ کیونکر سانپ لوٹے اپنی چھاتی پر کہ وہ گل رو — رکھے ہے ہار کے پھولوں کو ساری رات چھاتی پہ

دل کے پرزے ہی کترتا ہے ہر اک بات میں تو — کیسی قینچی کی طرح تیری زباں چلتی ہے

تشبیہات بھی ملاحظہ ہوں :-

اِدھر زلفیں بناتے ہو اُدھر دشنام دیتے ہو
بھلا صاحب! یہی ہے کیا نمازِ شام کی تسبیح

مت مُنھ لگا رقیب سیہ فام کو تو اب
کچھ بھی بھلا ہے ربط کہ باہم ہوں زاغ و گل

رعایتِ لفظی کی بھی مثالیں لیجئے :-

ہزاروں گل کھلے اس باغ میں اور سیکڑوں کلیاں
رکھلا اک دم نہ دل اپنا گئیں جی سے نہ بکلیاں

آنے کو نیم راضی ہوا تھا وہ رشکِ گل
پاؤں کو جو ہیں ہات لگایا مچل گیا

کیا جانے کدھر کشتی لگی لختِ جگر کی
دریائے سرشک اپنے کا ساحل نہیں معلوم

انتفاعِ عشق بے تابی ہے اور بے طاقتی
مزرعِ الفت کا دیکھا ہم نے حاصل اضطراب

سبزۂ خط نے کیا دونا ترا اظہارِ حسن
خط ترا کشّاف ہے تفسیرِ قرآں کی طرح

آرام دل جلوں کو محبت کے ہے کہاں
شاداب پھلجھڑی ہے نہ شاخِ انار سبز

عکسِ عارض نہیں دُر ہائے بناگوش کے بیچ
متصل لگ رہی ہے آبِ گہر سے آتش

مقامی رنگ کی جھلک بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہے :-

اس طرف برسے ہے ساون اُسطرف چشم پُر آب
یوں بسر کرتے ہیں تجھ بن سیمبر برسات میں

دوا یہ چشمِ تر کا دیکھ زاہد خشک ہنستا ہے
اگر تنہا ملا مجکو یہ پنجابی ہے اور میں ہوں

بعض جگہ تعقید بھی پائی گئی۔ جب انتخاب میں یہ شعر موجود ہے تو ممکن ہے کہ آپ کے دیوان میں اور بھی مثالیں ہوں۔

مرا دل لے لیا پھر کیوں مجھے بوسہ نہیں دیتی
ادھر لاؤ نہیں جھوٹی میں اس تکرار سے واقف

دوسرے مصرع کو نثر میں یوں ادا کریں گے۔ کہ" اِدھر لاؤ میں اس جھوٹی تکرار سے واقف نہیں"۔ اس قسم کی تعقید یقیناً عیوبِ کلام میں داخل ہے۔ متروکات کا ذکر ہی کیا، اُس عہد کے جملہ شعراء کا کلام ان سے پُر ہے۔ تاہم ذیل میں چند مثالیں لکھی جاتی ہیں :-

اونے بجائے اُس نے، کبھو بجائے کبھی، یاد کر بجائے یاد کرکے، ماٹی بجائے مٹی ع :-
جو اشک مُنھ چڑھا سو وہ ماٹی میں مل گیا۔ مَلا کیا بجائے مَلا ع :- صندل مَلا کیا نہ کرو دردِ سر کے وقت
بھلا صاحب بالکل متروک ہے۔ نت بجائے ہمیشہ۔ طَرَف بفتح طا و جزم را و سکونِ فا بجائے طَرْف ع :- خود بخود دیکھ دل کھچا جاتا ہے ویرانے کی طرف۔ گھور رہنا بجائے دیکھ لینا۔
تجھ بن بجائے تیرے بغیر۔ بہوت بجائے بہت ع :- کچھ آپکو تو بہوت خوش آتی ہی چاندنی وغیرہ وغیرہ۔

رکیک اشعار سے آپ کا کلام بھی پاک وصاف نہیں۔ فرماتے ہیں:-

تم گالیاں دو مجکو تو میں چٹکیاں نہ لوں　پیارے کسو کا ہاتھ کسو کی زباں چلے
دامن تلک گیا تھا کٹ اس کے یہ دستِ وہم　اللہ رے نازکی وہیں چولی مسک گئی
چٹکی اور چھیڑ یہانتک رہی بس کیا کہیئے　رات اُس شوخ ستمگار نے سونے نہ دیا
بوسہ جب مانگوں ہوں پھر پھر کے یہی کہتا ہے　دور ہو مجکو یہ آتی نہیں تکرار پسند
مرا سینہ جواب یکدست گل مہندی کا تختہ ہے　یہ کس پائے نگاریں کی لگی ہے لات چھاتی پر
برا کرتے ہو آئینہ کو اپنی چھب دکھلاتے ہو　یہ نامحرم لگا بیٹھے گا پیارے ہاتھ چھاتی پر
وقت بوسے کے شکر لب ہی دشنام کی چھیڑ　خالی بھاتی نہیں گُپ چُپ کی مٹھائی مجکو

اب آپ کے اشعار آبدار ملاحظہ ہوں:-

متاع دل فراق ارزاں ہے یوں بازارِ خوباں میں　کہ جیسے مال بکتا ہو کسو مفلس سپاہی کا
یہاں تلک ہوں سُبک رو رہِ عدم میں فراق　قدم جو رکھوں تو نقش قدم نہیں ملتا
ہم کو بت خانہ تمہیں کعبہ مُبارک ہو شیخ!　ہم اُدھر جائیں گے اور آپ اِدھر جائیگا
گلزار کہاں کے یہ چمن زار کدھر کا　دیکھوں ہوں تماشا میں گل رخسم جگر کا
ہر ذرہ میں جلوہ ہے تری جلوہ گری کا　ہر شیشے میں یاں رنگ جھلکتا ہے پری کا
صاف دل کو کیا اور داغِ جگر کو دھویا　کام کیا کیا نہ مرے دیدۂ تر سے نکلا
بعد مرنے کے بھی اک گردش رہی ہکو مدام　مشتِ خاک اپنی رہی تھی کچھ سو پیمانہ بنا
اُنگلیاں گھس گئیں یاں ہاتوں کی ملتے ملتے　لیکن افسوس نوشتہ نہ مٹا قسمت کا
یہ غم ہے ساغر دینا سبھے کہ میرے بعد　ذرا بھی تم کو کوئی منہ نہیں لگانے کا
فراق اپنا ارادہ قصر دل کے ہے بنانیکا　محل کی فکر ہے ہم کو نہ غم دیوان خانے کا
نہ بیگانہ پھرا وہاں سے نہ کوئی آشنا آیا　عدم کے جانے والوں کو دلا! اور پیش کیا آیا
بارے فرمایئے میں تم سے یہ پوچھوں ہوں فراق　آپ اب آئے کہاں سے ہیں کدھر جائیگا؟
گالیاں ہیں کہ پھول جھڑتے ہیں　ذکر یہ مہربان ہے کس کا؟
کیف سے آنکھوں کی تری چور میخانہ ہوا　جام کیا ٹوٹے کہ شیشہ دیکھ مستانہ ہوا
چین دن کو نہ رات کو ہے قرار　اس دل بے قرار نے مارا
دل تھامتا کہ چشم پہ رکھتا نگاہ میں　ساغر کو دیکھتا کہیں شیشہ سنبھالتا

خبر دیتا تھا کس کے وصل سے شوقِ ہم آغوشی
کہ میرا رات کچھ خود بخود بازو پھڑکتا تھا

عش عش کیا بہت ہی صنعت گر قضا نے
نقشے کو تیرے جس دم رشکِ بہار کھینچا

نظروں ہی میں دل اُڑا گئے تھے
پر ہم نے بہت شتاب دیکھا

گر دی ہے خدا نے تجکو نعمت
اوروں کو بھی نان و آب دے کہا

فکر میں تعمیر کے مُنعم نہ مر تو رات دن
گھر کسو کے دل میں کر یا عاقبت خانہ بنا

کسی سے تم کو لگ چلنا کسی سے یار ہو جانا
ستم ہے یہ کہ ہم چھیڑیں تو پھر بیزار ہو جانا

فراق کرتا ہے اشکباری لبوں پر اُسکے ہے آہ جاری
بیاری جانے ہے بیقراری کوئی یہ کہدے کہ یار آیا

کن سحر سے کس فن سے کس پیچ سے کس ڈھب سے
سچ کہیو فراق اُس کو کیونکر تو منا لایا

حسرت ذرا بھی دل سے نہ نکلی ہزار حیف
نکلا اِدھر وہ گھر سے اُدھر جی نکل گیا

دل رہا طاقت رہی صبر و توانائی رہی
کارخانہ جابجا منزل بہ منزل رہ گیا

دیتا ہے دن کو چین نہ شب کو قرار آہ!
کیا جانئے کرے گا دل بے قرار کیا

پیری میں اُٹھا پردۂ غفلت کو تو دل سے
رکھے ہے مسافر کو ضرور وقتِ سحر خواب

دل فراق اُسکو نہ دیتا تھا بن آگے کیا کہیں
بات گر کہیئے بھلی اُس سے بُرا مانے ہیں آپ

یارب یہ کس کے ہات سے شیشہ ہوا ہی چور
ابتک شکستِ دل کی نہیں کچھ خبر درست

کیا ہے نالۂ بلبل نے بے دماغ مجھے
مرے مزار پہ کیوں کی یہ گلفشانی آج

نالہ کیا جو ضبط تو آنسو ٹپک پڑے
کس کس کی آہ لیجے خبر یک شدہ و شد

اے چشم نہ گریہ اس قدر کر
میری بھی طرف تو ٹک نظر کر

ہماری طرح تجکو بھی سدا بے چین رکھے گا
کرے گا کیا مرے دل کو تو اے آرام جاں لیکر

جفا کے پردے میں اک گونہ پیار ہے آخر
برا بھلا ہے پھر اپنا وہ یار ہے آخر

سمجھے تھے دامِ زلفِ سیہ ہے بلائے جاں
پر کیا کریں کہ لے گئی تقدیر کھینچ کر

آرام ہے شب کو نہ مجھے چین ہے دن کو
یارب نہ ہو الفت کا گرفتار کوئی شخص

روشن دلوں کا دونوں جہاں سے ہے جی بجھا
پابندِ جامہ ہے نہ اسیرِ کفن چراغ

گریاں ادھر یہ شمع ساں خنداں اُدھر شگفتہ گل
داغِ دل و زخمِ جگر اک اِس طرف اک اُس طرف

چراغ لاؤ نہ گل چڑھاؤ ہماری تربت پہ آپ ہی آؤ
کہ تم ہی گل ہو تمہیں چمن ہو تمہیں ہو شمعِ مزارِ عاشق

کھویا گیا ہے دل کسی بلبل کا ظاہرا
ڈھونڈے ہے اپنے ہاتھ میں لیکر چراغِ گل

فراقِ ناتواں کو کوچۂ دلدار تک لے چل
بٹھا کر دوش پر اُسکو صبا گلزار تک لے چل

دل کو میں ہر چند سمجھایا سمجھتا ہی نہیں
آپڑا ہے مجکو یارو سخت دیوانے سے کام

خانہ بخانہ دربدر و کو بہ کو پھرے
ہاتوں سے تیرے اے دلِ خانہ خراب ہم

میں رکھ کے ہاتھ جو سینے پر اپنے دیکھوں ہوں
بجائے دل مجھے ہوتا ہے خار سا معلوم

خوش آتی ہیں پاؤں کی ترے ٹھوکریں ظالم
سر کو کبھی قدموں سے اُٹھانے کے نہیں ہم

آنا یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں
بھولے سے اُس نے یاد کیا ہو عجب نہیں

آنکھ اُس شوخِ ستمگر سے لڑا بیٹھے ہیں
بس چلے یا نہ چلے جی تو چلا بیٹھے ہیں

ایک دن بھی نہ کبھو آن کے پوچھا احوال
آپ عاشق کی بس ایسی ہی خبر رکھتے ہیں

نہ کھانا ہے نہ سونا ہے پڑا راتوں کو رونا ہے
بھلا یہ بھی ہے شکل زیست پر ناچار جیتے ہیں

اس دل کے لبھانے کے اسلوب سمجھتے ہیں
باتوں کو تری پیارے ہم خوب سمجھتے ہیں

لیکر نقاب منہ پر دیکھے ہے چوری چوری
عینِ حجاب میں بھی کیا بے حجابیاں ہیں

ہرگز فراق اُسکی تقصیر کچھ نہیں ہے
اس دل کے چاہنے کی ساری خرابیاں ہیں

دیکھا جو غور سے تو بشر ہی بھی اور نہیں
جوں عکسِ شخص پیشِ نظر ہی بھی اور نہیں

شیشہ سے بھی نازک ہی اسے مت ٹھکو
دل ہی کمبخت یہ پتھر نہیں فولاد نہیں

طپش ہے درد ہے زاری ہے بیتابی ہے اور میں ہوں
شکستِ رنگ ہے وحشت ہے بیخوابی ہے اور میں ہوں

جن کا دھڑکا تھا مرے جی میں فراق
ہجر کی راتیں وہی پھر آئیاں

حالِ دل سب تمہیں سنا دیں گے
ابھی آنے تو دو بحال ہمیں

یارانِ عدم کو کوئی کہدے کہ سدھاریں
آہستہ چلے آتے ہیں ہم کو نہ پکاریں

ہیں ترے پاؤں پڑوں زنجیر تو پاؤں نہ پڑ
جانے دے لیجائے یہ وحشت جدھر سر کے تئیں

اظہار کرکے اُلفت اُس غنچہ لب کو کھویا
کمبخت کیوں ہوئی یہ میری زبان دشمن

تکلیف کیوں کرے ہی چاکِ جگر یہ ناصح!
میں ہات کاٹ ڈالوں تجھ سے اگر رفو ہو

اُس مہ جبیں کے روبرو آئینہ تو نہ ہو
ہم صاف منھ پہ کہتے ہیں بے آبرو نہ ہو

رہنے دے کوئی دم تو ہمیں کوئے یار میں
مت چھیڑ لے صبا مرے مشتِ غبار کو

بشر تو کیا دلِ آہن کو آگے موم کرتی تھی
خدا جانے ہوا کیا ان دنوں آہِ سحر تجھکو

مجکو دیکھا جو اُن نے بھر کے نگاہ
نکلی بے اختیار دل سے آہ

رات دن یہ رفیق رہتا ہے ... اے میں تیرے خیال کے صدقے
یہی رہ رہ کے اب مجکو فراق افسوس آتا ہی ... کہ کس بے رحم پر عاشق ہوا یہ کیا کیا تو نے
دردِ دل ہوتا ہی پیہم دیکھیئے کیسی بنے ... جی رہے یا جائے ہمدم دیکھیئے کیسی بنے
کہنا اگر ہمارا ایسا بُرا لگے ہے ... کاہی کو کوئی چھیڑے کیوں بولے کوئی ہم سے
ہماری آہ سے پتھر بھی آگے موم ہوتا تھا ... خدا جانے ہوئی کیا اِن دِنوں تاثیر آتش کی
فصلِ گل آئی نہیں خانۂ زنجیر کے بیچ ... اپنے دیوانے کو کہدو ابھی آرام کرے

مسرّت

از سیّد اختر عرفانی صاحب بی۔اے

خندۂ گل بھی ہے اک واہمۂ موجِ خیال ... جس کے پردہ میں ہے تخریب کی صورت پنہاں
مہر و مہ روشن و خنداں نظر آتے ہیں مگر ... تابشِ سوزشِ پیہم کے ہیں آثار وہاں
لطف آگین و بہار آفریں بلبل کی نوا ... اہل دل کے لئے ہے شعلہ زنی کا ساماں
آب جو کی مترنم روش کیف آگیں ... قطرہ قطرہ میں ہے بیتابیٔ سیماب رواں
قلب مسرور کی رخشندگی تا حدِ کمال ... چند اشکوں کی حرارت میں ہے خونابہ فشاں
جوشش تابندگیٔ صبح درخشان و جمیل ... اک ہے سحر نگہ لیلئے شب کا عنواں
ہے غرض گریۂ پیہم پہ مدارِ عالم ... ہے گلوں کے جگرِ چاک پہ شبنم گریاں

اضطرابِ دلِ ناداں کو کھونے کے لئے
ہنس دیئے دو گھڑی تا زندگی رونے کے لئے

وطن میرے لئے

از حضرت احسان بن دانش

ہمنشیں مجھکو سکونِ مستقل حاصل کہاں
جانکنی سے بڑھ کے ہے یادِ وطن میرے لئے

چشمِ نرگس کو تحیّر ہے لبِ گل پر سکوں
مسکرا کر رہ گئی صبحِ چمن میرے لئے

ہائے یہ بیمار راتیں ہائے یہ مغموم دن
خلد سے بہتر تھا زندانِ وطن میرے لئے

نیم کی ٹھنڈی ہوا، تاروں کی ضَو، حسنِ بہار
کیا نہ تھا گردوں سے تا خاکِ چمن میرے لئے

ہائے وہ واحد[1] کی باتیں ہائے وہ اختر[2] کا خلق
مل گئے مٹی میں یارانِ وطن میرے لئے

ہائے وہ تاروں کی چھاؤں، ہائے وہ دورِ شراب
ہو گئی خوابِ انجمن کی انجمن میرے لئے

چھن گیا پہلو سے ایک دیوانۂ رنگیں مزاج
مدتوں خوں روئیگی شامِ وطن میرے لئے

خاک پر آنسو تھے میرے چرخ پر رنگِ شفق
خشک ہیں اب تک لبِ اہلِ چمن میرے لئے

شام کو پنگھٹ پہ اللہ حسن کی رعنائیاں
آج تک بھی ہیں چراغِ روح و تن میرے لئے

ہائے وہ چھجّوں کے سایوں میں کسی کا انتظار
ہائے وہ کلیوں کا سادہ بانکپن میرے لئے

سردیوں کی چاندنی راتوں میں سونی کھڑکیاں
اور پھر بیتاب اک نازک بدن میرے لئے

کیا خبر اس پیکرِ عفّت کو احسان کیا خبر
ننگِ ہستی ہے کوئی ننگِ وطن میرے لئے

[1] و [2] میرے عزیز ہموطن تھے۔

دریا میں ہے چاند سے تلاطم سا کچھ
غلطاں ہے شعاعِ عکسِ انجم سا کچھ
اس وقت وفا کے آنسوؤں کی سوگند
ہے ایک نگاہ اور تبسم سا کچھ

(جوش ملیح آبادی)

سائنس کی بربریت

(از مولوی محمد عبد الرزاق صاحب راشد ایچ ۔ سی ۔ ایس مددگار معتمد فینانس حیدرآباد دکن)

سائنس کی ترقی میں اہل مغرب کی مساعی جمیلہ تمام دنیا کے شکر گذاری کا باعث ہیں کیونکہ اس سے خلق اللہ کی راحت و آسائش میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ ریل ۔ موٹر ۔ اسٹیمر ۔ سائکل ۔ ٹراموے ۔ طیارے ۔ وائرلیس ۔ ایسے متعدد نو بنو اختراعات نے وقت اور فاصلہ کا سوال اُٹھا دیا ہے ۔ برقی روشنی ۔ برقی پنکھے ۔ لاسلکی شعاع ۔ ایسی ایجادات سے لوگ فائدہ اُٹھا رہے ہیں لیکن آرام و راحت کے عوض اب سائنس انسانی ہلاکت کا آلہ بھی بن رہا ہے ۔ اخباربین صحاب کو معلوم ہے کہ حبش و اسپین میں طیاروں کے ذریعہ کسقدر بم برسائے گئے ۔ جنگ حبش میں زہریلی ہواؤں سے کیسی تباہیاں پھیلائیں گئیں اسپر مستزاد یہ کہ دم دم گولیوں سے بھی عار باقی نہیں رہا ۔ اب جنگ میں جدید تہذیب کے حامیوں میں کوئی بھی ان سفاکانہ اور بیرحمانہ افعال کا تدارک نہیں کر سکتا ۔ حالانکہ جدید تہذیب کا دعویٰ یہ ہے کہ سائنس راحتِ خلق کے واسطے کارفرما ہے ۔ جرمنی نے جنگ عظیم میں جب اس طرح کی سفیہانہ حرکتیں کی تھیں اسوقت تمام دنیا خصوصاً یوروپ میں ایک تہلکہ مچ گیا تھا ۔ جنگ عظیم کے اختتام پر صلح ہوئی مدبرین یورپ نے بین الاقوامی کوششوں سے نہ صرف آئندہ لڑائیوں کا انسداد کرنا چاہا بلکہ جنگ عظیم کی ذمہ دار ہستیوں سے مواخذہ کرنے کی ٹھان لی چنانچہ قیصر جرمنی کو بالاتفاق جنگ کا محرک اور امن شکن قرار دیکر اس کے خلاف مقدمہ چلانے کی نسبت برطانیہ کے پریس میں کئی ماہ تک مسلسل ہنگامہ آرائی ہوئی ۔ بالآخر ہالینڈ میں قیصر کو نظر بند کیا گیا اور اسکی نقل و حرکت کو محدود کر کے اسے جرمنی جانے کی ممانعت کر دیگئی ۔ ان بندشوں پر غریب قیصر کے دل سے پوچھئے کہ اس کا کیا حال ہے ۔ کوئی تین سال پہلے شاہ اسپین جلاوطن کئے گئے ۔ زار روس کی مطلق العنانی کا آج نام نشان تک نہیں ۔ زار کا سارا خاندان نذر اجل ہو گیا ہے ۔ یہ سب تاریخی واقعات ہیں ۔ افسوس ہے کہ مسولینی جیسا مدبر ان شواہد کو پیش نظر نہیں رکھتا ۔ اسے خبر نہیں کہ خود اس کا کیا حشر ہو گا ۔ ؟ تقدیر کا پانسہ کسی وقت پلٹ سکتا ہے ۔ کاش وہ زار سے واقف ہوتا ۔ ؎

ہر عمل کے لئے ہے ردِّ عمل دہر میں نیش کا جواب ہے نیش
شیر سے آسماں لیتا ہے انتقامِ غزال و اشتر و میش

سرگذشتِ جہاں کا سرِّ خفی — کہہ گیا ہے کوئی نکو اندیش
شمع پروانہ رابسوخت ولے — زود بریاں شود بروغن خویش

ڈکٹیٹر سولینی اطالیہ کا سب سے بڑا محبِّ وطن سمجھا جاتا ہے چنانچہ ہمارے ایک متفکّر شاعر نے اس سے یوں خطاب کیا ہے۔ ؎

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے جو ذوقِ انقلاب — ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے جو ملّت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی — ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب
رومۃ الکبرائے دگرگوں ہوگیا تیرا ضمیر — ایں کہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب
چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ — نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب
یہ محبّت کی حرارت، یہ تمنّا، یہ نمود — فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے — زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے، کرامت کس کی ہے — وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

لیکن اس وقت سولینی اقوامِ عالم کی نظروں میں ڈکٹیٹرشپ کی خرابیوں کا مجسّم نمونہ بھی ہے۔ اس کی نیت کے نقوش اسکے لوحِ اعمال پر مرتسم ہو رہے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ دنیا کی تاریخ میں اس خودسر شخص کو کسطرح یاد کیا جائے گا۔

بہرکیف جنگِ عظیم کے بعد انسدادِ جنگ کے لئے جمعیت اقوام قایم کی گئی اور تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس منعقد ہوئی کہ کیمیائی ذرائعِ جنگ کا سدِّباب کیا جائے۔ لیکن جذبہ سپہ گری سے متاثر لوگ اسپر کیوں رضامند ہوتے۔ انھیں تو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ وہ بمباری و گیس فشانی کی تائید کرتے ہیں حالانکہ یہ نہایت مہلک اور بعید از انسانیت فعل ہے۔

یہ کسقدر دردناک امر ہے کہ جدید تہذیب کی علمبردار سلطنتیں ان ملکوں کے ساتھ ہلاکتِ انسانی کے کیمیائی ذرائع اختیار کریں جو صاف ہستی میں ان سے پیچھے ہیں اور جنکو سائنس کی ترقی کی ہوا تک نہیں لگی یہ حقیقت میں اس بات کا ثبوت ہیں کہ یورپ کا ضمیر عملاً مردہ ہوگیا ہے۔ جنگِ حبش میں اطالیہ کے طرزِ عمل کو ناپسند کرنے والے بہت اطالیہ کو درحقیقت مجرم سمجھتے ہیں مگر بعض اربابِ سیاست حاضرہ اس طریقہ کو لڑائی جیتنے کا زیادہ اثرانداز اور کم ضرررساں طریقہ سمجھتے ہیں۔ اہلِ اطالیہ کا بھی یہی استدلال ہے کہ عاجلانہ فتح کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہ تھا مگر یہ حجت دوراز کار ہے۔

عہدِ عتیق میں جنگ دست بدست ہوا کرتی تھیں اُسوقت شجاعت کے قوانین کا منضبط کرنا ممکن

تھا اور ان کی پابندی بھی کی جاتی تھی لیکن اب جبکہ سائنس نے یہ ممکن کر دکھایا ہے کہ دور دراز کے فاصلے سے انسانی ہلاکت کا سامان مہیا کیا جائے تو کسی ملک کو اس کے مہلک زد سے بچانے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ اس لئے کیمیائی ذرائع کی جنگ سے قوموں کو محفوظ رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ قانوناً اس کی ممانعت کر دی جائے ایسا نہ کیا گیا تو یورپ اپنے سائنس دانوں کی ایجادات سے خود ہی برباد و تباہ ہو جائے گا۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اسکا آشیانہ

بہرحال اگر رائے عامہ نے اس طرز عمل کو موقوف نہ کیا تو عجب نہیں کہ آئندہ کسی روز باشندگان پیرس۔ لنڈن۔ برلن۔ روما۔ ایک ہی شب میں دم گھٹ کر اپنی جانیں دیدیں۔

مقام افسوس ہے کہ ہمیں آج علم کا ماتم کرنا پڑا ہے کہ جو سائنس خلق خدا کی خدمت کو اپنا شیوہ بنائے ہوئے تھا۔ اب اس کا دہیرہ تہذیب کی بربادی اور ہلاکت بن گیا ہے نظم عالم کی شعریت مٹی میں مل رہی ہے کیونکہ سائنس کی بربریت تمام عالم میں پھیل رہی ہے۔ افسوس۔

فریبِ زندگی

دفترِ عبرت ہے تالیفِ کتابِ زندگی
روز کھلتا ہے نئے عنوان سے بابِ زندگی

نقش بر بحرِ حوادث ہے حبابِ زندگی
دم کا ہے دورِ تغیّر میں شبابِ زندگی

آب باد و خاک و آتش کی اصل تفریق ہے
مجموعہ ہے چار سانسوں کا حسابِ زندگی

حاصلِ ہستی کا اُٹھا جب کبھی دل میں سوال
مل گیا گورِ غریباں سے جوابِ زندگی

کیا الغافل کیش ہی صہبائے عشرت کا خمار
جسکو دیکھو ہے وہ سرمستِ شرابِ زندگی

جامۂ کثرت پہنے لیلےٰ ہوا اتنا لطیف
پردۂ محمل تھا مجنوں کو نقابِ زندگی

وائے ناکامی صلہ ایثارِ اُلفت کیا ملا
خونِ ارماں میں نظر آیا ثوابِ زندگی

ایک طلسم روح فرسا ہے حوادث کا وجود
عارضی ہے چشم خود بیں آب و تابِ زندگی

کیوں سرِ بالیں کوئی آزردہ تقصیر ہے
آج بسمل رنگ لایا ہے حجابِ زندگی

قرض

(از جناب فیاض الدین احمد خاں صاحب فیاض گوالیاری)

ایک انسانِ پریشاں مو پریشاں روزگار — جس کی تیوری سے پریشانی کی شکلیں آشکار
جس کی قبل از وقت پیری ایک روحی انتشار — کچھ دھوئیں کچھ رنگ پر جس کی خوشی کا انحصار
بال کچھ اُلجھی ہوئی داڑھی کے مرہونِ خضاب
کچھ مسرت کوش ٹوٹے پیچواں کے پیچ و تاب
اک طرف گوشہ میں ایک آب و نمک کی ذمہ دار — گود میں اک چاند کا ٹکڑا لئے پروانہ وار
پھونکتی جاتی ہے چولھا کرکے اُس بچے کو پیار — سامنے ہیں اور بھی چھوٹے بڑے باندھے قطار
ان کی قسمت پر کبھی خود کو گھُلا دیتی ہے وہ
دیکھکر اِن کو کبھی سب کچھ بھلا دیتی ہے وہ
چُوڑی ایک اس ہات میں دو چُوڑیاں اُس ہات میں — یوں عرق چہرہ پہ جیسے پھول ہو برسات میں
گورے گورے جسم پر افلاس کے نقش و نگار
ہاتھ سے دھویا ہوا ملبوس بھی پیوند دار!

گھُن لگا کر گھر میں ڈھائے قہر وہ کیڑا ہے قرض — جس کا حملہ ہے فنا کی لہر وہ کیڑا ہے قرض
جس کے کاٹے کو نہ آئے لہر وہ کیڑا ہے قرض — جان لیکر بھی نہ اُترے زہر وہ کیڑا ہے قرض
وہ مرض ہے جس کا نسلوں تک اثر باقی رہے
جس کے ہر کشتہ کا پشتوں تک اثر باقی رہے
سود در سود ایک لعنت ہے دوامی مستقل — جو پھنسا اس جال میں اُسکے قویٰ ہیں مضمحل
قطرہ قطرہ کرکے جونکیں چوستی ہیں خونِ دل — ہو کے رہ جاتا ہے کم مقدور انساں پابہ گل
رفتہ رفتہ ہم کو یہ بیماریاں کھاتی رہیں
جائدادیں فیصدی ننانوے (۹۹) جاتی رہیں

طبقۂ اوسط میں ہے قرض اک بلائے ناگزیر
جن کو پاسِ وضع ہے ایک ادّعائے ناگزیر
ہیں نمود و نام اسیر اسہمائے ناگزیر
سر پہ ہے اہلِ وفا کے یہ جفائے ناگزیر

پیٹ بھرتا ہی نہیں ہے قرض کی کھائے بغیر
سوئیں کیوں چادر سے باہر پاؤں پھیلائے بغیر

مفلسوں کی تھوڑی سی تنخواہیں ہیں چھوٹا روزگار
اک کمانے والا گھر میں بال بچّے بے شمار
مُنھ ہیں جتنے اُتنے لقموں پر نہیں ہے اختیار
ہر مہینہ بیسیوں کو لینا پڑتا ہے اُدھار

سود ادا کر دیں اگر بیوی کا زیور بیچکر
قرض کی پوری نہیں ہوتی رقم گھر بیچکر

کاش سعیِ مشترک سے چند ارباب ہمم
ایک قومی بنک کی بنیاد ڈالیں بیش و کم
قحط زر میں قوم پر ہو سایہ ابرِ کرم
لہلہا اُٹھیں ہماری کھیتیاں جی جائیں ہم

یہ گنہ جائز ہے پابندِ صلوٰۃ و صوم کو
بن پڑے جیسے تباہی سے بچائے قوم کو

غزل

(مسٹر بدری ناتھ شاطر الہ آبادی)

کبھی ہوں بوئے گُلِ تر کبھی صبا ہوں میں
تمہیں ہزار بہانے سے ڈھونڈھتا ہوں میں
یہ ابتدا ہی سے دنیا میں سوچتا ہوں میں
کہاں ہوں۔ کون ہوں۔ کس واسطے ہوں کیا ہوں میں
ہال دعوئی منصور دیکھتا ہوں میں
خدا کی شان وہ خود بول اُٹھا خدا ہوں میں
زمیں پہ لالہ و گل چرخ پر مہ و خورشید
تمہارے دیکھنے والوں کو دیکھتا ہوں میں
کریں نہ صرصر و برق اس کے واسطے تکلیف
خود آج اپنا نشیمن اُجاڑتا ہوں میں
قیودِ منزلِ ہستی سے واسطہ نہ رہا
اب اپنے مرکزِ اصلی کو ڈھونڈھتا ہوں میں
ہجومِ کارِ علائق نے کر دیا بے کار
یہ کیسی بھول بھُلیاں میں کھو گیا ہوں میں
یہ مرگ و زیست کے جھگڑے۔ وہ حسن و عشق کے راز
نظامِ عالمِ ہستی سمجھ رہا ہوں میں

خدا کرے کہ کوئی کارگر ہو اے شاطر
ہزاروں چالیں محبّت میں چل رہا ہوں میں

ہندو اتہاس اور ہندوؤں کا تاریخی ادراک

از ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے صاحب

مغربی ماہروں کی باتیں بے چون وچرا ماننے والے حضرات یہ سوال کریں گے۔ کہ "ہندو اتہاس" کے کیا معنے؟ پرانے زمانے کے اہل ہند تو ادراک تاریخ سے کلیتہً محروم ہی تھے۔ پھر "ہندو اتہاس" کہاں سے آیا؟ اس سوال کا مفصل جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ ہندوستان کے خاص حالات کا پورا لحاظ کر لیا جائے۔

بہر حال یہ بات کہ ہند قدیم کے لوگ ادراک تاریخ میں تہی دست نہ تھے۔ ذیل کی سے بخوبی ظاہر ہے۔

بنگال کے مشہور عالم ڈاکٹر نریندر ناتھ لا۔ ایم۔ اے۔ بیرسٹر کی رائے ہے۔ کہ ویدک زمانہ کے تمام بڑے بڑے آچاریہ اتہاس کے ابھیاس پر زور دیتے ہیں۔ بلکہ رگ وید میں لفظ پران[۱] بار بار آتا ہے جس سے مراد پراچین کال کی داستان ہے۔ علاوہ ازیں منوسنگھتا اور آیترے آرنیک میں کئی پرکار کے اتہاس کا ذکر آیا ہے۔ اور کوٹل چانکیہ اپنے ارتھ شاستر میں راجہ کو تاریخ کے مطالعہ کی تاکید کرتا ہے۔ اب سوچنے کی بات ہے۔ اگر اتہاس نہ تھا۔ تو اس کا مطالعہ کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔

(۲) من جشری۔ ایک بودھ عالم نے ۷۷۰ء کے بعد ایک مختصر تاریخ ہند مرتب کی تھی۔ جس میں ۷۰۰ سنہ قبل مسیح سے لے کر ۷۷۰ء کے تمام بڑے بڑے ہندو سمراٹوں[۲] کا ذکر ہے گویا چودہ[۱۴۰۰] سو سال کے دوران میں جتنے سر کردہ اور عالی ہمت شہنشاہ گذرے ہیں انکا اجمالی حال بیان کیا گیا ہے۔ گیارھویں صدی میں من جشری کا ترجمہ تبتی زبان میں کیا گیا تھا اب تین سال کے قریب ہوئے۔ پٹنہ کے ممتاز فاضل مسٹر کاشی پرشاد جیسوال بیرسٹر نے ایک بودھ عالم کی مدد سے اس کا انگریزی ترجمہ[۳] شائع کیا ہے۔

---

[۱] "اسٹیڈیز ان انڈین ہسٹری اینڈ کلچر" ص ۱۳۸ سے ص ۱۵۰ مطبوعہ ۱۹۲۵ء۔
[۲] "امپیریل ہسٹری آف انڈیا" دو سال ہوئے طبع ہوئی تھی۔

۳۔ گھناڈ سنگھتا جو مہابھارت سے ڈیوڑھی بڑی کتاب ہے۔ پشاچی بھاشا میں۔ سن عیسوی سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے لکھی گئی تھی عرصہ سے یہ لاثانی کتاب ناپید ہے۔ مگر اس کے اقتباسات بعض پرانے گرنتھوں میں پائے جاتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہند قدیم بعید کے تاریخی حالات کا بیش بہا خزانہ غیر ملکی حملہ آوروں کے ہاتھوں[۱] لٹ گیا۔ اگر یہ کتاب ہاتھ آ جائے۔ تو پراچین زمانہ کا معتبر اتہاس مرتب ہو سکتا ہے۔

۴۔ ۸۰۰ء کے لگ بھگ ایک نامی عرب عالم ابو صالح نے مجموعۃ التاریخ[۲] مرتب کی تھی جس میں اس نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق دنیا کی مختصر تاریخ لکھی تھی۔ اسمیں سندھ کی تاریخ پرانے زمانہ سے لے کر عربوں کے حملہ تک مذکور ہے ابو صالح نے سندھ کے پرانے حالات سنسکرت کے ایک پرانے گرنتھ سے اخذ کئے تھے۔ ۱۰۲۶ء میں ابو الحسن علی نے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ سندھ کی پرانی تاریخ جس سے ابو صالح نے معلومات حاصل کئے تھے۔ عرصہ سے ناپید ہے۔

۵۔ راج ترنگنی کا مصنف لکھتا ہے کہ میں نے نیل مت پران کے علاوہ گیارہ اور پرانی مستند کتابوں سے راج ترنگنی کی تالیف میں مدد لی ہے۔ اس نے ان کتابوں کے نام بھی مع ان کے مصنفوں کے دیئے ہیں۔ مگر اب ان میں سے ایک کتاب بھی دستیاب نہیں ہوتی۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گھناڈ سنگھتا۔ سندھ کی تاریخ قدیم اور راج ترنگنی میں مذکور کتابیں کہاں گئیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کا یہ پرانا قاعدہ ہے کہ بڑے بڑے فاتح مفتوح قوم پر اپنا استمراری تسلط بٹھانے کے لئے سب سے پہلے ان کی تہذیب کے نشانات اور ان کی گذشتہ تاریخ کی یاد عوام کے دلوں سے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر ماضی کی شوکت کی یاد محکوم کے دل میں قائم رہے تو نئی حکومت کو قیام ہی نصیب نہ ہو۔ یہ کلیہ صرف ہندوستان ہی کے متعلق نہیں بلکہ یونان[۳] وکارتھیج۔ ایران۔ ہسپانیہ اور چین کی تاریخوں سے بھی صحیح ثابت ہوتا ہے۔ ۷۰۶ء میں کشی راج

---

[۱] وی۔ اے اسمتھ نے ان اقتباسات کا ترجمہ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں شائع کیا تھا جس سے کتاب کے نایاب معلومات کا خاطر خواہ اندازہ ہو سکتا ہے۔ گھناڈ سنگھتا کا پتہ لگانے والے کے لئے پنڈت بھگوت دت سابق سپرنٹنڈنٹ ڈی۔ اے۔ وی کالج سنسکرت لائبریری لاہور نے بھاری انعام کا اعلان کیا تھا۔ مگر پتہ نہ لگ سکا۔

[۲] جرنل بہار اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی مطبوعہ مارچ ۱۹۲۳ء

[۳] نامی ماہر ہٹن وبسٹر اپنی "ان شنٹ ہسٹری" میں لکھتا ہے۔ "جب سن عیسوی سے ڈیڑھ سو برس پہلے رومیوں نے کارتھیج فتح کر کے تباہ کیا۔ تو ہیپاٹیا کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی" اسی زمانہ کے لگ بھگ رومیوں نے یونان فتح کر کے وہاں کے علمی خزانے برباد کر دیئے اور نام نہاد حکومت اختیاری بھی جاتی رہی۔ ایران کی حالت وسطی ایشیا کے ناتراشیدہ قوم کے حملے کے بعد بہت حسرت ناک ہو گئی تھی۔

(Kushan) پرشپاوتی (پشاور) میں قائم ہوا - اور ۹۰ء میں کشی تاج دار نے اپنا ہوشیار مدبّر سردار ونشپر والسرائے ماہور کیا جس کا صدر مقام متھرا تھا - حال کا سارا یو - پی بندھیاچل سے پرلی طرف ممالک متوسّط کے شمالی اضلاع - بہار اور بنگال تک کُشی راج کا ڈنکا بجتا تھا -

ونشپر نے بلا توقف جوڑ توڑ شروع کر دئے - اس نے ذات پات اڑا دی - براہمنوں کی تقلید جُرم ٹھہرائی - کشتری امرا اور روٗسا کو رسوا کیا - اونچی ذات کے ہندو عمّال چُن چُن کر موقوف کئے - گئو کشی سلطنت کے ہر حصّہ میں ہونے لگی - مندر اور پاٹھ شالائیں ڈھا دی گئیں - پُستکالے جلا دئے گئے - غرض سو سال[1] تک ہندوؤں پر سخت ظلم ہوتے رہے - مسلمان بادشاہوں نے بھی اسی قسم کی روش اختیار کی تھی - اور اوّلین مسلم حملہ آوروں کے حملوں کے دوران میں نالندا[2] اور ادونت پوری کے بیش بہا علمی خزانے برباد ہو گئے - غرض پردیسی حملہ آوروں کے حملوں میں ہندوستان کا بہت سا تاریخی مسالہ برباد ہو گیا -

دُنیا

(از جناب طالب چکوالی بی - اے، ایل ایل بی)

حُسن کی کائنات ہے دنیا　　کس طرح بے ثبات ہے دنیا؟
مُردہ دل کو "سرائے فانی" ہے　　زندہ دل کو "حیات" ہے دنیا
خواب ہے یا شباب و کیفِ شراب　　ایک سپنے کی بات ہے دنیا
مٹ کے ملتا ہے لطفِ ہستی کا　　اک اچنبھے کی بات ہے دنیا
بوالہوس اس کے در کا کتّا ہے　　اس کا مذہب ہے ذات ہے دنیا
اس کی دُنیا ہے زن، زمین و زر　　فکر کی شش جہات ہے دنیا
اِس کے ہو کر رہو کہ ترک کرو　　دونوں چالوں سے مات ہے دنیا!

یہ ہے طالب مقام راحت کا
عمرِ ہستی میں رات ہے دُنیا

---

[1] ملاحظہ ہو "ہسٹری آف انڈیا" (جرنل بہار اڑلیسہ ریسرچ سوسائٹی صفحہ ۴۸ - مارچ - جون ۱۹۳۳ء

[2] نالندا واقعہ صوبہ بہار - دنیا کی سب سے پرانی یونیورسٹی - جہاں افغانستان - بلخ - بخارا - ترکستان - تبت - چین - ہند چینی - برہما - سماترا - جاوا اور لنکا کے طلبا آتے تھے اور جن کا شمار دس ہزار تھا - تیسری صدی میں اس کی بنیاد پڑی تھی - ساتویں صدی میں زوال ہو گیا - پھر بھاگل پور کے پاس وکرم شلہ کی یونیورسٹی قایم ہوئی - جو مسلم حملوں کے دوران میں تباہ ہوئی - دونوں جگہ ساٹھ ہزار کے قریب قلمی نسخے تھے - (ج - ا - ر)

جذباتِ فراق

(پروفیسر رگھوپت سہائے فراق ایم۔ اے)

مٹ کے میں نے تجھکو عالم میں نمایاں کر دیا — زندگی کی شمع گل کر کے چراغاں کر دیا

حسن کے جلوؤں کو وقفِ سوزِ پنہاں کر دیا — وصل کی کیفیتوں کو دردِ ہجراں کر دیا

دل کے اجزائے پریشاں مٹ کے ویرانے بسے — میں نے ان ذرّوں کو گم کر کے بیاباں کر دیا

قرب و دوری دے دئیے اہلِ ہوس کے واسطے — عاشقی کو بے نیازِ وصل و ہجراں کر دیا

عاشقی کو الجھنیں درکار تھیں کچھ۔ یہ نہ پوچھ — اب گریباں کر دیا اُن کو کہ داماں کر دیا

کنجِ زنداں کو جنوں نے وسعتیں صحرا کی دیں — ہوش کے صدقے کہ صحرا کو بھی زنداں کر دیا

شوخیوں نے چھیڑ کر حسنِ حیا پرور کو بھی — سر بسر برقِ تبسمہائے پنہاں کر دیا

کون جانے عقدۂ ہستی نگاہِ مست نے — اور مشکل کر دیا یا اور آساں کر دیا

حسن خود افزوں نگاہِ شوق کی حیرانیاں — یوں ہی کیا کم تھیں کہ تو نے اور حیراں کر دیا

جن سے چشمِ مست کچھ خود بھی نہ واقف ہو سکی — ان نگاہوں کو بھی پیوستِ رگِ جاں کر دیا!!

وائے اے دستِ جنوں شائستگئ چاک کو — صرفِ داماں کر دیا وقفِ گریباں کر دیا

عشق کی تھی زندگی بس اک نگاہِ آشنا — اس کو بھی نذرِ تغافل ہائے پنہاں کر دیا

عشق پر وہ ہر طرح کا زور و دعویٰ کیا ہوا — جس نے ہر اک جور کو جورِ پشیماں کر دیا

رنگ و بو والو کھلا تم پر کچھ اس کا درد بھی — جس تبسّم نے گلستاں کو گلستاں کر دیا

عشق کو آیا ہے دینے حسن درسِ نیستی — بارہا شیرازۂ ہستی پریشاں کر دیا

تیرگئ یاس میں گم ہو کے دل نے بھی فراق
دہر کو دودِ چراغِ شامِ ہجراں کر دیا

(۲)

جذبات فراق

اپنے حواس میں شبِ غم کب حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

دورِ فلک کہاں ہے یہ دورِ حیات ہے
حیرت سرائے عشق میں دن ہے نہ رات ہے

جینا جو آ گیا ۔ تو اجل بھی حیات ہے
اور یوں تو عمرِ خضر بھی کیا ۔ بے ثبات ہے

کیوں انتہائے ہوش کو سمجھے ہیں بیخودی
خورشید ہی کی آخری منزل تو رات ہے

گردوں شرارِ برقِ دلِ بے قرار دیکھ
جن سے یہ تری تاروں بھری رات، رات ہے

آخر خیالِ عیش و سکوں چھوڑنا پڑا
ہے دل جو ڈال ڈال تو غم پات پات ہے

ہستی کو جس نے زلزلہ ساماں بنا دیا
وہ دل قرار پائے مقدر کی بات ہے

ٹوٹے فریب بیخودی و ہوش ۔ مرحبا
اب دونوں غفلتوں سے مِرا حیات ہے

یہ موشگافیاں ہیں گراں طبعِ عشق پر
کس کو دماغِ کاوشِ ذات و صفات ہے

عنوان غفلتوں کے ہیں ۔ فرقت ہو یا وصال
بس فرصتِ حیات فراق ایک رات ہے

چچا کی یاد[1]

(از منشی حضرت اقبال ورما سحر ہتگامی)

سحرؔ مشکل سے ملے گا آدمی
فی زمانہ منشی شیو پرشاد سا

واہ قدرت سے ملا تھا کیا مزاج
تھے کئی اوصاف جس میں بر ملا

آپ کے سینہ میں بیشک تھا وہ دل
درد تھا جس میں سراپا قوم کا

ہر ضرورتمند کے امداد کو
ہر طرح تیار رہتے تھے سدا

وہ محبت جس کی کوئی حد نہ تھی
وہ مروّت تھی نہ جس کی انتہا

آپ کی نیکی تھی ہر کس کے لئے
آپ کا جو خُلق تھا وہ عام تھا

وہ بزرگانہ روش تھی جس سے سب
تھے عموماً آپ کو کہتے چچا

یاد سے تازہ رہے گا عمر بھر
موت کا اس وقت ہے جو حادثہ

مٹ گیا تو صفحۂ ہستی سے آہ،
اے نشانِ لطف و اخلاق و سخا!

سنہ ۱۹۳۶ عیسوی

[1] ہمارے دوست نے یہ قطعہ وفات اپنے چچا منشی شیو [illegible] کانپور کی وفات پر لکھا ہے

راہِ نجات

(ایک قصّہ)

از ٹھاکر جیندر بھوشن سنگھ

مادھو کی ماں کب مری، یہ اُس کو نہیں معلوم لیکن اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا کبھی پیٹ بھر کھانے کو آسانی سے نہیں ملا۔ غریبی نے اُس کی سوتیلی ماں کو چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اُس کا لڑکپن اور اُس کی شرارت آمیز شوخیاں نئی ماں کے آتشیں مزاج کو بھڑکانے کے لئے کافی تھیں۔ وہ شہر کی رہنے والی تھی اور ابھی ناز برداری کی مستحق تھی۔ ایسی صورت میں اُس کا چیں بہ جبیں ہونا یا سختی سے پیش آنا قدرتی تھا۔ نہ گھر میں کسی کو مادھو کو ٹھیک وقت پر بلانے کی پرواہ تھی اور نہ اُسے کھیلنے سے فرصت ہی ملتی تھی۔ جب جی میں آتا، کھانا کھانے بیٹھ جاتا۔ کبھی وقت سے دو گھنٹے پہلے اور کبھی چار گھنٹے بعد۔ پہلے آتا تو اکثر جواب ملتا "اسوقت کیا دھرا ہے۔ ابھی ساگ کچّا ہے چلو۔ گھڑی بھر میں آنا۔ مادھو پہلے تو اُٹھتا ہی مشکل سے، لیکن اگر جاتا تو پھر گھنٹے دو گھنٹے تو کیا دن دن بھر غائب رہتا۔ شام کو آتا تو دھمکیوں کی پروا کئے بغیر تھالی لیکر کھانے بیٹھ جاتا اور خوب کھاتا کھانا کم پڑتا تو اتنا شور مچاتا کہ پڑوسی دوڑ آتے، کبھی چوکے میں گھسنے کی دھمکی دیتا۔ کبھی بغیر شور و غل مچائے کسی پڑوسی ہی کے گھر کھالیتا۔ ماں کی نگاہ میں غیر جگہ بلا بلائے کھالینا قابل سرزنش تھا۔ لیکن ضدّی مادھو اس حرکت سے باز نہ آتا تھا۔ دشمن کو تکلیف دینا سکونِ قلب اور تسکینِ دل کا آسان ذریعہ ہوتا ہے۔

بارہ برس کی عمر میں ماں کی پُرزور مخالفت کے باوجود مادھو اسکول بھیجا گیا۔ پڑھنے لکھنے میں تو اُس کا جی بالکل لگتا نہ تھا لیکن ماں کی مخالفت دیکھ کر وہ مدرسے کی چار دیواری میں قید ہونے کے لئے راضی ہوگیا۔ مگر غریبوں کی قسمت میں علم کہاں۔ کبھی کتاب نہ ہونے کی شکایت، کبھی فیس نہ پہونچنے کا خلجان ماسٹروں کی فرمائشات اور گھر کی پریشانیاں علیحدہ۔ پہلے تو مادھو کا باپ کتابیں وغیرہ گاؤں کے لڑکوں سے جو مادھو سے ایک سال آگے تھے مانگ لایا تھا لیکن دوسرے ہی سال کورس کی کتابیں بالکل بدل گئیں مگر جب مادھو نے باپ کے سامنے یہ عذر پیش کیا تو وہ اُسے لڑکے کا بہانہ سمجھا اور پنڈت جی کے پاس جاکر فریاد کی۔ پنڈت جی نے کورس کے تبدیلی کے مقاصد بورڈ کے ممبروں کی پالیسی۔ پبلشران اور مؤلفوں کی ذاتی ضروریات وغیرہ پر ایک مفصل لکچر دیا لیکن باپ نے یہی سمجھا کہ یہ تمام بلائیں "پاس کرائی" نہ پہونچنے

کا نتیجہ تھیں فیس کی شکایت بجا تھی لیکن اس کے نزدیک اس پر زیادہ زور اس لئے دیا جاتا تھا کہ ماسٹر صاحب کے پاس بھٹے روزانہ کے بجائے ہفتہ میں پہونچتے تھے اور اس میں بھی کبھی کبھی ناغہ ہو جاتا تھا۔ چاروناچار مادھو کو گھر بیٹھنا پڑا۔ وہ پھر خوش خوش نظر آنے لگا۔ ابھی تک تو گلی ڈنڈا اور گولی کھیلنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا اب اسمیں آوارگی کا بھی اضافہ ہوا۔ اور وہ اکثر رات کو بھی غائب رہنے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر باپ کو شادی کی فکر ہوئی۔ متوسط طبقے میں گیارہ بارہ برس کے لڑکوں کا غیر شادی شدہ رہنا خاندانی نقص اور ناداری کا کھلا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ مگر ایسی حالت میں جب تک کہ لڑکا خود کھانے کمانے کے لائق نہ ہو جائے اُس پر خانگی دباؤ ڈالنا کتنا خطرناک ہے۔ ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں سوسائٹی غریب اور غلام بچے پیدا کرنے پر لوگوں کو مجبور کرتی ہے۔

(۲)

غریب کسان قرض سے کوسوں دُور بھاگتا ہے کیونکہ مہاجن کا آخری حملہ اس کے کھیتوں پر ہوتا ہے۔ اُنھیں کھیتوں پر جن کی آمدنی سے وہ اپنے کنبہ کی پرورش کرتا ہے، سیکڑوں بھیک منگوں کی جھولی بھرتا ہے اور سرکاری عملوں کی مٹھی گرم کرتا ہے انھیں کھیتوں کا اناج پنڈت جی کو کتھا پران سنانے پر آمادہ کر کے اُسے جنت کے خواب بھی دکھاتا ہے۔ مگر افسوس۔ دنیا بھر کی پرورش کرنے والا کسان قرض لینے پر مجبور ہے اُس کا ایثار اُس کی چھوٹی موٹی بے ایمانیوں پر آسانی سے پردہ ڈال سکتا ہے اور وہ خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اُس کو یہ منظور نہیں۔ اُس کا دل صاف وسادہ ہے۔ گندے کاغذ پر روشنائی کی ایک آدھ چھینٹ چنداں بدنما نہیں معلوم ہوتی لیکن سادہ ورق پر دھبہ بھی پڑ جائے تو آنکھوں میں بہت کھٹکتا ہے کسان یہی جانتا ہے کہ ایک ہی لغزش میں اُس کے سارے اوصاف مٹی میں مل جائیں گے۔ بس موقع پر اُسے روپیہ ملنا چاہیے۔ وہ زیادہ سود سے بھی نہیں بھاگتا۔ اُس کا لڑکا بیمار ہے اُسے پندرہ روپیہ دے دیجئے چاہے پرنوٹ پر پندرہ کے بجائے پچیس (۲۵) روپے لکھا لیجئے۔ سود کے علاوہ دعائیں مفت میں لیجئے۔ موقعہ پر مدد دینے کا احسان الگ۔ گنا۔ مٹر۔ چنے کی فصل میں چاہے اُس کے لڑکے ترسیں اور ان چیزوں کے لئے ٹکر ٹکر تاکیں لیکن وہ تم کو فصل کے شروع ہی میں مٹکا بھر رس اور مٹر کی پھلیاں ضرور پہونچا دے گا۔ تم سے اتنا بھی نہ ہو گا کہ ہمدردی سے اُس کے ہاتھ پر دو ایک پیسے رکھ دو۔ وہ بڑی بڑی اُمیدیں لے کر آیا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ ان چیزوں کا کوئی معاوضہ لینا گناہ سمجھتا تھا لیکن اب وہ اپنی غریبی سے مجبور ہے تاہم وہ اپنی احسانمندی کا ثبوت ضرور دیگا۔ حالانکہ انھیں چیزوں کو بازار میں فروخت

کر کے وہ آسانی سے اپنے لڑکوں کا منہ میٹھا کر سکتا تھا۔ لیکن وہ ان کی عادت نہ بگاڑے گا۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے لڑکے بھی تمہاری طرح چھوٹے بن کر اپنی ضروریات کو دوسروں پر مقدم رکھیں۔ اسے معلوم ہے کہ تمہارے ایسے امیروں کے رحم و کرم میں بھی خود نمائی کو بڑا دخل ہے۔

سوا سو روپیہ خرچ ہو گیا۔ مادھو کی شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ سوتیلی ماں کے لڑکا بھی پیدا ہوا۔ اب تک رجنی کا دل پتھر تھا لیکن قدرت نے سخت پتھروں کو توڑ کر صاف اور شیریں پانی کا چشمہ پیدا کیا۔ وہ مادھو کے ساتھ شفقت سے پیش آنے لگی۔ نئی بہو اپنی خدمت کی بدولت ماں کے گلے کا ہار بن گئی۔ پیر دبانا سر میں تیل ڈالنا۔ برتن مانجنا۔ روٹی بنانا یہاں تک کہ گھر کے کل کام کو اُس نے سنبھال لیا۔ اب رجنی گھر کے کام کاج سے استعفا دیکر حاکم کی طرح صرف حکم دیتی تھی۔ کام کرنے والا کوئی دوسرا ہی تھا۔ نئی بہو خانگی معاملات میں اُس سے مشورہ ضرور کر لیا کرتی تھی مگر محض اپنی سعادتمندی کا سکہ جمانے کے لئے ورنہ وہ رجنی سے زیادہ عقلمند اور محتاط واقع ہوئی تھی۔

مادھو گلی ڈنڈا بھول گیا۔ اگر اسے کھیلنا ہوتا تو اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ دل بہلا لیتا تھا۔ ماں جو اتنے دنوں سے اُس کے پیچھے پڑی تھی اب شفقت سے پیش آنے لگی۔ اب پانی پیتے وقت مادھو کو بغیر مانگے ہی گڑ مل جاتا تھا۔ کھیلنے کے لئے بھی اُس سے اصرار کیا جاتا تھا لیکن اب اُس کی طبیعت ہی اس طرف مائل نہ ہوتی تھی۔ وہ روزانہ گائے چرانے جاتا اور رات سے دو گھنٹے پہلے لوٹ آتا تھا۔ پھر رات کے چارے کا انتظام کر کے دودھ دوھتا۔ اس سے فراغت پاتا تو بچے کو لیکر گھنٹے آدھ گھنٹے ٹہلاتا تھا۔

(۳)

ناگ پنچمی کا مبارک تیوہار تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رمتی ایک ٹوکری میں دہی کا مٹکا۔ تھوڑا سا گھی اور ایک کٹھل رکھ کر گوددی ساہو کے گھر پہونچا۔ گوددی ٹاٹ پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ سامنے دو چار حاجتمند اپنی اپنی سنا رہے تھے۔ رمتی کو آتا دیکھ کر پیش بندی کے طور پر یا اس خیال سے کہ تقاضہ کر دینے پر اس سوغات کا کوئی صلہ دینا نہ پڑے گا بولا "ارے بھائی رمتی ہمارا بڑا اکاج ہے۔ اور دس آدمی دروازے سے لوٹ جاتے ہیں۔ اب تو سال بھی ختم ہو گیا"۔

گھورو پاسی جس کو کلکتہ جانے کے لئے کرایہ کی ضرورت تھی بولا ہاں مہتو۔ سب کا ہرج گرج سمجھو۔ ساہو کے گھر میں کوئی پیڑ لگا ہے کہ سب کو دیں جب ایک سے ملے تب دوسرے کو دیں"۔

رمئی نے کہا۔ "ہاں گھورو بھیا بات تو سچ ہے مگر کا کریں مجبوری ہے"

گودری ساہو کو روپیوں کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ وہ گھورو کو روپیہ دینا نہ چاہتا تھا۔ اُسے یہ دکھلانے کی ضرورت تھی کہ واقعی اس کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ مہاجن کو قرض وصول کرنے کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی سود بڑھانے کی۔ وہ صبر کرنے والے قصاب کی طرح شکار کو موٹا کر کے ذبح کرتا ہے۔

گودری ساہو نے دہی کا مٹکا دیکھتے ہوئے کہا۔ "کئی دن کا ہے"؟

رمئی نے غرور سے سر اونچا کر کے کہا" تازہ ہے ساہو آجکل چھوکرا سیوا کرت ہے تین چار سیر دودھ ہو جات ہے"

ساہو کا لڑکا بیٹھا تھا ٹوکری اُٹھائے گیا تھوڑی دیر میں ہانپتا ہوا آیا۔ اور ٹوکری پٹک کر ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولا" دادا بُڈھا ہمیں لے آئے" اُسے اندیشہ تھا کہ کہیں رمئی باہر چلا گیا ہو۔ اسی لئے وہ اسقدر تیزی سے دوڑتا ہوا آیا تھا

رمئی نے سمجھا تحفہ قبول نہ ہوتا تو بغیر ناک بھوں چڑھائے نئی فرمایش نہ ہوتی۔ کہا اچھا بھیا کل لے آؤنگا، مگر وہ چلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ دوسرا لڑکا آیا اور گودری کی طرف دیکھ کر بولا" باپو کٹھل"

رمئی نے کہا" اچھا بچا۔ کٹھل بھی آجائے گا۔

(۴)

رمئی سر پر ٹوکری رکھے چلا جا رہا تھا کہ راستے میں گودری مل گیا، رام رام، کے بعد ساہو نے پوچھا" کہاں کی تیاری ہے مہتو"

رمئی نے ٹوکری دکھاتے ہوئے کہا" ساہو جی۔ کل کا تقاضا تھا۔ سو لایا ہوں۔

گودری نے بیٹھتے ہوئے کہا" مہتو ایک گائے چاہیئے۔ چھوٹی سی کہ چارہ کم کھائے اور دودھ زیادہ دے"

"گائے تو گھر ہی میں ہے ساہو"

"یہی تو میں سوچ رہا تھا لیکن ذرا لحاظ معلوم ہوتا تھا"

"تو پھر چل کے دیکھ لو"

"سب دیکھا تا کا ہے"

"دام۔ کام"

"دام .... دیکھا جائے گا۔ ابھی تو ہمارا ہی حساب ہے"

"وہی تو ہم کہتے ہیں۔ حساب کر کے اپنی جمع سے کاٹ لو اور بتائے دد۔"

گودری کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ رنئی اتنا ہوشیار ہوگا۔ خیال تھا کہ اچھی سی گائے سود ہی میں مار لونگا۔ جھنجھلا کر بولا "ہاں۔ ہاں جب چاہے حساب کرلو۔ ہم مفت تھوڑے ہی مانگتے ہیں۔ اتنے دن ہو گئے میں نے تو کبھی تقاضہ بھی نہیں کیا اور تم حساب حساب چلاتے ہو۔ حساب کرلو۔ سوا سو کا پرونوٹ بارہ مہینے سے اوپر ہو گیا"۔

گودری نے حساب لگا کر کہا" دیکھو ہمارے ایکسو ساٹھ سے زیادہ ہوتے ہیں"۔

برہمن کا پترا اور مہاجن کا بہی کھاتہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔ اسمیں شک کی گنجایش ہی نہیں ہوتی۔ ابھی تک اس کی اتنی ہی قدر ہے جیسی سیکڑوں برس پہلے تھی۔ رنئی نے کہا۔ "اچھا ساہوکار لے لو سو روپیہ اور باقی سہی"۔

"تو کیا گائے کے ساٹھ روپیہ لوگے"

"بڑی سیوا جتن سے تیار ہوئی ساہو۔ جب چاہو تین ساڑھے تین سیر دودھ دوھ کے دیکھ لو"

"بھائی ہم تو پینتیس دیں گے۔ آخر بیوہار کس لئے کیا ضرورت پر کام نہ آؤ نہ سہی۔ کچھ ہرج نہیں۔ گائیں تو بہت ہیں۔ مگر چاہتا تھا کہ آخر روپیہ دینا ہی ہے تمہیں سے لے لوں۔ اچھا روپے کا انتظام کر دینا۔ ایسا نہ ہو کہ بُرائی ہو۔ میں دعویٰ نہیں کرنا چاہتا" گودری نے سونٹا اٹھاتے ہوئے کہا۔

رنئی گودری کے باپ کے وقت سے دہی دودھ بھٹے کٹھل وغیرہ پہونچایا کرتا تھا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ ساہو ہم نے بھی یہی سمجھ کر راہ و رسم بڑھائی تھی کہ وقت پر ہمارے کام آؤ۔ لیکن کسان احسان جتانا گناہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک اس سے چھوٹی اور کیا بات ہوگی کہ کسی کو کھلا کر اس کا ذکر کرے۔ دعوے کی دھمکی سُن کر رنئی نے کہا" اچھا پھر لیتے جاؤ"۔

رنئی نے گائے دے دی۔ ساٹھ ستر کا مال پینتیس روپیہ پر کسان اپنا مال اچھی قیمت پر کبھی نہیں فروخت کر سکتا۔ وہ ہر حالت میں مجبور اور مہاجن مختار ہے۔ مہاجن چاہے تو کسان کو بغیر پانی مار سکتا ہے۔

گائے بکتے ہی مادھو پر پھر پھٹکار پڑنے لگی۔ سوتیلی ماں برہم ہو گئی۔ مادھو کی عمر گھر بیٹھنے لایق نہ تھی۔ جب سے بہو آئی تھی وہ مادھو اور اپنے بچے کے درمیان کوئی خاص فرق نہ سمجھتی تھی مگر اب مادھو پھر غیر ہو گیا۔ وہ نالایق تھا۔ ماں کا منشا یہ تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر کچھ دنوں کے لئے پردیس چلا جائے لیکن وہ کھُل کر کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ وہ خود جلتی تھی اور مادھو کو جلانا پسند کرتی تھی۔

جس دن گودری نے گائے لی اُس کے بیسویں پچیسویں دن مادھو گھر سے غائب ہو گیا۔ طاق

میں رمئی کے رکھے ہوئے روپے اور ماں کے کچھ گہنے غائب تھے۔ گھر میں آفت مچ گئی لیکن رجنی چپ تھی گویا کچھ ہوا ہی نہیں یا ہوا تو اُس کی رائے سے۔

(۵)

مادھو پانچ برس کے بعد کما کر لوٹا۔ رمئی اس کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی خدا کے گھر سے آگیا ہو یا آسمان کا کوئی فرشتہ آسے قرض سے نجات دلانے کے لئے زمین پر اُترا ہو۔ لڑکا اپنی کمائی کی کتھا سنا رہا تھا۔ کس طرح اُس نے پردیس میں گائے مول لی اُس کا دودھ بیچ کر پیسے بچائے اور گائے بھینس لے کر اپنا روزگار بڑھایا۔ دوران گفتگو میں اُس نے گودری ساہو کا نام کئی مرتبہ دُہرایا۔

رجنی سُن رہی تھی اُس نے دھیرے سے مادھو کو بلایا۔ وہ کئی مہینے سے بیمار تھی۔ اُٹھنے کی سکت نہ تھی، مادھو اندر جاکر چارپائی کے قریب ٹاٹ پر بیٹھ گیا۔

رجنی نے کہا "بیٹا میں تو کئی مہینے سے بیمار ہوں۔ بچنے کی کوئی اُمید نہیں اور نہ زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ بہو دیکھ لی۔ لڑکا کھلایا۔ اب کیا چاہیئے۔ تمہارے سامنے مرجاتی تو گت بن جاتی"۔

مادھو نے آنسو روکتے ہوئے ماں کو دیکھا۔ اتنے میں رجنی کا لڑکا ہرکھو آگیا۔

رجنی نے سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا "بیٹا بچپن ہی سے میں نے بڑا مزاج دکھایا ہے۔ میں چاہتی تھی کہ تم میری زندگی میں کچھ کرنے لائق ہو جاؤ سو وہ بات آج پوری ہوگئی۔ میں ہرکھو کو تم سے زیادہ پیار کرتی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم غیر ہو۔ ماں ہمیشہ چھوٹے بچے کو جو مجبور ہوتا ہے زیادہ پیار کرتی ہے لیکن میں اپنی غلطی مانتی ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ سختی کی ہے تم بھی ہرکھو کو مارپیٹ کر اپنی طرح بنالو۔ باپ دادا کی کمائی بیچ کر کھانا حرام ہے"۔

رمئی نے ہرکھو کو پھانکنے والی سُرتی لینے کے لئے بھیجا تھا جب وہ نہ لوٹا تو کھانستا ہوا وہ خود رجنی کے پاس آیا۔ رجنی نے کہا "آؤ بیٹھو میں تم سے آج ایک بات کہتی ہوں بولو مانو گے"۔

رمئی "کہو" کیا بات ہے۔

"دیکھو اب مادھو گھر کا مالک ہوگا"

"بس کہ اور کچھ"

بڈھوں کو گھر کے کاموں سے استعفا دیتے ہوئے بڑا رنج ہوتا ہے وہ یہی چاہتے ہیں کہ کام چاہے جو کرے لیکن مالک کا فرضی خطاب اُنھیں کو دیا جائے۔ رمئی اُٹھ کر جانا چاہتا تھا کہ رجنی نے روک کر کہا "کیا بچار ہے"۔ رمئی رجنی کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا کہا "اچھا بھئی تم تو

ایک بات دوڑ لے کر اٹھتی ہو۔"

(۶)

مادھو جنی کے پاس سے اُٹھا تو سیدھا گودری کے پاس پہونچا اور کہا کہ میں بھوپ سنگھ کے پاس چلتا ہوں تم بھی بہی کھاتہ لے کر آؤ اپنا روپیہ لیجاؤ۔"

گودری حیرت میں آگیا۔ کاغذ نکالا۔ صرف ایک سادے ورق پر ٹکٹ اور انگوٹھے کا نشان لگا تھا نہ تاریخ درج تھی نہ رقم کا ذکر تھا۔ بھوپ سنگھ کا نام سنکر ڈر گیا اور کاغذات اُلٹنے پلٹنے لگا۔

بھوپ سنگھ گاؤں کے مکھیا تھے۔ اکثر غرضمندوں کو ٹال دیا کرتے تھے لیکن مادھو کے ہاتھ میں نیا چھاتا دیکھکر دور ہی سے بولے آؤ چیلا۔ کب آیا۔ لا کچھ لایا ہے چھاتا تو بڑا البیلا ہے۔ لا یہی سہی۔"

مادھو "آج سویرے آیا۔ آپ گودری مہاجن کا حساب طے کرا دیں۔"

"ابھی چل۔ دھوپ تو ہے لیکن (مادھو کا چھاتا لیتے ہوئے) کچھ ہرج نہیں۔"

گودری ابھی پس وپیش میں پڑا تھا کہ بھوپ سنگھ آگئے اور پرونوٹ طلب کیا۔ ساہو نے پرونوٹ دکھانے میں آگا پیچھا کیا۔ لیکن ٹھاکر نے ڈانٹ بتا کر لے ہی لیا۔ سادہ کاغذ دیکھکر انھوں نے ہنستے ہوئے کہا" او ہو لالہ۔ یہ جعل! گواہ کون بنے گا۔ کتنے روپے ہیں۔ دیکھا نا مادھو۔ لوگ زمیندار سے چھپا کر کاغذ لکھاتے ہیں کہ دو چار روپیہ دینا نہ پڑے۔ تمہیں بتاؤ زمیندار دو چار روپیہ لیکر کتنا بڑا کام کرتا ہے"

"سوا سو روپیہ ہیں صاحب آج سات سال ہو گئے۔"

"تو دعویٰ کیوں نہیں کیا"۔

گودری نے کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو چپ تھا غصہ کے مارے اس کے منھ سے بات نہ نکلتی تھی۔

بھوپ سنگھ "کچھ ملا بھی ہے"

گودری "پینتیس روپیہ میں ایک گائے لی تھی"

ٹھاکر نے پرچے پر حساب لگاتے ہوئے مادھو سے کہا" لاؤ روپیہ لائے ہو نوّے روپیہ اور دیدو۔

مادھو نے رقم گن دی اور ٹھاکر نے اٹھا کر اپنی دھوتی میں باندھ لی۔ گودری نے دہائی دی تو مادھو نے اس کی طرفداری کی مگر ٹھاکر جھلاگئے اور ایک پائی نہ دی جعلی کاغذ دکھلاتے ہوئے انھوں نے کہا "دیکھو اگر روپیہ دینا چاہتے ہو تو میں یہ کاغذ گودری کو دے دوں وہ اب بھی تم سے نوّے کا کئی گنا وصول کر سکتا ہے۔ اور نہیں تو گودری ہو تو تم کو عدالت چلنا منظور ہے۔

گودری نے نحیف آواز میں کہا نہیں صاحب ہماری عدالت آپ ہی ہیں"

بھوپ سنگھ نے کاغذ پھاڑتے ہوئے کہا "تو لو دیکھو اپنا حق لینے کے بعد میں کاغذ تمہارے سامنے پھاڑ دیتا ہوں۔ سمجھ تو عدالت نے جرمانہ خزانہ میں داخل کرالیا۔"

(۷)

رجنی مرگئی۔ مادھو گھر کا مالک ہے۔ پرنوٹ والے واقعے سے وہ سخت متاثر ہوا۔ وہ جاہل اور ناخواندہ ہونا گناہ کبیرہ سمجھتا ہے۔ اس لئے اُس نے خود بھی تھوڑا بہت پڑھ لیا ہے۔ اور پٹواری کے کاغذات دیکھ سکتا ہے اب اُسمیں اتنی ہمت ہوگئی ہے کہ زمیندار کو مالگذاری دینے کے بعد اُس سے رسید کے لئے اصرار سکے۔

ہرکھو اسکول جاتا ہے اور شام کو گائیں چراتا ہے۔ اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے جب وہ دو سو روپیہ پیدا کرکے مادھو کے ہاتھ پر رکھدے گا تو شادی ہو جائیگی۔

مادھو کے ایک لڑکی ہے ہرکھو مدرسہ سے پڑھ کر آتا ہے اور گھر ہی پر اسے پڑھاتا ہے۔ گانوں میں مادھو کی ایک دوکان ہے جس میں آدھے کے حصّے دار بھوپ سنگھ بھی ہیں۔ اُن کے ڈر سے مادھو سے کوئی نہیں بولتا۔ گودری کا کام بگڑ رہا ہے کیونکہ مادھو بیوہار بھی کرتا ہے لیکن غریبوں کو لوٹنے کے لئے نہیں بلکہ اُن کی مدد کرنے کے لئے وہ روپیہ پڑا نہیں رہنے دیتا۔ وہ تقاضوں کا قائل ہے اور قرضداروں کے کان گرم کیا کرتا ہے۔ سود بڑھا کر جائداد نیلام کرانا اُسے پسند نہیں۔

بھوپ سنگھ اُس کے قانونی مشیر ہیں۔ جو بات اُس کے سمجھ میں نہیں آتی وہ اُنھیں سے جاکر پوچھتا ہے لیکن وہ اُن سے کسی بات میں دبتا نہیں پھر بھی اُن کو خوش رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

جذبات حسرت

مولانا حسرت موہانی کی یہ تازہ غزل ہے جو آپ نے مشاعرہ شملہ کے موقعہ پر کہی۔

اسی کا جلوہ ہر جانب عیاں ہے — نمود حسن بے صورت کہاں ہے
ملی دل کو مراد نامرادی — ترے غم کی بدولت شادماں ہے
فقیر بینوائے درگہ عشق — امیر بے نیاز دو جہاں ہے
نکلنے پائے کیونکر یاد ان کی — در دل پر محبت پاسباں ہے

نہ چھوڑی تم نے حسرت عشقبازی
تمنا یہ ہے کہ ابھی جواں ہے

شملہ سے الوداع

(از جناب پنڈت ہنسراج صاحب محرم چھبڑودی مقیم شملہ)

الفراق اے مالِ شملہ کے نظارو الفراق ۔۔۔ الفراق اے چرخ رفعت کوہسارو الفراق
الفراق اے رشکِ جنّت سبزہ زارو الفراق ۔۔۔ الفراق اے دوستو اے غمگسارو الفراق

چھوڑ کر اس کیف کی وادی کو اب جاتا ہوں میں
بخت لے جاتا ہے مجھکو ورنہ کب جاتا ہوں میں

موسم سرما میں دیکھی برف باری کی جھڑی ۔۔۔ رعد دیکھا اور دیکھی ژالہ باری بھی تری
موسم گرما میں ساری مال پھولوں سے بھری ۔۔۔ گلرخوں کا اس جگہ جمگھٹ وہاں ٹولی کھڑی

کوئی مصروفِ تماشا کوئی محوِ انتظار
ہوش پر قابو کسے پہلو میں دل ہے بیقرار

بزم جم کی جام جم کی یاد ہے دنیا تری ۔۔۔ فکرِ فردا سے بہت آزاد ہے دنیا تری
خوبیٔ تہذیبِ نو ایجاد ہے دنیا تری ۔۔۔ گلرخوں کے فیض سے آباد ہے دنیا تری

پھر رہے ہیں مال پر وہ کیف کی دنیا لئے
سب کے سب ساقی ہیں گویا ساغر و مینا لئے

ان کے پاس اک خنجرِ خوندار کا جوڑا بھی ہے ۔۔۔ ان کے پاس اک نرگسِ بیمار کا جوڑا بھی ہے
یعنی قدح بادۂ سرشار کا جوڑا بھی ہے ۔۔۔ ان کے پاس اک جام زہرِ مار کا جوڑا بھی ہے

سیکڑوں ساماں ہیں ان کے پاس یوں کیا کیا نہیں
ہاں مگر جس کو وفا کہتے ہیں وہ اصلا نہیں

دیکھ لیں شملہ تری ہم نے بہاریں دیکھ لیں ۔۔۔ نیلگوں بادل سے پانی کی پھواریں دیکھ لیں
سرمدی نغمے سنائی آبشاریں دیکھ لیں ۔۔۔ گھاٹیوں میں چشموں اور سوتوں کی دھاریں دیکھ لیں

برف، بارش، دھوپ، بادل، سب نرالے ہیں ترے
حسن اور فطرت گلے میں باہیں ڈالے ہیں ترے

پک نک

ایک قصّہ

(از شریمتی کملا دیوی چودھری - ترجمہ از منشی کانتی پرشاد ورما۔ بی۔ اے)

"برسات کا موسم - ابر کا دن اور اتوار کی تعطیل۔ ان تمام نعمتوں سے استفادہ حاصل نہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے"

صبح آنکھ کھلتے ہی ستیش کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوا اور اُس نے فوراً ہی پک نک کا پروگرام تیار کر لیا۔ پھر کیا تھا۔ ایک منٹ بھی دل پر قابو رکھنا اُس کے لئے دشوار ہوگیا۔ برابر کے کمرے میں جا کر اُس نے سبودھ کے سر پر صراحی الٹ دی۔ "عجیب آدمی ہو۔ ارے ایسا اچھا دن سو کر برباد کر رہے ہو"

بیچارے سبودھ نے رات کے بارہ بجے تک کتابوں سے مغز پچی کیا تھا اور آج کے لئے اسے از سرِ نو ترو تازہ کرنیکا پروگرام بنایا تھا۔ کہ

(۱) صبح دس بجے تک خوابِ خرگوش میں مست رہے گا۔ اور پھر آنکھ کھلتے ہی گرم گرم چاء کی ایک پیالی پئے گا۔

(۲) دس سے گیارہ بجے تک پلنگ ہی پر لیٹے ہوئے ڈائلین کے "ارٹ" سنائے گا اور بیچ بیچ میں ستیش اور سدھیر سے گالی گلوچ کے مراسم بھی پورے کرتا رہے گا۔ اس کے بعد گیارہ سے ساڑھے گیارہ بجے تک داڑھی بنائیگا۔ اور ساڑھے گیارہ سے ساڑھے بارہ بجے تک گوڈریج سوپ رگڑ رگڑ کر غسل کریگا۔

(۳) ساڑھے بارہ سے دو بجے تک کا وقت بالوں میں تیل ڈالنے اور دماغ کو طاقت پہونچانا۔ کنگھے اور شیشے کی مدد سے بال سنوارنے پومیڈ اور خوشبودار پاؤڈر سے افزائشِ حسن کی کوشش کرنے اور ولایتی لونڈر سے والی تر کر کے دماغ کو ترو تازگی کی فکر کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ ان سب باتوں سے فارغ ہو کر چند ے پہل قدمی کرنا۔ مالک مکان وکیل صاحب سے نمستے کہنا اور پھر کھانے کی میز پر ارھر کی دال۔ آلو کی ترکاری اور روٹی کھانا تجویز کیا گیا تھا۔

اس کے بعد ڈھائی سے چار بجے تک سہ پہر تک تاش۔ کیرم وغیرہ کھیلنا۔ پھر ایک گھنٹہ اٹبن پالش وغیرہ میں خرچ کر کے سوٹ بوٹ سے لیس ہو کر جاگھر کی طرف گھومنے نکل جانا۔ اس کے بعد کسی سینما ہاؤس میں بیٹھکر رزمِ عشق کی چال ڈھال کا مشاہدہ کر کے اپنی روحانی قوت کو بیدار کر کے اس پُر لطف دن کو ختم کر دینے کا ارادہ تھا۔

اتوار کا دن اس خوبصورتی سے ختم کرنے کے بعد پھر وہی کھانا۔ پڑھنا۔ کالج جانے کی فکر وغیرہ مگر ستیش نے سات بجے ہی سر پر صراحی انڈیل کر سارا پروگرام بگاڑ دیا۔

غصہ سے جلکر ایک ہی سانس میں بہت سی گالیاں ختم کر کے سبودھ بولا "کون بیوقوف کہتا ہے کہ ابر کے دن سونا وقت برباد کرنا ہے"۔

ستیش مسکرا کر بولا۔ "اب سیدھی طرح سے بستر چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہو۔ زیادہ بکواس کا وقت نہیں ہے۔ میں نے سونے سے بھی بڑھیا پروگرام بنایا ہے"۔

تیسرے کمرے میں سُدھیر لیٹا ہوا تھا۔ ان دونوں کی نوک جھونک سُنکر اُس سے بھی بستر پر پڑا نہ رہا گیا۔ فوراً موقعہ واردات پر پہونچکر بولا "کیا معاملہ ہے یار"

ستیش نے پک نک کے پروگرام کے ساتھ ہی ایک اور دلچسپ پروگرام بھی پیش کیا جس کو سُنتے ہی سبودھ فوراً بستر چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ نیند پوری ہونے کا غم دور ہو گیا اور تینوں دوست پک نک کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔

(۲)

کالج ہوسٹل میں جگہ نہ ملنے کے سبب سے سدھیر ستیش اور سبودھ ایک وکیل صاحب کے مکان کے ایک حصہ میں رہتے تھے۔ بیچارے وکیل صاحب سیدھے سادے اور نیک آدمی تھے۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی کالج چھوڑے ہوئے انھیں ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ پھر بھی نہ معلوم کیوں جوانی کا چلبلاپن ان کے مزاج سے رخصت ہو چکا تھا۔ ہر وقت متفکر رہتے تھے۔ گھر اور کچہری کے سوا دین دنیا سے کوئی تعلق رکھنا اُن کے مذہب کے خلاف تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کی شکل سے وہ خوف کھاتے ہیں۔ کوئی چھیڑ کر بات چیت کرنے لگے تو جواب دینا ہی پڑتا تھا ورنہ وہ خود کسی کو گفتگو کا موقعہ نہ دیتے تھے۔ اگر کوئی جان پہچان کا مل جاتا تو حتی الوسع اُس سے آنکھ چرا کر بچ نکلتے۔ یوں مزاج کے اکھڑ نہ تھے۔ اور کسی سے بات چیت کرنے کی بلا میں پھنس جاتے تو اس سے خلق سے پیش آتے۔ اور ہمدردی و محبت سے بات چیت کرتے۔ مگر دوسروں سے ملنے جلنے میں مُنہ چُرایا کرتے۔

اس چوکڑی کے لئے وکیل صاحب ایک عجیب چیز تھے۔ یہ کیسے آدمی ہیں۔ اس عمر میں اتنے بے کیف کیوں ہیں۔ ہر وقت متفکر بنے رہتے ہیں۔ ان سوالوں کے حل کرنے میں یہ لوگ اپنا دماغ کھپایا کرتے۔ کبھی کبھی اسی مضمون پر اچھا خاصہ مباحثہ چھڑ جاتا کوئی کہتا "میاں بیوی میں نہیں بنتی ہے"۔ کوئی کہتا "لکا چنید ہو نہ بننے کی کوئی وجہ بھی تمہیں دکھائی دیتی ہے۔ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ اُن کی

بیوی کو کیا دیکھا نہیں ہے۔ بڑی پڑھی لکھی تمیز دار اور خوبصورت بھی ہیں۔"

تو جناب آپ ہی اپنی عقل کا کرشمہ دکھلائیے۔"

"بھئی ممکن ہے کہ کسی اور سے محبت کرتے ہوں اور والدین نے خلاف منشا شادی کر دی ہو۔"

ستیش نے کہا "ہو سکتا ہے۔ سدھیر تمہاری رائے صحیح معلوم پڑتی ہے۔"

میز پر زور سے ہاتھ مار کر سبودھ بولا "ہرگز نہیں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ وکیل صاحب کے پاس دل ہی کب ہے جو کسی سے محبت کر سکیں۔

"تو بھائی فلاسفر ہوگا۔"

"اجی واہ۔ فلاسفر ہوتا تو قانون کی کتابوں سے مغز پچی کرنے جاتا۔ تم بھی نرے جانگلو ہو۔ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ وہ آج فلاسفی کا پروفیسر نہ بن جاتا۔"

"ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا"

"کسی مذہبی چکر میں پڑ کر یوگ ابھیاس کر رہا ہے"

"ممکن ہے۔"

"ارے یار کچھ بھی ہو کسی نہ کسی طرح اس راز کو دریافت کرنا چاہیئے۔ لیکن وہ تو پیٹھ پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا۔ پاس جاتے ہی اڑیل گھوڑے کی طرح لاتیں جھاڑنے لگتا ہے۔"

تینوں دوست وکیل صاحب کے متعلق اسی قسم کی خوش گپیاں کر کے انکا مذاق اڑایا کرتے اور اس کے ساتھ ہی ان سے بے تکلفی بھی پیدا کرنیکی کوشش کرتے جاتے۔

وکیل صاحب کی خلوت پرستی میں ان کے آنے سے خلل پڑ گیا تھا۔ پہلے تو بیچارے بہت ہی گھبرائے۔ کہ کہاں سے یہ بلا مول لے لی۔ کتنی ہی مرتبہ وہ اسقدر پریشان ہوئے کہ مکان خالی کرانیکی ٹھان لی لیکن پھر حمیت نے گوارا نہ کیا۔

ان تینوں دوستوں نے صبح شام وکیل صاحب کے گھر کا چکر لگانا فرض کر لیا تھا۔ کسی نہ کسی کام کے لئے روزانہ وکیل صاحب کا منہ دیکھتے ہی رہتے تھے۔ انکا بچہ بیمار ہوا تو ڈاکٹر کے گھر جا کر دوا وغیرہ لانے کا کام تو زبردستی اپنے ذمہ لے لیا۔ غرض اسطرح انہوں نے وکیل صاحب پر اپنا سکہ پوری طرح جما لیا۔ وکیل صاحب بھی آخر پتھر کے تو تھے نہیں۔ آہستہ آہستہ بات چیت میں بے تکلف ہونے لگے لیکن پھر بھی وہ زیادہ کھلنا نہ چاہتے تھے۔

آج وکیل صاحب غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ناشتہ کی فکر میں تھے کہ تینوں لڑکوں نے آ کر گھیر لیا اور منت سماجت سے ان کو بھی پک نک کے لئے تیار ہی کر لیا۔ وکیل صاحب بیچارے کیا کرتے۔ تعطیل کا دن تھا۔ کچھ بہانہ بن نہ پڑا۔ گھر میں جا کر بیوی سے بولے "لڑکے کسی طرح مانتے ہی نہیں۔ مجھے اپنے ساتھ پک نک میں لیجانے کے لئے ضد کر رہے ہیں"

"تو چلے کیوں نہیں جاتے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے تندرستی خراب کر رہے ہو۔ نہ معلوم تمہیں ہو کیا گیا ہے کہ کہیں جاتے آتے بھی نہیں۔ ایسی بھی کیا آخر انسان ہی سے بھول ...."

فقرہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ وکیل صاحب نے بیوی کو خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

"لڑکے پاس ہی کمرے میں کھڑے ہیں سن لیں گے تو قیامت ڈھا دیں گے"

سچ مچ وہ دروازے ہی میں کان لگائے کھڑے تھے۔ باہر ہی سے بولے "شکریہ بھابی جی۔ وکیل صاحب کو تیار کر کے کچھڑی نہانے کا سامان بھی ساتھ کر دیجئے"

پھر ایک دوسرے کے کان میں کہنے لگے "یار کوئی بڑا اسرار ہے۔ بھول کا لفظ سنا!"

(۳)

پک نک پارٹی گنگا کے کنارے ایک سنسان مقام پر پہونچی۔ نہانے کے بعد کچھڑی پکی آم لائے گئے اور سبھوں نے اصرار سے وکیل صاحب کو کھلایا۔ اب سوال اٹھا کہ کیا کیا جائے۔ کسی نے کہا ذرا سیر کی جائے۔ کسی نے کہا تاش کھیلے جائیں۔ وکیل صاحب کو ان لوگوں نے اتنا زیادہ کھلا دیا تھا کہ اُن کے لئے لیٹے رہنے کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر یہی طے ہوا کہ سب لوگ لیٹکر ہی گپ شپ کریں۔ اب دوسرا سوال یہ درپیش ہوا کہ گفتگو کا موضوع کیا ہو۔

ستیش بولا "وکیل صاحب آپ روحانیت کے مسئلے پر کچھ فرمایئے"

وکیل صاحب اس بات سے گھبرا اٹھے۔ بولے "نا بھیا یہ بات میرے بس کی نہیں۔ تم لوگوں نے میرے پیٹ میں اتنا ٹھونس دیا ہے کہ بولا تک نہیں جاتا۔ تمہیں لوگ کچھ کہو"

"تو ہم لوگ بلا موضوع ہی گفتگو شروع کریں گے۔ آپ اُکتائیں گے تو نہیں"

"بالکل نہیں۔ میں بھی خوب لطف اُٹھاؤں گا"

پھر کیا تھا دنیا بھر کی الم غلم باتیں ہونے لگیں۔ برسات کا موسم تھا چاروں طرف گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ سامنے سے بہتی ہوئی گنگا کی دھار آنکھوں کو شاداں کر رہی تھی۔ آم کی شاخوں سے کوئل کی کوک سنائی دے رہی تھی۔ اس دلآویز منظر سے متاثر ہو کر سب لوگ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ وکیل صاحب بھی ان لوگوں کی دلچسپ باتوں

میں محو ہو گئے۔ بہت دنوں بعد آج دل کھول کر ہنسے اور ہنستے ہنستے سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ آخر تھک کر مضمون بدلا گیا اور گفتگو دوسرے پیرائے سے شروع ہوئی۔

ستیش بولا " وکیل صاحب آپ خدا پرست ہیں یا منکر۔"

وکیل صاحب کے کان کھڑے ہو گئے۔ بات ٹالتے ہوئے بولے " ان باتوں کو چھوڑ دو کوئی دوسرا مضمون شروع کرو"۔ لوگوں نے تاڑ لیا۔ ہمیشہ وکیل صاحب اسی بات پر کنّی کاٹتے ہیں۔ آج اس کا فیصلہ ہو جائے۔

سبودھ بولا " بھائی ہم تو خدا پرست ہیں۔ اور سدھیر تم؟"

سدھیر کان پر ہاتھ رکھ کر بولا " ارے رام رام۔ میں تو ناستک کا لفظ سنکر ہی کان بند کر لیتا ہوں۔ میں تو کٹر سناتنی ہوں"۔

ستیش کہنے لگا " میں تو بھائی رادھا سوامی ہونیکا ارادہ کر رہا ہوں۔ کیوں وکیل صاحب آپکی کیا رائے ہے۔ رادھا سوامیوں نے ترقی تو بہت کی ہے"۔

سدھیر منہ پچکا کر بولا " ترقی۔ دنیاوی ترقی کی ہے۔ روحانی ترقی تو خود حاصل کیجاتی ہے سبھا سوسائٹی سے اُس سے کیا واسطہ۔ ویسے تو جو خوبیاں سناتن دھرم میں ہیں اور کسی دھرم میں نہیں۔ کیوں وکیل صاحب آپ کی کیا رائے ہے"۔

وکیل صاحب کو یہ باتیں شروع ہی سے ناپسند تھیں۔ ناک بھوں سکیڑتے ہوئے بولے " ہے تو یہی بات"۔

وکیل صاحب اس مضمون پر ہمیشہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ لڑکوں کا شوق اس سے اور بھی ابھرتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وکیل صاحب کو اس مضمون کی گہری واقفیت ہے اور ہم لوگوں سے اس لئے کتراتے ہیں کہ ہم مذاق اڑائیں گے۔ ستیش نے اس مرتبہ حکمت سے کام لیکر کہا " وکیل صاحب۔ آپ خاموش رہ کر ہمارا سارا مزا کرکرا کر دیتے ہیں۔ آپ اپنے خیالات کو آزادی سے بیان کیوں نہیں کرتے۔

وکیل صاحب نے منہ بناتے ہوئے کہا " نہیں نہیں ایسا تو نہیں ہے۔ میں خاموش کہاں ہوں۔ تم لوگوں کی باتوں کا مزہ لے رہا ہوں"۔

" تو پھر آپ کیوں نہیں بتاتے کہ سناتنی ہیں یا آریہ سماجی"۔

اس مرتبہ وکیل صاحب کچھ گھبرا کر بولے " بھیّا معاف کرو میں اس مضمون پر بحث نہیں کرنا چاہتا"۔

" کیوں وکیل صاحب اس میں ہرج کیا ہے"۔

" ہرج کچھ نہیں۔ لیکن مجھے ان باتوں میں لطف حاصل نہیں ہوتا"۔

" خیر تو جانے دیجئے۔ لیکن آپ کی چال ڈھال سے تو یہی معلوم ہوتا ہے آپ کسی اسی مسئلہ لاینحل کی فکر میں

مبتلا رہتے ہیں۔

اور میں تو آپکو یوگی سمجھے ہوئے تھا۔ آپکی طبیعت بالکل درویشانہ ہے۔ نہیں وکیل صاحب۔ آپ چھپاتے ہیں ہم تو آپ سے درس معرفت لئے بغیر نہ رہیں گے۔"

تینوں دوست وکیل صاحب کے پیچھے پڑ گئے۔ "ہاں ضرور ضرور۔ آپ سے اتنا قرب حاصل ہوتے ہوئے بھی ہم لوگ تاریکی میں رہیں۔ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔"

"تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ارے بھائی میں تو تمہارا جیسا ہی ایک معمولی آدمی ہوں ان باتوں کو کیا جانوں"

"نہیں وکیل صاحب۔ بہت ہو چکا۔ آپ ہم لوگوں کو ٹرکائیے نہیں۔ آپ کیا ہیں ہم خوب جانتے ہیں۔"

اب وکیل صاحب بہت متفکر ہوئے۔ کہیں یہ لوگ میرے بارے میں کچھ سُن تو نہیں آئے ہیں جو اس طرح پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اپنا شک رفع کرنیکو آخر کار انہوں نے دریافت کیا "اچھا تم لوگوں نے میرے بارے میں کیا کیا خیالات بنا رکھے ہیں۔"

لڑکے تاڑ گئے کہ چور کی داڑھی میں تنکے والی بات ہے۔ بولے "وکیل صاحب۔ آپ کے بارے میں مختلف خیالات ہیں۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کریں۔"

وکیل صاحب نے اطمینان کی سانس لی کہ ان لوگوں کی قیاس آرائیاں ہی ہیں کچھ سنا نہیں ہے۔ بولے "ناراضگی کی کیا بات ہے۔ کہو نہ۔"

ستیش بولا "وکیل صاحب۔ آپکی یہ راہبانہ شکل وسیرت دیکھکر میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ لوگ ابھیاس کرتے ہیں اور عنقریب ہی آپ بیوی بچوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے اور پھر ہم لوگ پچھتائیں گے۔ کہ ایسے عالم باعمل کی صحبت حاصل کر کے بھی ہم لوگ کندۂ ناتراشں ہی رہے۔"

سدھیر بولا "میرا خیال کچھ اور ہے۔ آپ کو میں ایک پُر فطرت آدمی سمجھتا ہوں۔ آپ سب سے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ کسی سے بات نہیں کرتے۔ مبادا کہیں آپکا کوئی راز افشانہ ہو جائے۔ اور کیا عجب ہے کہ آپ کسی حصہ سازش کے سرغنہ تو نہیں ہیں۔

وکیل صاحب چونک پڑے۔ سٹ پٹا کر بولے "رحم کرو۔ تم نے تو مجھے گرفتار ہی کرانیکی سوچ رکھی ہے۔ للہ کسی کے سامنے کچھ کہہ مت بیٹھنا۔"

سبودھ بولا "معاف کیجئے۔ آپ اپنے منہ سے نہ کہیں لیکن آپ سے کوئی زبردست گناہ ضرور سرزد ہوا ہے جس کی پاداش میں آپ ہمیشہ غمگین رہتے ہیں۔"

اب تو وکیل صاحب بہت بیچین ہو گئے "للہ بخشو۔ تم لوگوں نے تو مجھے چکر میں ڈالدیا۔ آخر

میرے بارے میں تمہارے ایسے خیالات کیوں ہیں۔ سچ کہتا ہوں۔ ان باتوں میں ذرہ بھر سچائی نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ اس طرح کیوں رہتے ہیں۔ ذرا زندگی میں لطف پیدا کرنیکی کوشش کیجئے۔ ہم لوگوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ آپکی یہ پریشانی دور کر کے ہی دم لیں گے۔"

ستیش کہنے لگا "وکیل صاحب آپ سوشلسٹ ہو جائیے۔"

"نہیں وکیل صاحب آپ رادھا سوامی بن جائیے۔"

"اور کچھ نہیں تو ہمارے کلب کے ممبر ہی ہو جائیے۔"

"اجی نام لکھ لونا۔ پھر تو ہم لوگ انہیں پکڑ لے ہی چلیں گے۔"

"نہ بھائی نا۔ میرے حال پر رحم کرو۔ سبھا سُسائٹی سماج ان چیزوں سے میں بہت گھبراتا ہوں۔"

"آخر گھبرانے کی وجہ۔"

"وجہ یہی کہ میں عہد کر چکا ہوں کہ کبھی کسی سبھا یا سوسائٹی کے چکر میں نہ پڑونگا۔ اُسی عہد کی وجہ سے تو ۱۹۳۰ء کے جنگ آزادی میں حصہ نہ لے سکا۔"

اب کیا تھا۔ اتنی دیر بعد وکیل صاحب راہ پر آئے۔ لڑکے چینٹوں کی مانند اُن سے چپٹ گئے۔ باری باری سے سب اسی سوال کو دھرانے لگے۔ "بتایئے وکیل صاحب آپ نے ایسا عہد کیوں کیا تھا۔"

۴

آخر بیچارے وکیل صاحب اپنی رام کہانی سنانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ لیکن ڈرتے تھے کہ کہیں یہ لڑکے پھر بھی میرا مذاق نہ اُڑائیں۔ ادھر لڑکوں نے ستیاگرہ کر رکھا تھا۔ سب بضد تھے کہ آپ کی داستان سُنے بغیر نہ ہم خود گھر کو جائیں گے نہ آپکو جانے دینگے۔ تینوں میں ایک بھی نرم نہ پڑتا تھا۔ اشاروں اشاروں میں ایک دوسرے کو سمجھا چکے تھے کہ اس مرتبہ اگر شکار ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔ وکیل صاحب کا سانپ چھچھوندر کا سا حال تھا۔ آخر کوئی چارہ نہ دیکھکر بولے "اچھا بھائی میری رام کہانی سنو لیکن وعدہ کرو کہ سوائے تم تینوں کے اور کسی کو یہ حال معلوم نہ ہوگا۔ اور پھر تم لوگ بھی اس کا ذکر چھیڑ کر مجھے کبھی شرمندہ نہ کروگے۔"

لڑکوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔ سبودھ بولا "میں اپنی ہونیوالی بیوی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کسی سے نہ کہوں گا۔"

سدھیر بولا "میں اسی گنگا کی ریتی کی قسم کھاتا ہوں۔ اپنی مادر وطن کی خاک پاک سے بڑھکر اور کیا ہوگا۔"

ستیش کہنے لگا "میں تو بھارت ماتا ... ہوں ... دیا ... کی قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں

کہ آپ کے حکم کی تعمیل کرونگا۔ بس اب آپ شروع کیجئے ورنہ واپسی میں دیر ہو جائیگی اور آپکی بیوی فکرمند ہونگی۔ ہم لوگ تو پھکڑ آدمی ہیں"۔

وکیل صاحب بگڑ اٹھے "تم لوگ تو ابھی مذاق اڑا رہے ہو۔ میں ایسا بدھو نہیں ہوں کبھی میں بھی کالج اسٹوڈنٹ رہا ہوں"۔

"لیجئے آپ یقین ہی نہیں کرتے۔ ہم لوگوں کی قسم کا بھی اعتبار نہیں پھر جس طرح کہئے ہم وعدہ کرنیکو تیار ہیں۔ سچ وکیل صاحب ہم (SERIOUSLY PROMISE) کرتے ہیں کہ کسی سے نہیں کہیں گے اور نہ کبھی اس کی آڑ میں آپکا مذاق اڑائیں گے۔ سبھی نے ایک زبان سے اس بات کو دھرایا۔ تب وکیل صاحب اداس طبیعت سے اپنی رام کہانی سنانے لگے۔

"زمانہ طالبعلمی میں مجھے بھی رفاہ عام کے کاموں سے دلچسپی تھی۔ اور سبھا سوسائٹی کا ممبر بن جانا فخر کی بات سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے روحانیت سے بھی شوق تھا۔ اُن دنوں آریہ سماج کا بڑا چرچا تھا۔ میرے اوپر بھی اس کا رنگ چڑھا۔ پہلے تو سماج کے جلسوں میں جانا شروع کیا کہیں سن لیتا کہ کسی آریہ سماجی کی اسپیچ یا مباحثہ ہے تو کیسا ہی ضروری کام کیوں نہ ہوتا اس کو چھوڑ کر پہونچ جاتا۔ سندھیا ہون وغیرہ بھی روزانہ مشاغل میں داخل ہو گئے۔ ستیارتھ پرکاش کا مطالعہ بھی روزانہ کرتا تھا۔

پہلے گھر میں سماجی نام پڑا۔ پھر دوستوں میں اسکے بعد تمام شہر میں کٹر آریہ سماجی مشہور ہو گیا۔ میں بھی اپنے کو صلی معنوں میں رشیوں کی اولاد کہلانے کے قابل بنانیکی دھن میں تھا۔ میرا پختہ ارادہ تھا کہ ویدوں کا حکم حرف بحرف بجا لاؤنگا۔ برہمچاری رہنے کا زمانہ خیر و خوبی سے گذار کر گرہست آشرم بان پرست اور آخر میں سنیاس کے فرائض بجا لاؤنگا۔ غرض انہیں خیالات میں محو میں ست جگ کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

انہیں دنوں میرے گھر میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ میری عدم واقفیت میں والدہ نے میری شادی پختہ کرلی تھی اور فریق ثانی سے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ میں نے جب یہ سنا تو پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ خیر شرم کو بالائے طاق رکھ کر فرض پر ڈٹے رہنے کا عزم کیا۔ والدین کے اس فعل پر میری آنکھوں سے ندامت کے آنسو بہ نکلے۔ ہائے ایک وہ زمانہ تھا کہ والدین خود اپنی اولاد کو رشیوں کے "گرکلوں" میں بھیجا کرتے تھے اور آج وہ اپنے ہی ہاتھوں اُس کا عزم شکست کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

میرے یہ کہنے پر کہ پچیس سال تک برہمچاری رہنے کی بعد شادی کرونگا۔ والدہ صاحبہ نے رو رو کر کہرام مچا دی۔ والد صاحب نے بھی کہدیا کہ میں اپنا قول نہیں توڑ سکتا۔ اُن کے یہاں سب تیاری ہو گئی ہے۔ شادی اسی ماہ میں کرنی ہوگی۔ اولاد کا فرض ہے کہ بزرگوں کے حکم کی تعمیل کرے"۔

میں بڑے مخمصہ میں پڑ گیا۔ پہلے تو خوب رویا۔ والدین کے قدموں پر سر رکھ کر گڑگڑایا۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ لیکن جب نتیجہ کچھ نہ نکلا تو آریہ سماج کے پریسڈنٹ صاحب کے پاس رائے لینے پہونچا۔ آخر کار اس معاملہ کو طے کرنیکے لیئے ایک جلسہ طلب کیا گیا۔

سب ممبر حیران تھے کہ آخر کیا کیا جائے۔ بحث مباحثہ میں بہت وقت خرچ ہوگیا۔ علما میں ایسا سرگرم مباحثہ چھڑا کہ کئی دن ختم ہوگئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا وہی ڈھاک کے تین پات۔ بالآخر میری ہی عقل رسا نے کام دیا۔ میں نے طے کر لیا کہ بزرگوں کا حکم سر آنکھوں پر۔ شادی کئے لیتا ہوں لیکن پچیس ۲۵ سال کی عمر پوری ہونے تک اپنی بیوی کو بیوی نہ سمجھونگا۔ اس طرح میرا عقیدہ بھی قائم رہے گا۔ اور بزرگوں کے ارشاد کی تعمیل بھی ہو جائے گی۔ اس فیصلہ کی دل کھولکر داد دی گئی اور میں اُس روز سے لوگوں کی نگاہوں میں ایک معزز ہستی بن گیا۔ تمام شہر مجھے برہمچاری جی کے نام سے پکارنے لگا۔ میں بھی یہ خطاب سُن کر خوش ہو جاتا تھا کہ اب تھوڑے ہی دنوں میں میرا شمار بڑے بڑے فضلا میں ہونے لگے گا۔ بہر حال جب کبھی "برہمچریہ" پر میری تقریر ہوتی تو لوگ اُمڈ آتے کیونکہ سبھی یہ سمجھتے تھے کہ میں آپ بیتی کہہ رہا ہوں

اسطرح شادی کے بعد دو سال تو امن و امان سے گذر گئے۔ ابھی مکلاوہ کی رسم نہ ہوئی تھی اور بیوی مائکہ ہی میں تھیں۔ میں نے یہی ارادہ کر لیا تھا۔ کہ اُن کے آنے پر انھیں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھونگا۔ کھانے پینے رہنے سہنے۔ غرض ہر بات میں اس کا خیال رکھتا تھا کہ کوئی بات برہمچریہ کے قواعد کے خلاف نہ ہونے پائے۔

غرض میں گروے کپڑے پہننے لگا۔ اور ہلکی غذا کھانا زمین پر سونا اور عورتوں سے دور رہنا وغیرہ برہمچریہ کی سبھی ہدایات پر کاربند رہنے لگا۔ راستے میں بھی اگر کوئی عورت سامنے آجاتی تو میں آنکھ بند کرکے کھڑا ہو جاتا تھا۔ میرے دوست میرا مذاق اُڑاتے لیکن میں کسی کی پرواہ نہ کرتا۔ اور لوگوں کی عقل پر رحم کھاتا کہ یہ لوگ برہمچریہ کی عظمت سے کیسے ناواقف ہیں۔

کالج کے راستے میں لڑکیوں کا اسکول پڑتا تھا میں جب اس کے پاس پہونچتا تو تیزی سے بائیسکل پر نکل جاتا اگر کبھی اتفاق سے کسی اچھی صورت پر نظر پڑ جاتی یا کوئی سریلی آواز سنائی دیتی اور اس سے دل میں گدگدی پیدا ہو جاتی تو گھر آکر مجھے تزکیہ نفس کے لئے گائتری وغیرہ کا پاٹ کرنا پڑتا۔

ایکمرتبہ مجھے خسرال جانا پڑا۔ وہاں پہونچتے ہی سالی ہمجولیوں کی فوج کے ساتھ میرے اوپر یورش کر بیٹھیں اور ہنسی مذاق کرنے لگیں جس سے میرا خون خشک ہونے لگا اور میرے لئے وہاں دو دن بسر کرنا دوبھر ہوگیا۔

اتنا غنیمت تھا کہ کھانے کے وقت خوشدامن صاحبہ موجود رہتی تھیں ورنہ میں تو بھوکا ہی مرجاتا۔

ایکروز خوشدامن صاحبہ کہیں گئی ہوئی تھیں اسلیئے سالی صاحبہ چھم چھم کرتی آئیں اور کھانے کے لئے چلنے

کا تقاضا کیا۔ "بھوک نہیں ہے"۔ طبیعت خراب ہے۔ پیٹ میں درد ہے وغیرہ کئی بہانے کئے لیکن وہ کب ماننے والی تھیں۔ مجبور ہو کر دل میں "اوم اوم" کا جاپ کرتا ہوا اُٹھا۔

راستے میں مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ مگر چو کے کے قریب پہونچکر معلوم ہوا کہ عورتوں کا جمگھٹ ہے۔ ان کی خوش گپیوں نے مجھے اور سے بھی چوکنا کر دیا۔ خیر ڈرتا ڈرتا کسی طرح چوکے میں پہونچا اور کھانے کے لئے بیٹھتے ہی سب عورتیں میرا چہرہ تاکنے لگیں۔ اور ہر طرح سے مجھے حیران کر ڈالا۔ مگر میں آنکھ بند کئے ہوئے چپکا بیٹھا رہا۔ اتنے میں سالی صاحبہ میرے سامنے تھال رکھ کر بولیں "لیجئے شروع کیجئے۔ مگر اتنا خیال رکھئے گا کہ لقمہ منھ کے بجائے کہیں ناک میں نہ چلا جائے"۔

میں نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ سالے صاحب کی آواز آئی "ہاں ہاں کیا کرتے ہو"۔ گھبرا کر میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ انھوں نے میرے سامنے سے تھال ہی سرکا دیا جس پر سب عورتیں ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگیں اور سالے صاحب بھی ہنسنے لگے اور اپنی بہن کو جھڑک کر بولے "یہ بھی کوئی مذاق ہے"۔ سالے صاحب کی آواز سُنکر میں نے آنکھیں کھولیں تو شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ سامنے تھال نہیں بلکہ کڑاھی میں آگ بھری رکھی تھی۔

(۵)

میرے سر دُھننے کے باوجود والد صاحب نے تیسرے سال مسکلاوہ کر دیا لیکن میں اپنی بیوی سے اسیطرح پیش آتا رہا جیسا کہ گھر کے دوسرے لڑکیوں سے۔ پہلے تو میرا ارادہ ہوا کہ اس کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھوں لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بالکل غیر تعلیم یافتہ ہے تو میں تذبذب میں پڑ گیا۔ بہر حال تعلیم نسواں کا حامی تھا اور پڑھنے لکھنے کی یہی عمر ہوتی ہے اسلئے اپنے چھوٹی بہن کے ساتھ۔ اُسے بھی پڑھانے لگا۔ پہلے تو وہ میرے سامنے آتے ہوئے بہت شرمائی لیکن میں نے اُسے سمجھا دیا کہ ابھی کئی سال تک تم مجھکو اپنا خاوند نہ سمجھو اور مجھ سے کوئی پردہ نہ کرو۔

میرا مصمم عہد دیکھکر میرے والدین بھی یہ کہکر خاموش ہو گئے۔ کہ اچھا ہے برہمچریہ برت بھی پورا کر لینے دو اب کتنے سال رہ گئے ہیں۔

میں اپنے وقت کا زیادہ حصّہ اُسے پڑھانے میں صرف کرنے لگا۔ میری بیوی بڑی فرمانبردار تھی۔ جو کچھ میں کہتا تھا اُس کی حرف بحرف تعمیل کرتی اور بڑی محبت کے ساتھ پڑھتی تھی جبتک میں اجازت نہ دیتا وہ میرے پاس سے اٹھتی نہ تھی۔ مگر بہن لکھنے پڑھنے کی اتنی شایق نہ تھی۔ عمر میں بھی وہ چھوٹی۔ تھی۔ اُکتا کر کبھی کبھی بھاگ جایا کرتی تھی۔ اسلئے کبھی کبھی مجھے تنہا بیوی کو پڑھانا پڑتا تھا۔

میں بھی اس کی گفتگو اور عقلمندی پر بری طرح لٹو ہو گیا اور یہی جی چاہتا تھا۔ کہ ہمیشہ بیٹھا ہوا اسی کو پڑھاتا رہوں۔ مجھے اس لطف میں یہ بھی خیال نہ رہا کہ کیا پڑھائی ہو رہی ہے۔ اب سوچتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ پڑھائی تو برائے نام تھی۔ ہاں اس بہانے سے خوب گھل گھل کر باتیں ہوا کرتی تھیں۔

جاڑے کا موسم تھا۔ دن میں کالج سے فرصت نہ ملتی تھی۔ رات میں دونوں کو اپنے چھت والے کمرے میں پڑھایا کرتا تھا۔ ایکروز پڑھاتے پڑھاتے میں اونگھ گیا۔ ہمشیرہ کو پہلے سے ہی نیند آرہی تھی موقعہ پاتے ہی وہ نیچے چلی گئی مگر بیوی بیچاری میرے حکم کے بغیر کیسے چلی جاتی بیٹھی رہی۔

بارہ بجے کے قریب جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میز پر سر رکھے ہوئے وہ بھی سو رہی ہے۔ آہ اسوقت اس کا حُسن خفتہ کتنا دلآویز معلوم ہوا میں بڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے اس نظارہ سے لطف اُٹھاتا رہا۔

پھر خیال آیا کہ بیچاری سردی سے ٹھٹھر رہی ہو گی۔ شال بھی نہیں اُڑھے ہے۔

میں نے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر اُسے جگا دیا۔ خیال تھا کہ اُسے جگا کر نیچے بھیجدوں گا لیکن اس کے جسم میں ہاتھ لگاتے ہی میرے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اور میں بیخود ہو گیا۔

وہ گھبرا گئی "یہ کیا۔ میرا ہاتھ چھوڑیئے۔ آپ تو کہتے تھے کہ . . . . شرم سے اُسکی نگاہ جھک گئی۔ اور زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

اس کے بعد بہت دن مزے سے گذرے۔ اُس کی عشق و محبت میں مجھے اپنی عہد شکنی کا بھی کچھ غم نہ تھا۔ بیفکری سے دن گذرتے جا رہے تھے۔ لیکن ایکروز دوپہر کو کالج سے واپس آکر کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پلنگ پر پڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ دریافت کرنے پر شرما کر کہا "تم تو اپنی شرم کو لئے ہوئے بیٹھے ہو۔ مگر مجھ پر کیا بیت رہی ہے جانتے ہو" میں نے کہا "کیا بات ہے"؟

"بھلا یہ معاملہ کبتک پوشیدہ رہے گا۔ ماتاجی مجھ پر تہمت لگا رہی ہیں۔ اور سخت ناراض ہیں کہتی ہیں میرے گھر میں اب تیری گنجائش نہیں ہے۔ تم تو انکی نظر میں برہمچاری ہو اور میں؟"

میں بڑی مصیبت میں پڑ گیا۔ مارے شرم کے کچھ کرتے دھرتے نہ بنتا تھا۔ اتنے میں والدہ صاحبہ بھی پہونچ گئیں۔ غصے سے چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ "اس لڑکی کے کرتوت کا کچھ تمکو بھی حال معلوم ہے"؟

میں تو شرم کے مارے زمین میں گڑ گیا۔ تھوڑی دیر میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا "معاف کیجئے۔ ماتاجی۔ سارا قصور میرا ہی ہے"۔

پھر کیا تھا والدہ صاحبہ کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ خوشیاں منائی جانے لگیں۔ میں نے خوشامد درآمد سے گھر والوں کو راضی کیا کہ ابھی کسی سے اس کا ذکر نہ کریں۔ لیکن یہ راز کبتک چھپ سکتا تھا۔ آخر ایکدن

تمام شہر میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ کیا بتاؤں دوستوں نے کیسی کیسی چٹکیاں لیں میں نے آریہ سماج سے استعفیٰ دیدیا۔ مدتوں کالج میں نہیں گیا۔ غرض اُس روز سے میری زندگی ہی بدل گئی۔ وہ شرم آج تک دور نہیں ہوتی ہے۔ اس وقت تک میں سب سے منہ چھپاتا ہوں۔ سبھا سوسائٹی سب سے مجھے نفرت سی ہو گئی ہے۔ خدا مجھے دوبارہ ایسے چکر میں نہ ڈالے۔"

وکیل صاحب کی دلچسپ کہانی کے ساتھ ساتھ یہ مزیدار پک نک بھی ختم ہو گیا۔ اُس روز سے لڑکے برابر وکیل صاحب کو نصیحت کرتے رہتے ہیں کہ آپ اپنی کہانی سب کو سنا دیا کیجئے۔ جبھی آپ کی شرم دور ہو گی۔ ورنہ مفت زندگی برباد ہو گی۔

مُبارکبادِ شادی

ماہ نومبر ۱۹۳۶ء میں کانپور کی ایک دلخوش کن تقریب حافظ محمد صدیق صاحب کے صاحبزادہ بلند اقبال میاں محمد توفیق کی شادی خانہ آبادی تھی۔ اس موقعہ پر مکرمی خان بہادر مرزا جعفر علیخاں صاحب اثرؔ لکھنوی نے "نذرانۂ محبت" کے عنوان سے ایک مبارکبادی قطعہ لکھا تھا جو نذرِ ناظرین ہے:-

---

زبانِ بلبل پہ ہے ترانہ، چمن میں بزمِ طرب رچی ہے
نسیم پھرتی ہے گنگناتی، گلوں میں کرتال بج رہی ہے

غرور کوپل کو ہے پھبن پر، تو ناز پھولوں کو بانکپن پر
بنے ٹھنے بیٹھے ہیں شگوفے، کلی کلی اک دلہن بنی ہے

کسے دے ترجیح کس پہ کوئی، کہ بھی ہے آنکھوں میں جا نہ رہی
کسی کی پوشاک ہے شہانی، کسی کا ملبوس اگری ہے

کہیں ہے لالہ ایاغ بر کف، کہیں ہے مستی خروشِ نرگس
گلوں نے رخ پر ملا ہے غازہ، پسندِ نسریں کو نارنگی ہے

صبا نے اسطرح گدگدایا، دبایا سوسن نے ہونٹ اپنا
قیامت اس پر یہ چھیڑ گل کی، ذرا سی بھی مستی کی اڑ گئی ہے

عجیب سہانا سماں اثرؔ ہے، نہ کیوں ہو یہ ہے وہ نیک ساعت
کھلے ہیں توفیق کے مرے پھول، اسی کی ہر سمت خرمی ہے

وہ دن بھی آئے کہ بھائی صدیقؔ دیکھیں پوتوں کے سہرے یا رب
نہ تیری سرکار میں کمی تھی، نہ تیری سرکار میں کمی ہے

تنقید کتب

غالب

عام خیال ہے کہ غالب پر مولانا حالی پانی پتی کی "یادگارِ غالب" سے بہتر اور جامع و مانع کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ مگر "یادگارِ غالب" کی تصنیف کے وقت غالب کے تمام خطوط اور تحریریں خواجہ حالی کے پیش نظر نہ تھیں۔ اِس لیئے اِس بات کی سخت ضرورت تھی کہ کسی صورت سے مرزا غالب کے زیادہ سے زیادہ حالات ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں۔ مگر اِس کے لیئے مرزا غالب کے تمام خطوط، تمام تحریروں، تمام تصنیفات اور ان کے علاوہ یادگارِ غالب اور غالب کے متعلق لکھے ہوئے تمام مضامین اور کتابوں پر تحقیق و تدقیق کی ایک نظر ڈالنے کی ضرورت تھی۔ مگر یہ کام سخت محنت اور انتہائی دیدہ ریزی کا کام تھا جسے مولانا غلام رسول صاحب مہر بی۔ اے ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب لاہور" نے نہایت محنت و جانفشانی سے انجام دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ غالب کے خطوط اور دوسری تصانیف کی ورق گردانی کرکے اور ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر مطالعہ کرکے حالات کا جمع کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کی مشکلات سے وہی حضرات واقف ہو سکتے ہیں جنھیں اِس قسم کے ریسرچ کے کاموں کا عملی تجربہ حاصل ہو۔ مگر اسی کے ساتھ مولانا غلام رسول مہر بی۔ اے نے جملہ واقعات کو تنقید صحیح اور واقعاتِ تاریخ کی روشنی میں بھی جانچ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر دیا ہے۔ مثلاً فاضل مصنف نے "انسائیکلوپیڈیا آف اِسلام" کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" بڑی محققانہ کتاب ہے۔ لیکن غالب کے متعلق اس کی تحقیق کا سرمایہ بھی حد درجہ مضحکہ خیز نظر آیا۔ مثلاً اس میں مرقوم ہے کہ غالب نے اپنے فارسی دیوان میں جابجا اسدؔ تخلص استعمال کیا ہے۔ حالانکہ غالب کی کچھ اوپر تین سو غزلیات فارسی میں، ایک جگہ بھی اسدؔ تخلص

پتہ:۔ منیجر انقلاب لاہور قیمت تین روپیہ (سے)

نہیں آیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ غالب کے چچا کی وفات کے بعد شاہ دہلی نے پچاس روپیہ ماہانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ حالانکہ غالب کا مستقل وظیفہ یا خاندانی پنشن نہ شاہ دہلی سے متعلق تھی اور نہ پچاس روپیہ ماہانہ تھی۔ پنشن سرکار انگریزی نے مقرر کی تھی۔ اور فیروز پور جھرکہ کی بقا تک اس سے متعلق رہی۔ بعدازاں براہ راست انگریزی خزانہ سے متعلق ہوگئی۔ اور اس کی مقدار ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ یا ساڑھے سات سو روپیہ سال تھی۔ شاہ دہلی سے تاریخ نگاری کے صلے میں جو پچاس روپیہ ماہوار مقرر ہوئے تھے ان کی ابتدا جون ۱۸۵۰ء سے ہوئی جبکہ غالب کے چچا کی وفات پر چوالیس برس گزر چکے تھے۔"

فاضل مؤلف نے اِن بزرگوں سے بھی شرف نیاز حاصل کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا جو مرزا غالب سے تعلقات رشتہ داری رکھتے تھے۔ مثلاً نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لوہارو وغیرہ۔ فاضل مؤلف نے بڑی تلاش و تجسس سے مرزا غالب کے بعض ایسے خطوط بھی بہم پہونچائے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

اِس کتاب کے اسلوب بیان کی سب سے بڑی خوبی اس کا طریقہ استدلال ہے۔ لائق مصنف جگہ جگہ پختہ دلائل سے سابق تذکرہ نگاروں کی تردید و تصحیح کرتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً مرزا غالب پہلے اسد تخلص فرماتے تھے۔ لیکن غالب تخلص اختیار کر لیا تھا۔ اِس کے بارہ میں مولانا آزاد نے "آبِ حیات" میں لکھا ہے کہ "(غالب) نے ۱۲۴۵ھ میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا۔" اس بیان کی تصحیح فاضل مؤلف نے اِس طرح کی ہے:-

"غالب ۱۲۴۱ھ میں کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ ٹھہرے تھے وہاں اُنہوں نے جو غزل کہی تھی اس میں غالب تخلص استعمال کیا ہے ؎

جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب

اِس سے ظاہر ہے کہ وہ ۱۲۴۵ھ سے پہلے ہی اُردو میں بھی غالب تخلص فرمانے لگے تھے۔"

فاضل مؤلف کی یہ ستم ظریفی ہے کہ تحقیق و تدقیق کے ذہن میں وہ خود مرزا غالب پر بھی ہاتھ صاف کرنے سے نہیں چوکتے۔ مثلاً مرزا نے ایک خط میں حبیب اللہ خان ذکا حیدرآبادی کو لکھا تھا کہ:-

"میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔"

اور مولوی سراج الدین احمد صاحب کو ایک فارسی خط میں لکھا:۔

بینائے (دادا) من از پدر خود رنجیدہ آہنگ ہند کرد و بہ لاہور بھمرہی معین الملک۔ گزید۔ چوں بساط معین الملک در نوشتند بہ دہلی آمد و با ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان بہا در پیوست۔"

اِن دونوں بیانوں پر فاضل مؤلف تنقید فرماتے ہیں کہ:۔

شاہ عالم کی بادشاہی کا زمانہ ۱۷۵۹ء سے شروع ہوتا ہے اور نواب معین الملک جن کے پاس غالب کے دادا لاہور میں ملازم ہوئے تھے ۱۷۵۱ء میں انتقال کر گئے تھے۔ لہذا ماننا پڑیگا کہ غالب کے دادا محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے۔"

لکھنے کو تو فاضل مؤلف لکھ گئے لیکن بعد میں خیال آیا کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست"۔ اِس لئے یوں لیپ پوت کرتے ہیں:۔

"غالب کا یہ بیان غالباً خاندانی روایات پر مبنی ہے۔ نواب معین الملک کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے سنین معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس بیان کی تصحیح نہ کر سکے"۔

اِسی طرح ایک جگہ اور چوٹ کی ہے:۔

"غالب نے ایک موقعہ پر بہن کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن حقیقتہً ان کی کوئی حقیقی بہن نہ تھی ممکن ہے یہ ذکر رشتہ کی کسی بہن کا ہو"

غرض جہاں تک تحقیق و تدقیق کا تعلق ہے غالب پر اب تک اس سے بہتر کتاب نہیں شائع ہوئی۔ زبان بھی ادبی ہے اگرچہ کہیں کہیں "پنجابیت" کا اظہار ہو گیا ہے۔

قدر دانان غالب کے لئے یہ کتاب قابل دید ہے اور اسے بجی کتب خانوں اور پبلک لائبریریوں میں جگہ پانا چاہیئے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ سائز بڑا حجم دوسو اسی صفحات، غالب کی تصویر اُن کی تحریر کا عکس اور نواب علاؤ الدین احمد خاں کے نام وثیقہ جانشینی کا عکس بھی ہے۔

شب چراغ

یہ آٹھ مختصر افسانوں اور مضامین کا مجموعہ عجیب و غریب چیز ہے۔ ہر افسانہ فرضی ہے۔ لیکن واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ تمام افسانے اِس قدر دلچسپ ہیں کہ ایک بار شروع کر کے بغیر ختم کیئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اسلوب بیان بھی پسندیدہ اور زبان سلیس و شگفتہ ہے۔ بعض بعض افسانوں کا طرز ادا فلسفیانہ ہے۔ پہلا افسانہ "حسین مغالطہ" بہت دلچسپ ہے۔ اس میں مردانہ اور زنانہ نظریات

زندگی کا تصادم دکھایا گیا ہے۔ مردانہ نظریہ یہ ہے:۔

"مرد فطرتاً عورت پر قادر ہے۔ عورت مرد کے التفات کی بھکارن ہے۔ عورت مرد کے قوی ہاتھوں میں ایک نازک کھلونہ ہے۔ اور عورت مرد کے باغ شباب کی ایک کمزور تیتری ہے۔ مرد مرد ہے اور عورت عورت!"

اِس کے مقابل زنانہ نظریہ یہ پیش کیا گیا ہے:۔

"عورت حُسن ہے۔ حُسن شاعر کا شاہکار اور موضوع جمیل ہے۔ عورت کی شکست حُسن کی شکست ہے۔ حُسن کی شکست فطرت کی شکست ہے۔ اور فطرت کی شکست دُنیا کی تباہی و بربادی ہے۔"

اِن دونوں نظریوں کے تصادم کا کیا نتیجہ ہوا۔ یہ آپ کو کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔

دوسرا افسانہ "منزلِ کا تعاقب" دراصل ایک نئی نویلی مگر تعلیم یافتہ شریف دُلہن کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اِس کے مطالعہ سے ہر عورت کو معلوم ہو سکتا ہے کہ زن و شوہر میں کس طرح کا برتاؤ ہونا چاہئے۔ نیز آنکہ اگر عورت اپنے خاوند کو مطیع اور اپنے گھر کو نمونہ جنّت بنانا چاہے تو کیونکر بنا سکتی ہے ممکن ہے بعض شوخ طبائع کو یہ سنجیدہ اور حکیمانہ چیزیں خشک اور بے مزہ معلوم ہوں۔ اِس لئے فاضل مُصنف نے "غلطیوں کی ایک رات" لکھ کر تمام باتوں کی تلافی کردی۔ پڑھئے اور ہنسئے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، چھوٹی تقطیع کے چار جزو۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مینیجر صاحب قصر الادب دفتر "شاعر" آگرہ۔

مقالات

چھوٹی تقطیع کے اس پونے تین جز کے رسالہ میں احمد الدین احمد صاحب ایم۔ اے، مارہروی نے مندرجہ ذیل مسائل پر تنقیدی بحث کر کے بعض عام غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضامین یہ ہیں (۱) کیا اورنگ زیب سلطنت مغلیہ کے زوال کا باعث تھا؟ (۲) کیا فیروز تغلق غاصب تھا؟ (۳) نورجہاں اور جہانگیر کے تعلقات پر ایک نظر (۴) علاؤالدین و پدمنی (۵) کیا محمد تغلق پاگل تھا۔

شائقین سفیر بک ایجنسی الہ آباد سے طلب فرمائیں۔ قیمت ۶؍

شاہ ایڈورڈ ہشتم کی دست برداری

(از حضرت جگر بریلوی بی اے)

مضبوط حُسن و عشق کا پیمان کر دیا
تو نے جو تاج و تخت کو قربان کر دیا

آزادگی کی شمع جلا دی جہان میں
ظلمتکدہ میں نور کا سامان کر دیا

"پابند بن کے رہ نہیں سکتا ہے بادشاہ!"
بانگِ دہل سے تو نے یہ اعلان کر دیا

آئین ساز دیکھ کے حیران رہ گئے
جتنے تھے سب کو دل میں پشیمان کر دیا

قربانیوں کا دیکے سبق اہلِ دہر کو
دشوارئ حیات کو آسان کر دیا

ویراں پڑی ہوئی تھی محبت کی سرزمین
سیراب کر کے اُس کو گلستان کر دیا

اس مادہ پرست زمانہ کے برخلاف
جاری جہاں میں عشق کا پیمان کر دیا

حُسنِ وفا کی چار طرف دھوم ہو گئی
دنیا کو قدر عشق کی معلوم ہو گئی

رہتا اگر تو تخت نشین بنکے شہریار
برطانیہ کے تاج کا بڑھتا بہت وقار

لیکن رہا نہ دیکے محبت کا وہ شرر
جس کی چمک پہ دولتِ کونین بھی نثار

تو بے نیازِ افسر و اورنگ ہو گیا
جب آتشِ نہاں نے کیا دل کو بے قرار

پہلے تھا صرف مالکِ دیہیم و تخت تو
اب حُکمراں دلوں پہ ہے اے شاہِ نامدار

تاریخ پیش کر نہ سکیگی تیری نظیر
ہوتے رہے ہیں، ہوں گے بھی مغرب میں شہریار

روشن خیالیوں سے تیری تھا ہمیں یقیں
اِصلاح پائے گا کبھی بھارت کا حالِ زار

کیا جانئے کیا مشیتِ پروردگار ہے
ایثار پر تیرے دلِ شاعر نثار ہے

اے شاہِ مرحبا تجھے! تو نے کیا وہ کام!
جُرأت کا تو دھنی ہے یہ کہتے ہیں خاص و عام

زیر نگین تیرے ہے وہ عالی مقام آج
ہے شاد دل جہاں تیرا اور روح شاد کام

بیجا قیود سے تیرا دل پاک ہو گیا،
کہتے اسی کو "ترک" ہیں، ہے "تیاگ" اسی کا نام

سر پر ہے تیرے تاج بقائے دوام کا،
دنیا کے تخت و تاج کو کوئی نہیں قیام

جان و جگر کو حُبِ وطن پر کریں نثار
قربانیوں کا تجھ سے سبق لیں جو ہیں غلام

راحت بھی ناگوار ہو جینا بھی ناگوار،
آزادئ وطن کا نہ جب تک ملے پیام

توفیق دے خدا یہ تیرے جانشین کو،
ہو سرزمینِ ہند میں وہ طرزِ انتظام،

موسم خزاں کا ختم ہو فصلِ بہار آئے
بیتابیاں ہوں دور دلوں کو قرار آئے

ملک معظم جارج ششم اور ملکہ معظمہ الزبتھ

ہز رائل ہائنس پرنس البرٹ فریڈرک آرتھر جارج۔ ڈیوک آف یارک۔ ارل آف انورنس اور بیرن کلارنے سے۔ جی۔ پی۔ سی۔ کے۔ ٹی۔ جی۔ سی۔ ایم۔ جی۔ جی۔ سی۔ وی۔ او۔ ڈی۔ سی۔ ایل۔ ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۶ء روز جمعہ کو ایک بجکر ۵۲ منٹ پر اپنے بڑے بھائی شاہ ایڈورڈ ہشتم کی جگہ تخت نشین سلطنت ہوئے۔ آپ مرحوم شاہ جارج پنجم اور ملکہ معظمہ میری کے دوسرے بیٹے ہیں۔ ۱۴ر دسمبر ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ اور پرنس البرٹ کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے سب سے پہلے بحری فوج میں کام کرنا شروع کیا۔ چار سال تک بحری کیڈٹ کالجوں میں تربیت حاصل کرنے کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں مڈشپ مین ہوکر بحری فوج میں داخل ہوئے۔ جنگ عظیم کی سب سے بڑی بحری لڑائی جنگ جٹ لینڈ میں آپ بھی شریک تھے اُس وقت آپ سب لفٹننٹ تھے لیکن دشمن کی گولہ باری سے کوئی خوف دل میں نہ لائے اور جوانمردی سے جنگ میں حصہ لیا جس کی بدولت آپ کے جنگی خدمات کا سرکاری مراسلات میں خاص اعزاز کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

آپ جہاز میں اپنے ساتھی افسروں کی طرح تکلیف کیساتھ بہت سادہ زندگی بسر کر کے ہنسی خوشی سے اپنے فرائض ادا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ کسی وقت بھی آپ نے اپنے اعلیٰ رتبہ یعنی شاہزادگی سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ جنگ عظیم کے آخری سال میں آپ فرانس میں ہوائی فوج کے ساتھ منسلک ہوگئے جس کے بعد ۱۹۱۹ء میں ایکٹو لسٹ[۱] سے ریٹائر ہوگئے مگر اس سے پہلے آپ نے پائلٹ کا امتحان پاس کر کے اسکواڈرن لیڈر کے درجہ پر ترقی حاصل کرلی تھی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے برادر خورد ڈیوک آف کنٹ کیساتھ کیمبرج یونیورسٹی میں کچھ دنوں تک تعلیم حاصل کی اور ایک مختصر مگر سخت کورس میں شامل ہوکر تواریخ۔ مالی تجارتی اور سیاسی مسائل کے متعلق معلومات حاصل کیں۔

۱۹۲۰ء میں آپ کو ڈیوک آف یارک کا خطاب عطا ہوا۔

۱۹۲۳ء میں آپ نے لیڈی الزبتھ بوزلیون سے شادی کی جو ارل وکاؤنٹس آف اسٹرتھمور کی بیٹی ہیں آپ کے خسر صاحب اسکاٹ لینڈ کے ایک بہت قدیم اور مشہور خاندانی رئیس ہیں۔ بہرحال اس شادی پر تمام انگلستان و اسکاٹلینڈ میں بڑی دھوم ہوئی اور عام طور پر لوگوں نے بڑی خوشیاں منائیں۔ آپ کو و نیز ڈچز صاحبہ کو [illegible] یوگوسلاویہ اور زیکوسلواکیا میں اکثر درباری رسموں میں ملک معظم جارج پنجم کی جانب سے شرکت کرنا پڑی ہے۔

۱۹۲۴ء میں آپ اور ملکہ الزبتھ نے مشرقی افریقہ میں پانچ مہینے کا دورہ کیا۔ پھر ۳۱-۱۹۳۰ء میں آپ نے سلطنت

۱؎ برسرکار جماعت

کا ایک اور دورہ کیا جس کے دوران میں آپ نے چونتیس ہزار میل کا سفر کر کے دنیا کا پورا چکر لگایا۔ اس دورے میں آپ نے شہنشاہ معظم کے قائم مقام کی حیثیت سے آسٹریلیا کی نئی فیڈرل پارلیمنٹ کی افتتاحی رسم ادا فرمائی۔ آپ نیوزیلینڈ بھی تشریف لے گئے۔ غرض آپ اور پرنسس الزبتھ جہاں کہیں تشریف لے گئے لوگوں نے غیر معمولی تپاک سے استقبال کیا اور آپ دونوں صاحب بھی دلوں میں اپنے حسن اخلاق کا دائمی نقش چھوڑ آئے۔

آپ کے دل میں ہمیشہ غریب لوگوں کی بھلائی کا خیال رہتا ہے اور ہر وقت یہی خواہش رہتی ہے کہ امیروں اور غریبوں کے درمیان اچھے اور ہمدردانہ تعلقات رہیں۔

پندرہ سال ہوئے آپ نے سمندر کے کنارے ایک کیمپ قائم کر کے اسمیں چار سو لڑکوں کو بلایا جن میں نصف بڑے بڑے پبلک اسکولوں کے طالب علم تھے اور نصف غریبوں کے لڑکے۔ اسطرح آپنے انگلستان کے امیر و غریب دونوں طبقوں کے لڑکوں کو یکجا کر کے دونوں کے درمیان انسانی محبت و مساوات کا رشتہ قایم کرنے کی کوشش کی۔ یہ تجربہ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ آپ اُس کے بعد ہر سال ایسا کرتے رہے ہیں۔

آپ فوجی محکموں سے بھی ہمیشہ عملی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ آپ بحری فوج کے ریر ایڈمرل بری فوج کے میجر جنرل اور ہوائی فوج کے ایر چیف مارشل رہ چکے ہیں۔

اب آپ اکتالیس سال کی عمر میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے تخت پر بیٹھے ہیں جس کی ماتحتی میں اس وقت پچاس کروڑ انسان ہیں۔ آپ کے کندھوں پر ایکدم سے بڑی بھاری ذمہ داری آپڑی ہے۔ لیکن خاندانی روایات ابتدائی تربیت عملی تجربات اور فطری اوصاف سب لحاظ سے آپ اس بار عظیم کے اُٹھانے کے قابل ہیں۔

ہماری نئی ملکہ معظمہ ۴ راگست سنہ ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئی تھیں۔ آپ اپنے ماں باپ کے نویں اولاد ہیں۔ آپ کے چار بھائی جنگ عظیم میں لڑے اور ایک میدان جنگ میں کام آیا۔ جنگ عظیم میں آپ کے گھر میں جنگی اسپتال قائم کیا گیا تھا اور آپ اپنا وقت عزیز زخمی سپاہیوں کی خدمت میں صرف کیا کرتی تھیں۔ شادی کے بعد سے آپ پبلک کاموں اور ہر طرح کے خیراتی تحریکوں میں پُرجوش حصہ لیتی رہی ہیں۔ آپنے اپنے حُسن اخلاق کے بدولت ہزار ہا دلوں میں اپنی عزت اور محبت قائم کرلی ہے۔ اور انگلستان میں بیحد ہر دلعزیز ہیں۔

حضور ملک معظم و ملکہ معظمہ کے دو بیٹیاں ہیں شہزادی الزبتھ جو ابولیعہد سلطنت ہیں سنہ ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ دوسری شاہزادی مارگریٹ روز سنہ ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ دونوں چھوٹی شہزادیاں لوگوں کو بڑی پیاری لگتی ہیں۔



هر ميجسٽي ملڪه اليزبٿه معه شاهزاديان بلند اقبال

شاہِ ایڈورڈ کی دستبرداری

اس سال بلکہ موجودہ عہد کا سب سے بڑا واقعہ ملک معظم شاہ ایڈورڈ ہشتم کی تاج وتخت برطانیہ سے شاندار دست برداری ہے۔ عشق ومحبت کی قربانگاہ میں دنیا کی تاریخ میں شاید یہ سب سے بڑی قربانی ہے۔ مگر اس اہم واقعہ کو محض اس نظر سے دیکھنا غلطی ہوگا۔ کیونکہ شاہ ممدوح سلطنت برطانیہ کی رہنمائی سے یہ سمجھکر کنارہ کش ہوئے ہیں کہ موجودہ حالات میں وہ تاج کے اہم فرائض اور نازک ذمہ داریوں کو اپنے اطمینان قلب اور اعلیٰ معیار کے بموجب ادا نہ کرسکیں گے۔ موجودہ زمانہ میں فرض کا ایسا اعلیٰ معیار اس سے پہلے اور کس نے قایم کیا تھا؟ شاہ موصوف شاہزادہ ویلز اور تاجدار برطانیہ کی حیثیت سے پچیس سال سے اپنے ملک وسلطنت کی بہترین خدمت کررہے تھے۔ رعایا کے ہر طبقے میں وہ بیحد ہر دلعزیز تھے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ طبقے کے ساتھ انھیں انتہائی ہمدردی تھی۔ اور بیکاروں وبے روزگار لوگوں کے وہ خاص طور پر ہمدرد وحامی تھے۔

اس وقت سلطنت برطانیہ میں ان سے زیادہ اور کسی کو اہم ملکی مسائل حل کرنے کی اہلیت حاصل نہیں لیکن ایک عرصہ سے انکو اس بات کا روز افزوں احساس ہورہا تھا کہ وہ تن تنہا اپنے شاہانہ بار کو اٹھا نہیں سکتے۔ اب تک اُنھوں نے اپنی رفیقہ حیات کا انتخاب نہیں کیا تھا لیکن اب اس کے بغیر زندگی دوبھر معلوم ہونے لگی۔ اتفاق سے جس خاتون کی طرف انکا دل مائل ہوا وہ برطانوی تخت وتاج کے گذشتہ روایات اور سلطنت برطانیہ کے شان وشوکت کے معیار پر پوری نہ اُترتی تھی۔ اور ان کا انتخاب مسیحی پادریوں کے اخلاقی معیار کے مطابق بھی نہ تھا۔ وزراء سلطنت نے بھی اولوالعزم بادشاہ کا ساتھ نہ دیا۔ انگلستان کی شاہی تاریخ اور شاہانہ روایات میں اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ بادشاہ کی بیوی سلطنت کی ملکہ نہ سمجھی جائے۔ ورنہ شاہ ایڈورڈ اس کیلئے بھی تیار تھے بلکہ وہ اپنے پسند کی شادی کرلیں اور یہ ان کی خانگی زندگی کا ایک نجی واقعہ سمجھا جائے۔ اُنکو اور اُن کی محبوبہ کو اسمیں بھی اعتراض نہ تھا کہ اس شادی کی اولاد کو تخت وتاج سے کوئی سروکار نہ رہے۔ لیکن وزرائے سلطنت اس کے لئے تیار نہ تھے اور انگلستان کے مذہبی رہنماؤں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ انگلستان کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر بھی نہ ملی۔ چنانچہ وزیر اعظم مسٹر بالڈون نے اس معاملے میں کسی قسم کے مصالحت کو روا نہ رکھا۔ کیونکہ یہ مصالحت آئین سلطنت اور روایات شاہی دونوں کے خلاف ہوتی نیز اس سے اصولی وعملی دونوں حیثیت سے آخر کار تاج برطانیہ

کے عظمت واحترام میں فرق آنے کا خوف تھا۔ پارلیمنٹ نے بھی مسٹر بالڈون کا ساتھ دیا۔ اور مخالف پارٹی نے جو آئے دن ذرا ذرا سی بات پر وزیر اعظم اور ان کے رفقاء کی نکتہ چینی کرنا اپنا فرض سمجھتی اور انھیں شکست دینے کا ہر ممکن موقعہ تلاش کرتی رہتی ہے) اس اہم و نازک موقعہ پر گورنمنٹ سے اتفاق رائے کیا گو ان سب لوگوں کو بادشاہ ایڈورڈ کی ذات سے عقیدت تھی۔ لیکن اس وقت سبھوں نے ذاتیات سے بالاتر ہو کر رائے قایم کرنا اپنا فرض منصبی سمجھا۔ آخر وقت تک نے زرا اپنی رائے پر قایم رہے۔ اپنے خیال کے بموجب تاج برطانیہ کی عظمت قایم رکھنے کے دُھن میں انھوں نے اپنے سب سے بڑے تاجدار کی پرواہ نہ کی۔ اس موقعہ پر وزیر اعظم نے سلطنت برطانیہ کے تمام نوآبادیوں کو بھی شریک مشورہ کرلیا کیونکہ قانون ویسٹ منسٹر کی رُو سے جو چند ہی سال ہوئے پاس ہوا ہے۔ تخت و تاج کی وراثت کے متعلق اب برطانوی نوآبادیوں کو بھی رائے دینے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ البتہ ہندوستان سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ ابھی تک دولت مشترکہ برطانیہ میں ہمارے ملک کو نوآبادیوں یا خود مختار مقبوضات کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تمام اجزائے سلطنت کے ذمہ دار وزرا نے وزیر اعظم بالڈون کی رائے سے اتفاق کر کے شاہ ایڈورڈ کے تجویز شادی کو پسند نہ کیا۔

بہرحال وزیر اعظم نے ان اعتراضات کو اپنے آقائے نامدار کے گوش گذار کر دینا اپنا فرض منصبی سمجھا اور شاہ ایڈورڈ نے تمام عذرات کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ سنکر ان پر غور کیا مگر وہ پہلے ہی تمام پہلوؤں پر غور کر چکے تھے اس لئے انھیں وزیر اعظم کی باتوں پر کوئی تعجب نہ ہوا اور انھوں نے بلا کسی لیس و پیش کے تاج و تخت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ مسٹر بالڈون نے بہت کچھ کہا۔ وزرا سلطنت نے مکرر غور کے لئے التماس کیا۔ احباب نے پارلیمنٹ کو شکست کر کے دوسری پارلیمنٹ کے انتخاب کرانے کی رائے دی یوں بھی بادشاہ کو آئین کے رُو سے شادی کے معاملے میں پوری آزادی حاصل تھی۔ اور کوئی شخص انھیں اس بنا پر تاج و تخت سے محروم نہ کر سکتا تھا۔ پارلیمنٹ کی برخاستگی اور وزرائے سلطنت کی معزولی کا بھی انھیں پورا حق و اختیار تھا اور وہ مخالف پارٹی کے لیڈروں یا دوسرے ممتاز ممبران پارلیمنٹ سے قلمدان وزارت سنبھالنے کی استدعا کر سکتے تھے۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ عوام ملک میں انھیں غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہے اسلئے اگر کسی معاملے میں ان کے اور وزراء کے درمیان نزاع ہو گی تو عوام اپنے محبوب بادشاہ کا ساتھ دیں گے۔ لیکن تاج اور پارلیمنٹ یا تاج اور وزراء کے درمیان آئینی جنگ چھڑنے سے انگلستان کے قومی مفاد کو نقصان عظیم پہونچنے اور سلطنت برطانیہ کے آئینی عظمت میں فرق آنے کا اندیشہ تھا۔ دوسرے تاج کی موجودہ حیثیت میں جو ہمیشہ بحث مباحثہ سے بالاتر رہی ہے۔ فرق آنے کا احتمال تھا اس لئے انگلستان کی کثرت رائے اپنے طرف ہوتے ہوئے بھی شاہ ایڈورڈ نے اپنے ذات کے متعلق پارلیمنٹ یا وزراء سے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ اس صورت میں شاہ ممدوح کے طرفداروں

(جنہیں زیادہ تر متوسط طبقے اور مزدور جماعت کے لوگ تھے) اور آئین کے حامیوں میں سخت تصادم ہو جاتا۔ جو سلطنت کے حق میں کسی طرح مفید نہ تھا۔ بلکہ اس سے انگلستان کے قومی عظمت کو بہت بڑا صدمہ پہونچتا۔ اور خدا معلوم کیا نوبت آجاتی اس وقت برطانیہ دنیا میں اپنی سیاسی فضیلت قایم رکھنے کے انتظامات میں مصروف ہے۔ اور کروڑوں روپے کے مصارف سے فوج کے ہر شعبے کی از سر نو تنظیم کا کام غیر معمولی پیمانہ پر جاری ہے۔ جس میں ایک دن کا بھی توقف مناسب نہیں۔ کیونکہ دوسرے ملک شبانہ روز سبقت لیجانے کی کوشش میں ہیں اور اس آئینی جنگ میں بڑا وقت ضایع ہو جاتا

شاہ ایڈورڈ کو گذشتہ گیارہ مہینوں کے دوران میں اس کا اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک رفیقۂ زندگی کے امداد و ہمدردی کے بغیر اپنے شاہی فرایض کو خاطر خواہ طریقے پر ادا نہیں کر سکتے لیکن جب انہوں نے عقد کا خیال کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ تاج و تخت کے ساتھ انھیں اپنے خانگی معاملات میں کوئی آزادی نصیب نہیں اور قدیم مراسم اور پرانے توہمات کی زنجیریں توڑنے کی کوشش برطانیہ کے ملکی مفاد کے لئے سخت مضر ہوگی۔ وہ ایک باعزت انسان کی طرح اپنے عزم محبت دیا شاید قول و قرار سے بھی پھرنا نہ چاہتے تھے۔ اور اطمینان قلب کیساتھ بادشاہی بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے انھوں نے تخت سے دستبرداری کا اٹل ارادہ کرکے دنیا کے روبرو ایثار و فرض شناسی کی انتہائی مثال پیش کردی۔ اور وزیر اعظم سے صاف صاف کہدیا کہ وہ جلد سے جلد نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے جلیل القدر منصب سے علیحدہ ہو جانا چاہتے ہیں۔ ان کے دل میں کسی سے کوئی ناراضگی نہیں اور وہ اپنے خاطر قوم و ملک کو کسی پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتے ہیں اور اپنے جانشین و برادر عزیز ڈیوک آف یارک کے راستے میں مشکلات پیدا کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے انھوں نے تہیہ کر لیا کہ جلد سے جلد ان کے تخت نشینی کا انتظام کرکے جہانتک ممکن ہو اپنی طرف سے ان کے بارِ عظیم میں کوئی اضافہ نہ ہونے دیں۔

شاہی خاندان ارکان حکومت اور عرض و طول سلطنت برطانیہ میں اس عظیم الشان فیصلہ سے جو تہلکہ پڑگیا اُس کا بیان ناممکن ہے۔ دوسرے ملکوں کا حال تو ہمکو معلوم نہیں لیکن ہندوستان کی نسبت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادنے اعلیٰ سب طبقوں میں شاہ ایڈورڈ کی دست برادری کا ماتم کیا گیا ہے۔ اس ایثار کی قدردانی اور شاہ ایڈورڈ کیساتھ ہمدردی میں سیاسی تفرقات کی قید بھی باقی نہیں ہے کون دل ہے جو شاہ ایڈورڈ کی عظیم الشان قربانی سے بے اثر رہا۔ اور کون آنکھ ہے جو اس شاہی مصیبت پر پُرنم نہیں ہوئی۔

اس دست کشی کی پوری اہمیت سمجھنے کیلئے یہ خیال کرنا ضروری ہے کہ شاہ ایڈورڈ کا یہ فیصلہ انکے لئے انقلاب عظیم کے بمنزلہ تھا جسمیں دولت و ثروت اور مرتبہ کے نقصان کے علاوہ زندگی کی تمام دلچسپیوں سے دائمی مفارقت کا سوال تھا جن فرایض کی انجام دہی کے لئے انھوں نے تمام عمر اسقدر جانفشانی سے تیاری کی تھی جس اعلیٰ خدمت کی قابلیت اُنھوں نے اسقدر کد و کاوش کے بعد حاصل کی تھی۔ اپنے عہد

حکومت کے متعلق جو منصوبے باندھ رکھے تھے ان کی شاندار عمارت یکایک خاک میں مل رہی تھی۔ سالہا سال کی دیرینہ آرزوؤں کا چشم زدن میں خون ہو رہا تھا۔ اس فیصلے کا نتیجہ صرف غریب الوطنی نہ تھا بلکہ اسکی وجہ سے دنیا کی تمام دلچسپیوں سے جن کے وہ بچپن عادی تھے اور جن سے انہیں تمام عمر محبت رہی دائمی مفارقت ہوتی تھی۔

مگر شاہ ایڈورڈ لفظ کے اصلی معنی میں طبیعت کے بادشاہ تھے۔ بیدلی کیساتھ انھوں نے ایک منٹ بھی تخت پر بیٹھنا گوارا نہ کیا کیونکہ وہ اپنی پوری قوت و قابلیت کیساتھ اپنے فرائض انجام نہ دے سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایمان اور اپنی بات کے آگے دنیا کے بڑے سے بڑے پوزیشن کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اور صدق و وفا کی راہ میں تخت سلیمان سے بھی زیادہ عظیم الشان بادشاہت پر لات مار دی۔ اس ایثار عظیم کی خواہ مغرب میں کوئی قدر نہ ہو لیکن مشرق میں اس کا چرچا رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔

شاہ موصوف کے ذاتی پسند کے متعلق ہم کو کیا کسی کو بھی زبان کھولنے کا حق نہیں ہے۔ گو یہ واقعہ بہت افسوسناک اور درد انگیز ہے کہ ان کی نظر انتخاب مقبول عام نہیں ہوئی۔ اور اُن کے انتخاب کو نہ برطانوی آئین و روایات کی تائید حاصل ہو سکی اور نہ ان کے ہوا خواہ مدبرین ہی اس کے علانیہ حمایت کر سکے۔

ہم مزید تفصیلات میں جانا پسند نہیں کرتے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ کلیسائے انگلستان کے مشہور و معروف پادریوں کا اعتراض قدیم اخلاقی معیار کے مطابق ہے۔ لیکن اس معاملے میں شاہ ایڈورڈ ہشتم سے اگر کوئی غلطی یا کمزوری ظہور میں آئی تو اب جب وہ ہر پہلو سے اسکی پوری قیمت ادا کر چکے ہیں کسی کو انھیں مطعون کرنے کا حق نہیں ہے۔

ایک پہلو سے پادری صاحبان کا اعتراض ہم وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ہمارے مذہبی رہنماؤں میں بھی ایسی اخلاقی جرات پیدا ہو۔ لیکن انگلستان سے شاہ ایڈورڈ کے روانگی کے بعد "آرچ بشپ کنٹربری" اور آرچ بشپ یارک کی ملامتی تقریریں مسیحی فیاضی کے صریحاً منافی ہیں۔ ان عالی مقام مذہبی رہنماؤں نے اپنے ناصحانہ لعن طعن سے یقیناً ملک و مذہب کی کوئی خدمت انجام نہیں دی۔ مگر ان اللہ والے لوگوں کی زیادہ تر باتیں ہم گنہگار بندوں کے سمجھ سے باہر ہی ہوتی ہیں۔

مسٹر بالڈون کی قدامت پرستی کے متعلق چاہے کچھ کہا جائے لیکن انھوں نے جس قابلیت و مستقل مزاجی کیساتھ اپنے خیال کے بموجب برطانوی آئین اور ملکی مصالح کی حفاظت کی اس کی بدولت اُن کا نام انگلستان کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ انکا رویہ شروع سے آخر تک آئین وضابطہ کی مطابق رہا۔ بقول خود انھوں نے بادشاہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا حق یہی سمجھا کہ وہ اپنے آقائے نامدار کے روبرو کل واقعات بلا کسی لحاظ یا رورعایت کے من وعن پیش کر دیں۔ انھوں نے بادشاہ سے بھی زیادہ تاج و سلطنت کا احترام ضروری سمجھا۔ اور پارلیمنٹ

اور وزارت کی آئینی پوزیشن کو ایک لمحہ کے لئے بھی گرنے نہیں دیا اور نہ اس میں ادنےٰ سی تخفیف گوارا کی۔ انکے نقطۂ خیال سے یہ اعتراض بیجا ہے کہ اُنھوں نے مخالف پارٹی کے لیڈروں کو اپنے ساتھ کیوں ملا لیا۔ وہ پارلیمنٹ کے لیڈر و رہنما ہیں۔ اس حیثیت سے پارلیمنٹ کی عزت اُن کے ہاتھ میں تھی۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے برطانیہ کا وقار قایم رکھنا بھی ان کے ذمہ تھا۔ وہ ضرور شاہ وقت کے وفادار ملازم تھے لیکن قومی مفاد اور ملکی اخلاق کی جو حمایت شاہان انگلستان کا فرض منصبی ہے اس میں کسی قسم کی کمی آنے دینا اُن کے فرایض منصبی کے خلاف تھا۔

انگلستان کا بادشاہ ملک و قوم کا خادم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر وہ اہل برطانیہ کے قلوب پر حکومت کرتا ہے مگر اس حکومت کی سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ بادشاہ قوم و ملک کے لئے اپنا سارا عیش و آرام بلکہ جان و مال تک نثار کر دے۔ شاہ ایڈورڈ اس بنا پر تخت سے دستبردار نہیں ہوئے کہ انھیں اپنے پسند کی شادی کرنے کا اختیار نہ تھا۔ وہ جس لیڈی سے چاہتے بلا خوفِ مزاحمت عقد کر سکتے تھے۔ لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں ناقابل عبور مشکلات حائل ہیں۔ تو انھوں نے یہ محسوس کیا کہ شادی کرنے کے بعد قدرتاً ملک و سلطنت کی وہ توقعات اُن کی ذات سے وابستہ نہ رہ سکیں گی جو ایثار جذبات کی حالت میں ان کی میراث تھیں اور جیسے ہی انھیں محسوس ہوا کہ وزرائے سلطنت اور پارلیمنٹ کی رائے پر عمل کرنے کی صورت میں وہ اپنے شاہی فرایض بہ احسن وجوہ ادا نہ کر سکیں گے، اُن کی غیور طبیعت نے خواہ مخواہ تخت سلطنت پر متمکن رہنا گوارا نہ کیا۔ اور انھوں نے ناقابل تنسیخ فیصلہ کر کے اپنے عندیہ کا فوری اعلان کر دیا۔

مختلف ارکان سلطنت و اہل انگلستان نے بھی اس اہم و نازک موقعہ پر جس لاثانی ضبط و تحمل کا ثبوت دیا وہ بطور خود قومی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اور ہم تو اس کو تمام دنیا کے لئے ایک سبق آموز واقعہ سمجھتے ہیں خصوصاً ہندوستانیوں کے لئے تو اس قضیئہ میں بیسیوں سبق موجود ہیں۔ دنیا میں تخت و تاج کی ہوس میں کیا کیا مظالم برپا نہیں ہوئے۔ ظلم و ستم۔ دغا فریب۔ کشت خون غرض کیا نہیں ہوا ہے۔ کتنے مرتبہ خون کی ندیاں نہیں بہی ہیں۔ لیکن برطانیہ کے عظیم الشان تاجدار نے جس شان و شکوہ سے ایسی وسیع و زبردست حکومت پر لات ماردی اُس کی مثال دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈھے بھی نہ ملے گی۔

شاہی خاندان کے ہر فرد نے اپنے طرز عمل سے ہم لوگوں کے لئے حُسن اخلاق اور حُسن سلوک کی حدیں کھینچ دیں۔ شروع سے آخر تک شاہ ایڈورڈ کا سب سے بڑا خیال یہی تھا کہ چھوٹے بھائی کو عنان حکومت سنبھالنے میں کوئی قباحت نہ ہونے پائے اور کار سلطنت میں کسی طرح کا خلل یا ہرج واقع نہ ہو ڈیوک آف یارک کی کیفیت سنئے انھیں دنیا کے سب سے بڑی بادشاہت ملنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی بلکہ اُلٹا انھیں اپنے بڑے بھائی کی محبت و رہنمائی سے محروم ہونیکا رنج ہے۔ چنانچہ شاہی حلف اٹھاتے وقت اُنکے قدم

مشکل سے اُٹھتے تھے۔ ممبران پریوی کونسل سے بھی اُنھوں نے یہی اپیل کی کہ اس وقت جب انھیں اپنے چہیتے بھائی کی محبت سے محروم ہونا پڑا ہے۔ اُن کی دلی ہمدردی اُن کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

دو ہی دن بعد اُن کی سالگرہ تھی۔ مگر انھوں نے اس موقعہ پر معمولی اظہار خوشی کو بھی روا نہیں رکھا۔ اور اپنی سلطنت میں کسی قسم کے دھوم دھام کی اجازت نہیں دی۔ خود بھی کسی تقریب میں شامل نہیں ہوئے اور خاص احباب کی دعوت بھی نہیں کی بلکہ اپنے قدیم محل میں صرف بھائیوں اور خاندانی عزیزوں کیساتھ ماحضر تناول فرمایا۔ چنانچہ اس روز نہ توپیں سر ہوئیں نہ سلامیاں لی گئیں اور نہ کہیں جلسے ہوئے اور نہ خطابات واعزازات تقسیم کئے گئے۔ بلکہ اس مرتبہ نوروز بھی سرکاری حیثیت سے نہ منایا جائے گا اور خطابات کی فہرست کی اشاعت ایکماہ تک ملتوی رہے گی۔

شاہ ایڈورڈ تخت سلطنت چھوڑتے ہی اپنے تمام جائداد وجاگیر سے بھی دست بردار ہو گئے۔ وہ آسانی سے اپنے معمولی خطابات اور ذاتی جاگیر اپنے قبضہ میں رکھ سکتے تھے لیکن اُن کی خودداری وبلند ہمتی نے اس کو گوارا نہ کیا کہ تخت سلطنت سے کنارہ کش ہونیکے بعد وہ معمولی شہری سے سوا کوئی رتبہ اپنے لئے باقی رکھیں۔

شاہِ جارج ششم نے البتہ تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بڑے بھائی کو ہز رائیل ہائی نیس ڈیوک آف ونڈسر کا لقب عطا فرمایا۔ لیکن ابھی تک کوئی خاص جاگیر علیحدہ نہیں کی گئی ہے اور شاید اس کی ضرورت بھی نہ پڑے۔

پارلیمنٹ نے صرف ڈھائی گھنٹہ کے اندر دستبرداری کا قانونی ضابطہ پاس کر دیا۔ اس موقعہ پر مدبران ملک نے جو مختصر تقریریں کیں اُن میں ضروری واقعات تو بیان کر دئے گئے۔ لیکن ہر شخص نے شاہ سابق ومادر مہربان ملکہ میری کے جذبات کا پورا احترام ضروری سمجھا۔ مسٹر چرچل نے ملک میں کچھ خلفشار پیدا کرنا چاہا تھا لیکن پارلیمنٹ کے ہر طبقے نے اُن پر علانیہ اظہار ناپسندیدگی کیا جس کے بعد انھیں بھی چون وچرا کی ہمت نہ ہوئی۔

اخبارات اور عوام نے بھی غیر معمولی ضبط سے کام لیا۔ رعایا کے قریب قریب ہر طبقے میں شاہ سابق بیحد ہر دلعزیز تھے۔ چنانچہ ایسے بڑے واقعہ پر انگلستان میں جو کچھ ہو جاتا تعجب نہ ہوتا۔ شروع میں عوام کے جو مظاہرے ہوئے انھیں جلدی دبا دیا گیا۔ دراصل عوام ملک کو جیسے ہی اس مسئلہ کی آئینی حیثیت اور اسکی مشکلات کا اندازہ ہو گیا اور یہ معلوم ہوا کہ خود شاہِ ایڈورڈ کسی قسم کی اُلجھن پیدا کرنا نہیں چاہتے اور نہ اپنے ذات والا صفات کے متعلق کوئی مباحثہ پسند کرتے ہیں۔ ویسے ہی عوام نے مؤدبانہ سکوت اختیار کر لیا۔ شاہِ ایڈورڈ بھی اس قضیے کے فیصلے تک اپنے محل بکنگھم پیلیس میں نہیں بلکہ اپنے ایک دور افتادہ قیامگاہ میں مقیم رہے اور وہاں سے برآمد نہیں ہوئے۔

بہر حال اس اہم ونازک موقعہ پر برطانوی قوم اور مدبرین سلطنت اور آئینی گورنمنٹ نے اپنے تاریخی عظمت کا پورا پورا ثبوت دیدیا۔

سالِ نو اور زمانہ

زمانہ کیلئے یہ سال کئی معنوں سے اچھا نہیں گذرا۔ پریم چند کی موت ہمارے لئے ایک ذاتی سانحہ ہے۔ چند سال سے بعض مجبوریاں انھیں زمانہ کیطرف زیادہ متوجہ ہونیکا موقعہ نہ دیتی تھیں تاہم وہ زمانہ کے تھے اور زمانہ اُنکا تھا۔ چنانچہ موت سے چند دن پہلے بھی اُنھوں نے ہمارے خیال کی تائید کی۔ بہرحال ملک کے ساتھ زمانہ کو بھی اُن کی نا وقت وفات سے نقصان عظیم پہنچا ہے۔ اس سال بعض خاص انتظامی مشکلات بھی حائل رہیں۔ مثلاً زمانہ کے مستقل کاتب کی علالت اور دیگر کاتبوں کی بدمعاملگیوں کے باعث کئی ماہ سے اس کی اشاعت میں تاخیر ہو جاتی ہے جو ہمکو ناظرین سے بھی زیادہ ناگوار ہے۔ لیکن اس کی شکایت کا ناظرین کو جو حق حاصل ہے وہ ہمیں میسر نہیں۔ ہم کئی بار کہہ چکے ہیں اور ایک مرتبہ پھر عرض کرتے ہیں کہ اُردو ادب کی کساد بازاری کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ تینتیس ۳۳ سال کی مسلسل خدمت کے بعد آج بھی زمانہ کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ ہم انتظامی مشکلات پر آسانی سے حاوی ہو سکیں۔ ذرا سا واقعہ بھی معینہ انتظامات کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ اشاعت کے اعتبار سے بھی یہ سال ہمارے لئے حوصلہ افزا ثابت نہیں ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک قدردانانِ زمانہ نے توسیع اشاعت کی فکر اپنے ذمہ نہیں لی ہے۔ مگر اب انھیں اس سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔ اور اپنے دیرینہ خادم کے استحکام کے لئے مستعد ہو جانا چاہیئے۔

زمانہ کی زندگی کا چونتیسواں ۳۴ سال ختم ہو رہا ہے۔ آئندہ سال سے اس کا پینتیسواں ۳۵ سال شروع ہوگا۔ مضامین کے لحاظ سے اس سال بھی زمانہ کا معیار حسب معمول بلند رہا اور اگر ہمارے ناظرین اس سال کے شائع شدہ مضامین نظم و نثر کا دیگر معزز رسالوں کی فہرست مضامین سے مقابلہ کریں گے تو زمانہ کو شرمندگی کا موقعہ نہ ملیگا۔ ہمارے لئے یہ خوشی کی بات ہے کہ جس معیار و مقصد کو سامنے رکھ کر نومبر ۱۹۰۳ء میں ہم نے زمانہ کی ترتیب و اشاعت کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی وہی معیار اور وہی مقصد اب بھی ہمارے پیشِ نظر ہے۔ پچھلے تینتیس ۳۳ سال کے عرصہ میں ہمارے بہت سے رفقا ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی ساتھیوں نے اس دنیائے فانی سے منہ موڑ لیا! یہ ایک دردناک داستان ہے۔ جس سے ہم اسوقت اپنے ناظرین کو بے لطف کرنا نہیں چاہتے مگر نوبت رائے نظر۔ سرور جہاں آبادی۔ احسن سنبھلی اور پریم چند جیسے معاونین کے احسانات سے ہم اور ہمارے ناظرین کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں۔ آج ہمارے یہ پرانے رفیق ہمارا ساتھ دینے کو دنیا میں موجود نہیں ہیں اور جلد یا دیر میں یہ مثل "آج وہ کل ہماری باری ہے" ہمپر بھی صادق ہوگی۔ اسلئے ہمکو مقررہ معیار کے بموجب زمانہ کی آئندہ زندگی قایم رکھنے کے انتظامات سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔ چنانچہ کچھ عرصے سے بعض تجاویز ہمارے زیر غور ہیں اور ہمکو اُمید ہے کہ ہمارے ناظرین بھی زمانہ کی ادبی خدمت کے استحکام میں پوری کوشش فرمائیں گے۔ جہانتک ایڈیٹوریل فرائض کا تعلق ہے موجودہ عملہ کے علاوہ ہمکو آئندہ سال دو دوستوں سے خاص امداد ملنے کی توقعات ہو گئی ہیں یعنی مکرمی رگھوپت سہائے فراق اور بسنت پرشاد صاحب مدہوش جنکی اعلیٰ نظم و نثر سے ہمارے ناظرین بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ دونوں صاحب الٰہ آباد یونیورسٹی کے ماسٹر آف آرٹس ہیں۔ دونوں تعلیم و تدریس کی خدمت اپنے ذمہ لئے ہوئے ہیں۔ دونوں زمانہ کے دیرینہ قدردان اور اس کے ترقی خواہ ہیں اور علمی حیثیت سے ہمارا ہاتھ بٹانے کو

مستعد ہیں۔ چنانچہ ہمیں اُن کی ذات سے کامل توقع ہے کہ وہ زمانہ کو ترقی کیساتھ جاری رکھنے میں ہمکو پوری مدد دیں گے۔ فی الحال ہم اُن سے جنوری آیئندہ سے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہونے کی درخواست کر رہے ہیں۔ آیئندہ جیسی ضرورت ہوگی اُن کو اس کی بقا کے لئے ہر ممکن انتظام کرنا ہوگا۔

ہمکو بھروسہ ہے کہ زمانہ کیلئے آیئندہ سال گذشتہ سال سے بہتر ثابت ہوگا۔ اور ہمارے ناظرین و شائقین بھی اب خواب غفلت سے بیدار ہو کر زمانہ کے توسیع اشاعت کی کوشش کیلئے تھوڑا سا وقت نکال کر اس کے استحکام کا انتظام کر دیں گے۔ زمانہ کے استقلال و استحکام کیلئے اسباب کی سخت ضرورت ہے کہ اسکی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہو تاکہ ہم اور ہمارے رفقائے کار اپنے حوصلوں کے مطابق ناظرین کی ادبی خدمت کا حق ادا کر سکیں۔

موجودہ جلد ہم نومبر نمبر کیساتھ ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اور دسمبر کا پرچہ یادگار پریم چند کے نام سے خاص اہتمام کیساتھ شائع کریں گے۔ اس کے صفحات کے نمبر بھی کتابی حیثیت سے علیحدہ رہیں گے۔ اس نمبر کیلئے خاص تیاریاں ہو رہی ہیں اور اسکے لئے بعض خاص احباب سے خصوصیت کیساتھ مضامین لکھوائے گئے ہیں۔ بہت سے مضامین موصول ہو چکے ہیں مگر بعض ابھی لکھے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہم ناظرین سے اس نمبر کے اشاعت کیلئے تھوڑی سی مہلت مانگ رہے ہیں۔ ہمکو اُمید ہے کہ یہ نمبر آخر جنوری ۳۷ء تک شائع ہو جائے گا۔ مگر اس کی وجہ سے جنوری ۳۷ء کے پرچے کی اشاعت میں فرق نہ ہوگا۔ وہ بھی جنوری کے خاتمہ سے پہلے ہی حاضر خدمت ہوگا۔ ہمکو اُمید ہے کہ پریم چند کی خاطر ہمارے ناظرین اس تاخیر کو بہ خوشی گوارا کریں گے۔ ہمکو بھروسہ ہے کہ جو یادگار نمبر حاضر خدمت ہوگا اُس سے اس انتظار کے زحمت کی پوری تلافی ہو جائے گی۔ ہماری کوشش ہے کہ اس نمبر میں ہمارے مرحوم دوست کی زندگی اور اُن کے ادبی کارناموں کا ایک مکمل مرقع پیش کر دیا جائے۔

اگلے سال زمانہ میں کئی اہم مضامین شائع ہوں گے۔ چنانچہ جنوری کا پرچہ ہمارے آئندہ پروگرام کا اچھا خاصہ نمونہ ہوگا۔

اطلاع ضروری) جن صاحبان کی خریداری کا سال جنوری سے شروع ہوتا ہے اُن سے استدعا ہے کہ اس نمبر کے پہونچتے ہی آیئندہ سال کی قیمت مبلغ پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں۔ دسمبر نمبر کا انتظار نہ کریں۔ کیونکہ دسمبر نمبر یادگار پریم چند کے نام سے شائع ہوگا اور آخر جنوری ۳۷ء تک شائع ہوگا۔ اس پرچے کی ضخامت معمولی سے کہیں زیادہ یعنی سوا سو صفحات سے کم نہ ہوگی۔ اور اسمیں پریم چند جی کی متعدد تصاویر دیجائیں گی۔ غرض پوری کوشش ہے کہ یہ نمبر ہمارے مرحوم دوست کی مکمل یادگار اور ادبی حیثیت سے ایک قابل قدر اور لائق دید چیز ہو۔

جن صاحبوں کی قیمت ۱۵ جنوری ۱۹۳۷ء تک بذریعہ منی آرڈر وصول نہ ہوگی انکی خدمتمیں جنوری ۳۷ء کا زمانہ سالانہ قیمت کیلئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ V.P.P. ارسال ہوگا۔ قیمت طلب پیکٹ میں پانچ آنہ کا صرفہ ہوتا ہے کیونکہ ڈاکخانہ تین آنہ رجسٹری فیس اور دو آنہ منی آرڈر فیس لیتا ہے منی آرڈر سے قیمت بھیجنے والے اصحاب کو تین آنہ رجسٹری فیس

نوٹ - قواعد ڈاکخانہ کے رو سے ویلیو پے ایبل پیکٹ ایک ہفتہ سے زائد ڈاکخانہ میں امانت نہیں رکھے جا سکتے۔ اس لئے استدعا ہے کہ جو صاحبان منی آرڈر سے قیمت نہ بھیجیں وہ براہ مہربانی جنوری نمبر کا قیمت طلب پیکٹ ڈاکخانہ سے وصول ہونے پر فوراً ہی قبول فرما لیں اور ڈاکخانہ میں پڑا نہ رہنے دیں۔ جن صاحبوں کو آیئندہ خریداری منظور نہ ہو وہ فوراً اپنی عندیہ سے مطلع فرمائیں۔

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن میں اپنا پورا نام و پتہ و نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں۔ تاکہ رقم مرسلہ کا صحیح اندراج ہو سکے۔

(مینیجر)

پنڈت سنشری طبعہ پرنٹر نے بیر دال پریس کاہو کوچی کا ہنور میں چھاپا — ایڈیٹر و پبلشر منشی دیا نراین نگم بی۔ اے